تحقیقی مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی اُردو

نوآبادیاتی عہد میں خواتین کے اردو سفرنامے: سماجی و سیاسی مطالعہ

محقق
روبینہ پروین
FLL/PHDURDU/S13-38
شعبۂ اردو

نگران
ڈاکٹرنجیبہ عارف
پروفیسر، شعبۂ اردو

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

الجامعة الإسلامية العالمية

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

شعبۂ اردو

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ روبینہ پروین رجسٹریشن نمبر 38-**FLL/PHDURDU/S13** نے پی ایچ ڈی اُردو کی ڈگری کی تکمیل کے لیے مقالہ بعنوان **"نوآبادیاتی عہد میں خواتین کے اردو سفرنامہ:سماجی و سیاسی مطالعہ"** رقم کیا ہے۔میں تصدیق کرتی ہوں کہ اس موضوع پر اس سے پہلے کہیں کام نہیں ہوا اور یہ کام سرقے سے پاک ہے۔

نگران: ڈاکٹرنجیبہ عارف
پروفیسر، شعبۂ اردو

پیش لفظ

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ سفرنامے اپنے عہد کی تاریخی ، تہذیبی، سماجی دستاویز ہوتے ہیں اور کسی بھی معاشرے کی تہذیب و ثقافت، سیاست،معاشرت اور تاریخ کو جاننے کے لیے سفرناموں کا مطالعہ بے حد مفید ہے۔

سفرنامے کا شمار اردو ادب کی بیانیہ صنف میں ہوتا ہے۔ سفر کرنے والا دورانِ سفر یا اختتامِ سفر پر دوسروں کو اپنے مشاہدات و تجربات اور احساسات میں شامل کرنے کی غرض سے جب سفر کے حالات و واقعات کو تحریری صورت عطا کرتا ہے تو وہ سفرنامہ کہلاتا ہے۔

برصغیر پاک و ہند میں انگریز تاجروں کے بھیس میں آئے اور اپنی سازشوں کے ساتھ ساتھ نااہل مغل حکمرانوں کی نااہلی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پورے برصغیر پر قابض ہو گئے۔ ان کا یہ استبدادی دور تقریباً دو صدیوں پر محیط ہے۔ اس دور میں ہر شعبۂ زندگی میں تبدیلیاں آئیں ادب بھی اس نوآبادیاتی عہد کے اثرات وثمرات سے متاثر ہوا اور نئے اصناف و اسالیب متعارف ہوئے جن میں مضامین، سوانح، تنقید، ناول ، افسانہ، آزاد نظم اور سفرنامہ اہم اصناف ہیں۔ سفرنامہ اس دور میں اتنی معروف و مقبول صنف بن گئی کہ اس میں کئی خواتین نے بھی طبع آزمائی کی اور اپنے سفر کے حالات و مشاہدات دلچسپ انداز میں تحریر کیے۔

سفرنامے کی صنف ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے اور اردو میں بھی اب اس میں خاصا سرمایہ موجود ہے۔ اس صنف پر جو تحقیقی کام ہوئے ہیں، ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن نوآبادیاتی عہد میں خواتین کے اردو سفرناموں کا مطالعہ ابھی نامکمل ہے جب کہ نوآبادیاتی عہد کی خواتین سفرنامہ نگارں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے اور یہ بھی اردو ادب کا گراں قدر سرمایہ ہے۔ لیکن ان پر تاحال کوئی باقاعدہ اور مستقل تحقیقی کام نہیں ہوا ہے۔ عام سفرناموں پر ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر قدسیہ قریشی، ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر خالد محمود اور ڈاکٹر بشریٰ رحمنٰ وغیرہ نے کام کیا ہے جن کی وجہ سے اس صنف کی حیثیت نمایاں ہوئی ہے۔ لیکن راقمہ کی معلومات کے مطابق اردو سفرنامہ نگاری کی تاریخ میں خواتین سفرنامہ نگاروں کے کردار پر کوئی جامع، مبسوط

اور مستند تحقیق ابھی تک سامنے نہیں آسکی، جو ان کے کام کی اہمیت و افادیت اجاگر کرتی۔ دوسری اہم بات نوآبادیاتی عہد کے سفرناموں کا بطورِ خاص مطالعہ ہے۔ یہ عہد ہماری سیاسی و سماجی تاریخ کا انتہائی اہم دور ہے جب ہماری قومی شخصیت کے خدوخال کی تشکیل ہوئی۔ اردو سفرنامے کی فنی و ادبی خصوصیات کی تلاش بھی ضروری تھی۔ اب تک اردو سفرناموں پر جو کام ہوا ہے وہ صرف سفرنامے کے آغاز و ارتقا اور ان کے عمومی تعارف پر ہے۔ ان میں اوّل تو تمام خواتین سفرنامہ نگاروں کا تذکرہ ہی نہیں ملتا اور جہاں یہ تذکرہ موجود بھی ہے، وہ بہت کم اور سرسری سا ہے۔ ان مطالعات میں نہ تو خواتین کے سفرناموں کا مفصل اور گہرا تجزیہ کیا گیا ہے اور نہ ہی ان کے سیاسی و سماجی افکار کا کھوج لگانے کی کوشش کی ہے۔ ایسی صورت حال میں یہ صنف اس امر کی متقاضی تھی کہ اس کی طرف توجہ مرکوز کی جائے اور ان خواتین کے سفرناموں کے مطالعے و تحقیق کے ذریعے ان کی قدر وقیمت کا تعین کیا جائے۔

چنانچہ راقمہ نےا س جانب توجہ کی اور اللہ کے فضل و کرم سے پانچ ابواب پر مشتمل یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس سلسلے میں ایک وضاحت ضروری ہے کہ اس تحقیق میں انیسویں صدی سے لے کر قیامِ پاکستان تک کے سفرناموں کا احاطہ کیا گیا ہے اور اس میں خواتین کے ان اردو سفرناموں کو شامل کیا ہے جو باقاعدہ کتابی صورت میں شائع ہوئے ہیں۔

یہ مقالہ کل پانچ ابواب پرمشتمل ہے۔ پہلا باب سفرنامے کے فن، اہمیت اور روایت پر ناز ہے۔ اس میں سفرنامے کے معنی و مفہوم پیش کرنے کے علاوہ سفرنامے کی تکنیک، اسلوب، اقسام بیان کرنے کے ساتھ اس کی اہمیت و روایت بھی واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

دوسرے باب میں نوآبادیاتی عہد کا مطالعہ کیا گیا ہے اور اس عہد کے سفرناموں کی مختلف اقسام کی صورت میں درجہ بندی کی گئی ہے۔تیسرا باب نوآبادیاتی عہد کی سفرنامہ نگار خواتین کے علمی، سیاسی،سماجی اور خاندانی پس منظر پر مشتمل ہے۔ اب تک ان خواتین کے حالات و پس منظر کے بارے میں معلومات مختلف تذکروں اور رسائل میں تھوڑی بہت پائی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے سفرناموں سے بھی

راقمہ نے معلومات اکٹھی کی اور ان کو اس باب میں شامل کیا۔ اس باب کے سلسلےمیں راقمہ نے بہت سے نامور ادیبوں سے رابطہ کیا اور ان سے ان کا خاندانی پس منظر جاننے کی کوشش کی اور بالآخر اس حد تک کامیابی ہوئی کہ چند خواتین کے علاوہ باقی کی خواتین کی سوانح حیات کو مکمل کیا۔

چوتھے باب میں خواتین کے سفرناموں کا سیاسی و سماجی مطالعہ کیا گیا ہے۔ اور ان کی ادبی اہمیت کے ساتھ سفرناموں کی نوعیت، سفر کرنے کے مقاصد پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان سفرناموں کا تجزیہ موضوعات کی حد بندی کے تحت کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے دیارِ مقدسہ کے سفرنامے ، پھر دیارِ مغرب اور آخر میں اندرونِ ہندوستان کے سفرناموں کا خصوصی جائزہ لیا گیا ہے۔پانچویں باب میں خواتین سفرنامہ نگاروں کے امتیازی خصائص کا جائزہ ان کے عہد کے تہذیبی و تمدنی مظاہر کے تناظر میں لیا ہے۔

سب سے پہلے اس پاک ذات کا صد شکر ہے کہ جس نے ہمیشہ مجھے میری اوقات سے بڑھ کر نوازا اور میرے تحقیقی کام کی تکمیل بھی اُس ہی کی خاص عنایت ہے۔ اب میں ان تمام افراد کا شکریہ ادا کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتی ہوں جن سب کا میرے اس تحقیقی کام میں کسی نہ کسی طرح کا تعاون رہا ہے۔ میرے ابو جان، بھائی اور بہنیں جو زندگی کے گرم و سرد میں ہمیشہ میرے لیے دعاگو، کوشاں اور فکرمند رہے۔ ان کی محبتوں کی میں مقروض رہوں گی ۔

سب سے پہلے میں اپنی مشفق استاد و نگران ڈاکٹر نجیبہ عارف صاحبہ کا خلوصِ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں جن کی علمیت ، تجربہ اور تخلیقی بصیرت نے قدم قدم پر کبھی ڈانٹ اور کبھی پیار سےمیری رہنمائی کی اورمیری دل چسپی دیکھتے ہوئے میرے لیے یہ موضوع تجویز کیا۔ ڈاکٹر حمیرا اشفاق صاحبہ کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتے ہوئے مجھ خوشی محسوس ہو رہی ہے جن کی نیک خواہشات اور مواد کی فراہمی نے میرا کام آسان بنایا۔ محترم جناب ڈاکٹر معین الدین عقیل صاحب کا شکریہ ادا کرنا میرے لیے واجب ہے کہ جنھوں نے بڑی شفقت سے اپنی لائبریری سے مجھے استفادہ کی اجازت دی۔

اپنے پیارے بھتیجے احتشام اکبر کا بھی خصوصی طور پر شکریہ اداکرتی ہوں جو اپنی تمام تر مصروفیات کو چھوڑ کر میرے ساتھ گھنٹوں لائبریریوں کی خاک چھانتا رہا مگر کبھی بھی ناگواری کااظہار تک نہ کیا اور دوست عطیہ ثمرہ کی دعاوؤں نے ہر مشکل کو ختم کیا اور میری ہمت بڑھائی جس کا میں شکریہ ادا کرتی ہوں۔

شعبۂ اردو کے تمام اساتذہ اور ساتھیوں کی بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے میری حوصلہ افزائی کی۔ اپنی عزیز دوستوں عاصمہ نذیر، اسماء عزیز اور سمیرا منیر کی بے حد ممنون ہوں جنھوں نے وقتاً فوقتاً میرا حوصلہ بڑھایا اور مجھے مقالہ مکمل کرنے کی تاکید کرتی رہیں۔ اپنی ہنستی مسکراتی چھوٹی بہنوں نوشین اختر، صابرہ، وجیہہ اور بصرین کا بھی خصوصی شکریہ کہ جنھوں نے اپنی پُر خلوص دعاؤں سے نوازا۔

اپنی دوستوں صغریٰ، نگینہ اور شہلا کی محبتوں اور خدمات گزاریوں کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی کہ جن کے تعاون اور ساتھ نے اس مرحلے کو کامیابی سے ہم کنار کیا اور جن کا شکریہ ادا نہ کرنے پر مار پڑنے کا اندیشہ ہے۔ آخر میں اپنے تمام احباب اور کرم فرماؤں کا شکریہ ادا کرتی ہوں جن کا ذکر اس فہرست میں نہیں ہو سکا۔

روبینہ پروین

فہرست موضوعات

فہرست ابواب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب اوّل

سفرنامہ کی صنف: اہمیت و روایت

الف۔ سفرنامہ بطور صنفِ ادب:

سفر ازل سے انسانی فطرت میں شامل ہے۔ اور وہ اپنی اسی فطرت کی وجہ سے کبھی بھی ایک جگہ ٹھہر نہیں سکا۔ انسان مختلف مقاصد کی تکمیل کے لیے سفر اختیار کرتا رہا ہے، کبھی وہ معاشی ضروریات کی تکمیل کے لیے گھر سے نکلا اور کبھی دین کی خاطر نقل مکانی کی۔ ایک سفر سیر و تفریح کی غرض سے بھی کیا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں بھی ہمیں سفر اختیار کرنے کی متعدد جگہوں پر تلقین کی گئی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورہ العنکبوت میں فرمایا ہے:

قُل سِیرُوا فِی الاَرضِ

کہہ دو کہ تم زمین میں چلو پھرو۔ [۱]

سفر زندگی کا ایک بڑا اہم جزو ہے اور ہر انسان کو اس میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ سفر کو وسیلہ ظفر بھی کہا گیا ہے۔کیوں کہ سفر سے کامیابیاں اور کامرانیاں بھی ملتی ہیں اس سے راہ و رسم بڑھتے ہیں اور ترقی کے دروازے کھلتے ہیں۔

انسانی زندگی اور سفر دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ ابتداء ہی سے جب انسان کسی ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لیے پیدل یا کسی سواری پر سالوں سفر پر رہتا تھا تو وہ راستے کی ہر مشکل اور ہر واقعے کو اپنے دل و دماغ میں محفوظ کر تا جاتا تھا اور واپسی پر وہ ان تمام واقعات و مشاہدات اور تجربات میں دوسروں کو شریک کرتا تھا۔ اپنی کہانی میں دوسروں کو شریک کرنے کی یہی خواہش سفرنامے لکھنے کا باعث بنی اور سفرنامے لکھنے کا آغاز ہوا۔

سفرنامہ: تعریف و تعبیر:

"سفر"عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی "طے مسافت"یا "قطع مسافت"کے ہیں۔ اردو زبان میں یہ لفظ عربی سے مستعار ہے۔ اور انھی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح "نامہ"فارسی زبان کا لفظ ہے۔ اور جس کے لغوی معنی "لکھے ہوئے خط"، "فرمان" یا "تحریر شدہ عبارت" کے ہیں۔ اس طرح عربی اور فارسی کے ان دو لفظوں کو ملا کر سفرنامہ کی اصطلاح وضع کی گئی۔اُردو میں سفرنامہ رودادِ سفر یا سفر کے مشاہدات و تجربات کو تحریری طور پر بیان

کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ سفرنامہ ایک قدیم نثری صنف ہے۔ عربی میں "رحلات" اور انگریزی زبان میں اسے "Travelogue" کہا جاتا ہے۔ سفرنامہ کی تعریف کے ضمن میں ڈاکٹر مرزا حامد بیگ رقم طراز ہیں۔

> سفرنامہ ہر ادب کی ایک مستقل بیانیہ صنف ہے جس میں خارجی مشاہدہ کو تخیل پر فوقیت حاصل ہے، البتہ سفر سے متعلق ہونے کے باعث سفرنامہ میں تحیّر کا عنصر نمایاں تر ہے۔ لیکن یاد رہے کہ مستقل ادبی صنف ہونے کے ناطے سفرنامہ کی پیش کش ادبی نوع کی ہو گی نہ کہ محض مسافر کا بیانیہ اس لیے کہ أمر مجبوری سفر اختیار کرنے والے ہر مسافر کا سفری احوال، ادب کی ایک مستقل صنف سفرنامہ یا سیاحت نامہ نہیں کہلائے گی۔ [۲]

سفرنامہ نثری ادب کی بیانیہ صنف ہے جس میں سفر کرنے والا اپنے چشم دید واقعات، تجربات و مشاہدات کو بیان کرتا ہے۔ اس میں نہ صرف خارجی واقعات کا بیان ہوتا ہے بلکہ باطنی احساسات و جذبات کا اظہار پایا جاتا ہے اور وہی سفرنامہ ادبی کہلائے گا جس میں خارج اور باطن کا امتزاج پایا جائے۔ سفرنامہ میں کسی ملک کے حالات، جغرافیہ، تاریخ اور محل وقوع کو بیان کرنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ یہ ایک تخلیقی تجربہ ہے۔ ایک ادیب یا ایک فنکار دورانِ سفر جن حالات و واقعات سے گزرتا ہے ان کو تمام جزیات سمیت اپنے جذبات و احساسات کے ساتھ ضبطِ تحریر میں لاتا ہے تو یہ تخلیقی کاوش سفرنامہ کے زمرے میں آتی ہے۔ سفرنامہ کے بارے میں ڈاکٹر قدسیہ قریشی لکھتی ہیں کہ

> سفرنامہ کے معانی داستانِ سفر، روداد سفر یا سفر کے قصّے کے ہیں جسے تحریری طور پر پیش کیا گیا ہو۔ انگریزی میں ایسے سفر کو بیان کرنے والی متحرک تصاویر یا مصّور تقریر بتایا گیا ہے۔ [۳]

سفر نامہ ایک ایسی صنف ادب ہے جن میں سفرنامہ نگار دورانِ سفر پیش آنے والے حادثات و واقعات اور مشاہدے میں آنے والی ہر چیز کو تحریری صورت میں بیان کرتا ہے۔ وہ اپنے اس عمل سے دوسروں کو معلومات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ تجسس کو پیدا کرنے کے مختلف حربے استعمال کرتا ہے تاکہ قاری کی دلچسپی شروع سے آخر تک قائم رہے اور وہ

پورا سفرنامہ پڑھنے پر مجبور ہو۔ سفرنامے کی صنف کے متعلق ابو الاعجاز حفیظ صدیقی رقم طراز ہیں:

> اجنبی شہروں اور غیر ممالک کے جغرافیائی اور سماجی حالات سے انسان نے ہمیشہ گہری دلچسپی لی ہے۔ ایک سیاح جب اپنے جغرافیائی اور سماجی گردوپیش سے نکل کر کسی دوسرے مقام پر پہنچتا ہے تو وہ ایسی تمام چیزیں جو اس کے اپنے مولد و منشا کے مانوس سے مختلف ہوتی ہیں اختلافِ ماحول اور اختلافِ معاشرت کے باعث دلچسپ اور استعجاب انگیز نظر آتی ہیں اور وہ باتیں جو مشترک ہوتی ہیں وہ اپنے اشتراک کے باعث دلچسپ معلوم ہوتی ہیں اور انھیں دوسرے بالخصوص اپنے ہم وطنوں کے لیے قلم بند کر لیتا ہے۔ ایسی تحریر کو اد بی اصطلاح میں سفرنامہ کہتے ہیں۔ [۴]

سفرنامہ تخلیق کرنے کی بنیادی شرط سفر ہے۔ یہ تخیلاتی صنفِ ادب نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی حالات و واقعات اور مشاہدات کا متقاضی ہوتا ہے۔ اس کے لیے دیس پردیس، اجنبی راستوں اور مختلف حالات و واقعات سے گزرنا پڑتا ہے تب کہیں سفرنامہ وجود میں آتا ہے۔ سفر کرنے کے مختلف مقاصد ہو سکتے ہیں اور یہ دورانِ سفر یا اختتامِ سفر پر لکھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر خالد محمود سفرنامے کے بارے میں کہتے ہیں کہ سفرنامہ نگار دورانِ سفر یا سفر سے واپسی پر اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات اور تاثرات و احساسات کو ترتیب دے کر جو تحریر رقم کرتا ہے وہ سفرنامہ ہے ۔ [۵]

اس طرح سفرنامہ نگار اپنی تحریر کے ذریعے نہ صرف معلومات فراہم کرتا ہے بلکہ وہ اپنے اس تجربے میں دوسروں کو بھی شامل کرتا ہے۔ جس احساسات و جذبات اور حادثات و واقعات سے وہ خود گزرتا ہے تو وہ کوشش کرتا ہے کہ اس کی ہوبہومنظر کشی کرے تو جب وہ خارجی ماحول کے ساتھ ساتھ اپنے باطن پر گزرنے والی کیفیات کا خوبصورت الفاظ میں اظہار کرتا ہے تو سفرنامہ ادب کی صنف بن جاتا ہے اور یوں سفرنامہ ایک معلوماتی تحریر کی بجائے ادبی دائرے میں آجاتا ہے۔ ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد سفرنامے کے بارے میں لکھتے ہیں:

> سفرنامہ نثری ادب کی ایک ایسی صنف ہے جو سفر کے حالات و واقعات، مشاہدات، کوائف اور تجربات کا

> اظہاریہ ہے۔ یہ وہ بیانیہ ہے جو مسافر کے ذوق اور احوالِ سفر کا غماز ہے۔ یہ وہ آئینہ ہے جس میں مسافر کے عرصہ سفر کے روز وشب جگمگاتے ہیں۔ [6]

سفرنامہ اردو ادب میں ایک اہم صنف کی حیثیت اختیار کر چکا ہے اور یہ نہ صرف کسی سیاح کی سیاحت کا احوال ہوتا ہے بلکہ یہ سفرنامہ نگار کی خود نوشت بھی ہوتا ہے۔ وہ اپنی ذات کے تناظر میں کسی ملک کے حالات، معاشرت اور طرزِ بودوباش کا ذکر کرتا ہے۔ اس طرح وہ ایک طرف تو سفر کے دوران پیش آنے والے واقعات اور گردوپیش کے مناظر کو بیان کرتا ہے تو دوسری طرف اپنی پسند، ناپسند اور احساسات کی ترجمانی بھی کر رہا ہوتا ہے۔ سفرنامہ کے بارے میں سحر انصاری یوں رقم طراز ہیں:

> آج کل دنیا میں دو اصنافِ ادب بطورِ خاص مقبولیت حاصل کر رہی ہیں۔ ایک تو سفر نامہ اور دوسری خود نوشت، ویسے دیکھا جائے تو سفرنامہ بھی ایک نوع کی خودنوشت ہوتا ہے اور خود نوشت ایک طرح کا سفرنامہ کہا جا سکتا ہے۔ [7]

۱۔ سفرنامہ کی تکنیک:

تکنیک طریقے یا انداز کو کہتے ہیں۔ ادیب و شاعر یا فن کار جس کے ذریعے اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کرتا ہے۔ ویبسٹر سکول ڈکشنری "Webster School Dictionary" کے مطابق:

> The way in which technical details are treated (as by a riter) or basic physical movements are used (as by a dancer) also: ability in such treatment or use (faultless Piano techniques). [8]

نگہت ریحانہ خان تکنیک کی تعریف یوں بیان کرتی ہیں کہ

> ہر موضوع اور مواد کے لیے الگ تکنیک کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک خاص مواد، ایک خاص تکنیک کے استعمال سے پُر اثر ہوجاتا ہے۔ اس کا استعمال مجموعی تاثر پیدا کرنے کے لیے یا اس کو بڑھانے کے لیے کیا جاتا ہے گویا تکنیک مقصد نہیں وسیلہ ہے۔ [9]

تکنیک ایک ایسا طریقہ ہے جس کو اپنا کر تخلیقی جذبہ کا اظہار کیا جاتا ہے۔ ہر صنف کے لیے ایک الگ تکنیک کی ضرورت پڑتی ہے۔ داستان،، ناول، ڈرامہ، سفرنامہ، ہر ایک کی تکنیک دوسرے سے مختلف ہے کسی ایک صنف میں بھی مختلف تکنیکیں استعمال کی جا سکتی ہیں۔ اظہار کی قوت مختلف تکنیک کی متقاضی ہوتی ہے۔ بقول ڈاکٹر احسن فاروقی:

> یہ امر ہمیشہ سے مسلّم ہے کہ فن کے لیے تکنیک ضروری ہے لیکن اگر وہ فن میں چھُپ نہ سکے تو فن بناوٹی ہو جاتا ہے اور اپنے مقصد سے ہٹ جاتا ہے۔ (۱۰)

ہر تخلیق کار اپنے خیالات و احساسات اور تجربات کو بیان کرنے کے لیے مختلف طریقے استعمال کرتا ہے۔ یہی طریقے تکنیک کہلاتے ہیں۔ تکنیک کے استعمال کے لیے تخلیق کار کے ذہن میں کچھ تصورات ہوتے ہیں۔ کسی بھی صنف کے لیے تکنیک نہایت ضروری ہے۔

سفرنامہ ایک ایسی صنف ہے جس میں تکنیک کے نئے نئے تجرات کیے جا رہے ہیں۔ اردو کے ابتدائی سفرنامہ نگاروں نے اپنے سفرنامے، خطوط، ڈائری، روزنامچے تکنیک میں لکھے مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دوسری اصناف کی طرح سفرنامے میں بھی کئی تکنیکیں استعمال کی گئیں جیسے فلیش بیک، رپورتاژ، مکالماتی، آپ بیتی وغیرہ۔ تکنیک کے استعمال سے سفرنامہ نگار اپنی تمام صلاحیتیں بروئے کار لاتا ہے تاکہ وہ اپنے مشاہدات و تجربات کو مؤثر انداز میں دوسروں تک پہنچائے۔ وہ اپنی تخلیقات میں تکنیک کااستعمال ایک خاص تاثر پیدا کرنے اور چونکانے کے لیے کرتا ہے تاکہ وہ دوسروں سے الگ نظر آئے۔ بعض اوقات وہ شعوری اور لاشعوری طور پر ایسے تکنیکی حربوں کا استعمال کرتا ہے کہ اس کی تحریر پُر اثر ہو جائے۔

سفرنامہ تکنیک کے اعتبار سے ایک ایسی صنف ہے جس میں بہت سی دیگر اصناف کے اوصاف شامل ہوتے ہیں مثلاً ڈائری، خطوط، آپ بیتی، روزنامچہ، رپورتاژ، ناول کی تکنیک میں افسانوی رنگ شامل کر کے ، حتیٰ کہ منظوم سفرنامے بھی تخلیق کیے گئے ہیں۔ ابتدائی اور قدیم تمام سفرنامے بیانیہ تکنیک میں لکھے گئے ہیں۔ آج کے سفرنامے میں بیانیہ کے ساتھ ساتھ دیگر ادبی حربے بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ اردو کے

قدیم سفرناموں میں بالعموم یہ طریق کار رائج رہا ہے کہ سفرنامہ نگار بیشتر ایسی تاریخی، جغرافیائی، تہذیبی، معاشرتی اور دیگر معلومات فراہم کرنے کا فریضہ سرانجام دیتے تھے جو دوسروں کو راستے کی مشکلوں سے بچانے کا کا م دیں۔ سفرنامے کی مختلف تکنیکوں کے بارے میں شفیع عقیل لکھتے ہیں:

> دنیا کی ہر زبان میں سفرنامے مختلف صورتوں میں موجود ہیں، یادداشتوں کے روپ میں، ڈائریوں کی شکل میں، روزنامچوں کے انداز میں، آپ بیتی کی صورت میں، احوال و آثار کی تحریروں میں ، خطوط کی طرز پر۔ [۱۱]

اُردو کے نامور سفرنامہ نگاروں یوسف خان کمبل پوش نے عجائبات فرنگ،مسیح الدین علوی سفیر اودھ، منشی محبوب عالم سفرنامہ یورپ، محمد حسین آزاد سیرِ ایران ، کریم الدین سیاحت نامہ ،سرسید احمد خان مسافرانِ لندن اور شبلی نعمانی نے اپنے سفرنامے روم و مصر وشام میں ملک کی حالت، انتظامیہ کا طریقِ کار، عدالت کا اصول، ملک کا جغرافیہ، تجارت کی کیفیت اور عمارتوں کے نقشے جات وغیرہ کو سفرنامے کا حصہ بنایا ہے اور یہ سفرنامے سفری گائیڈکا فریضہ سرانجام دیتے ہیں مگر آج کا سفرنامہ کہانی کی صورت میں لکھا جا رہا ہے۔ سفرنامہ چونکہ واحد متکلم میں لکھا جاتا ہے، اس لیے اس میں آپ بیتی کا انداز نظر آتا ہے اور سفرنامے میں دلچسپی کا عنصر بڑھ جاتا ہے۔ سفرنامے کی تکنیک میں اہمیت اس بات کو ہے کہ سفرنامہ کس وقت لکھا گیا اور لکھنے والے نے اپنی یادداشتوں کو کیسے محفوظ کیا ہے۔ سفرنامے کی تکنیک کے جو جو تجربات کیے جاتے ہیں ان کا مختصر احوال درج ذیل ہے۔

۲۔ خطوط کی تکنیک:

دورانِ سفر لکھے ہوئے سفرنامے کی دوسری صورت خطوط کی صورت میں نظر آتی ہے۔ ڈائری کی حیثیت میں لکھے گئے سفرناموں میں تخلیقی عمل بہ ساختہ اُبھرتا ہے لیکن خطوط میں آرائش اور تخلیقی عنصر موجود ہوتا ہے۔ ڈائری میں سفرنامہ نگار اپنے جذبات و احساسات میں دوسروں کو شامل نہیں کرتا بلکہ خود پر گزرنے والی کیفیات اور اپنے

تجربات کو ڈائری کے حوالے کر دیتا ہے۔ مگر خطوط کا مخاطب تو فاصلے پر موجود ہوتا ہے اور وہ مناظر کے حُسن و لطافت میں بالواسطہ شریک ہوتا ہے اور سیاح وہ کیفیت جو اُس نے خود محسوس کی ہوتی ہے مکتوب الیہ کو بھی منتقل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسا بیانیہ صداقت پر مبنی ہوتا ہے کیونکہ سیاح آنکھوں دیکھا حال فوری طور پر دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ اس تکنیک کے بارے میں ڈاکٹر شہاب الدین لکھتے ہیں:

> اس میں سفرنامہ نگار اپنے گھر کے افراد، دوست، رشتے دار یا کسی دیگر متعلق شخص کو خط کے ذریعے احوالِ سفر سے واقف کراتا ہے۔ چوں کہ اس تکنیک میں بھی حالات و واقعات دورانِ سفر ہی تحریر کیے جاتے ہیں اس لیے اس میں بھی واقعات و جذبات کی تازگی اور صداقت کے عناصر موجود ہوتے ہیں۔[۱۲]

عطیہ فیضی کا سفرنامہ زمانۂ تحصیل، عبد الغفار خاں کا سفرنامہ سیر دکن، شیخ عبد القادر مقامِ خلافت، نازلی رفیعہ سلطان سیر یورپ، خطوط کی تکنیک میں ہیں۔ اپنے سفرنامے لکھنے کے متعلق نازلی رفیعہ سلطان سیرِیورپ کی تمہید میں یوں رقم طراز ہیں۔اصل میں یہ وہ خطوط ہیں جو میں نے اپنے بزرگوں کے نام سیرِیورپ کے حالات کے لکھے ہیں اس میں نہ عبارت آرائی ہے نہ قافیہ پیمائی۔[۱۳]

۳۔ ڈائری / روزنامچے کی تکنیک:

ڈائری/روزنامچے کی تکنیک اُن سفرناموں میں ملتی ہے جو سفر کے دوران لکھے جاتے ہیں۔ ایسے سفرناموں کے سیاح اپنا زیادہ وقت گھومنے پھرنے اور ارد گرد کے مشاہدے میں گزارتے ہیں اور وہ جو کچھ دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں اسے اپنے دل و دماغ یا کسی ڈائری پر لکھتے رہتے ہیں۔ سفر ختم ہونے کے بعد ان یادداشتوں کو سفرناموں کی صورت میں بیان کر دیتے ہیں۔ ایسے سفرناموں میں سیاح چوں کہ تمام مناظر کو پھر سے یاد کر کے لکھتا ہے تو اس میں تخیل کو بھی راہ مل جاتی ہے۔

قدیم سفرناموں میں بہت سے سفرنامے ڈائری کی تکنیک میں لکھے گئے ہیں۔ ان سفرناموں میں سفرنامہ نگار دورانِ سفر کے تمام حالات و واقعات کو تاریخی ترتیب سے لکھتا ہے۔

تو ایسا سفرنامہ ڈائری کی تکنیک اختیار کر لیتا ہے۔ جس میں عام تجربات و مشاہدات ترتیب وار ہوتے ہیں۔ اس قسم کا سفرنامہ نہ صرف سماجی و معاشرتی تاریخ کو بیان کرتا ہے بلکہ حالات و واقعات پر سیاح کا فوری ردّعمل بھی ظاہر کر دیتا ہے۔ اس قسم کے سفرناموں کے متعلق ڈاکٹر قدسیہ قریشی یوں رقم طراز ہیں:

> ایسے سفرنامے جو افسانوں ، داستانوں سے زیادہ واقعات ، حالات یا رہنمائے سفر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ابتدائی سفرناموں کے ادب میں زیادہ اہم ہیں۔ یعنی یہ سفرنامے سفری روزنامچوں یا گائیڈ بُک کی شکل میں لکھے گئے، جنھیں شروع میں سفر کے متعلق نقشوں اور سفری معلومات کی اطلاع فراہم کرنے والی کتابوں کی صنف میں رکھا گیا۔ [۱۴]

ڈائری کی تکنیک میں لکھے گئے سفرناموں میں سچائی کا عنصر قدرے زیادہ پایا جاتا ہے کیونکہ دورانِ سفر سیاح جو کچھ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے اس کو ہوبہو لکھ لیتا ہے۔ اس قسم کے سفرناموں میں محمد طفیل کا سفرنامہ " یورپ کا سفرنامہ" سیّد فدا حسین کا "تاریخ افغانستان"، نثار علی بیگ کا "سفرنامہ یورپ"، صغرا ہمایوں بیگم "روزنامچہ بھوپال، آگرہ، دہلی کے حالات"، ڈاکٹر وزیر آغا " انگلستان کا سفرنامہ" شامل ہیں۔ یہ سفرنامے ڈائری کی تکنیک میں لکھے گئے ہیں اس لیے ان میں مشاہدہ تازہ اور سچائی سے بھرپور ہے۔

۴۔ ناول کی تکنیک:

دنیا کے تمام ادب میں ایسے بہت سے ناول اور افسانے لکھے گئے ہیں جن میں علاقائی جزیات کی خوبصورت عکاسی کی گئی ہے۔ افسانہ ایک تخیلی صنفِ ادب ہے اور اس میں حقیقت کا عنصر بہت کم پایا جاتا ہے مگر سفرنامے میں گردوپیش کا مشاہدہ کر کے اپنے تجربات و احساسات کی روداد بیان کی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں بعض افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں نے سفرکے پس منظر میں خوبصورت ناول اور افسانے لکھے ہیں جیسے فردوس حیدر کا ناول "دائروں میں دائرے" اور ڈاکٹر فرخندہ جالی کا "گرین کارڈ" سفرنامے کی ہیئت میں پیش کیے گئے ہیں۔ اس طرح یہ ناول سفرنامہ بھی ہے لیکن

اسے آسانی سے ناولوں کی صنف میں جگہ دے سکتے ہیں۔ ان کی تکنیک کے متعلق ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں کہ

> سفرناموں کو ناول کے انداز میں لکھنے کے دو تخلیقی تجربے حال ہی میں منظرِ عام پر آئے ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ دونوں تجربے خواتین نے کیے ہیں۔ فردوس حیدر کا "دائروں میں دائرے " اور ڈاکٹر فرخندہ جالی کا "گرین کارڈ" ایسے سفرنامے ہیں جو کرداروں کے حوالے سے لکھے گئے ہیں اور جن میں ناول کے وسیع کینوس کو استعمال کر کے ان کرداروں کے گرد پوری کہانی بھی بُن دی گئی۔[۱۵]

اسی طرح مستنصر حسین تارڑکا پیار کا پہلا شہر ، قرۃ العین حیدر کا جہانِ دیگر، عزیز احمد اور رفعت ملک کے بعض افسانوں اور ناولوں میں غیر ملکی فضا کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن افسانے، ناول اور سفرنامے کے فنی تقاضے مختلف ہیں۔ سفرنامے میں چوں کہ سیاح ان دیکھی سرزمینوں کی سیر کرتا ہے۔ اور وہ نئی دنیا سے واقفیت پیدا کرتا اور انوکھے مناظر کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اس طرح سفرنامہ نگار اپنے سفرنامے میں مختلف حادثات و واقعات اور مہمات کو بیان کرتا ہے۔ اور یہی باتیں سفرنامے میں داستان اور افسانے جیسی دلچسپی پیدا کر دیتی ہیں۔

۵۔ ڈرامائی تکنیک:

سفرنامہ اپنے آغاز سے مسلسل ارتقائی سفر کر رہا ہے۔ اس میں ہیئت، موضوع اور اسلوب کے نِت نئے تجربات کیے گئے ہیں۔ مختلف تکنیکوں کو بروئے کار لا کر سفرنامے تخلیق کیے گئے ہیں۔ افسانے اور ناول کی سی تحیّر خیزی پیدا کی گئی۔ مکالمے کی مدد سے ڈرامائی ہیئت کا تجربہ بھی کیا گیا ہے۔ جیسا کہ قدرت اللہ شہاب نے اپنے سفرنامے اے بنی اسرائیل میں میلو ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اسی طرح اطلاعی نوعیت کی تکنیک کو طیب علی شاکر جبل پوری نے تذکرہ سیفی میں استعمال کیا ہے۔ یہ سفرنامہ ایک الگ اور منفرد تکنیک میں ہے۔ اس سفرنامے میں مختلف اخبارات سے اس سفر کے متعلق معلومات اکٹھی کر کے اسے مرتب کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ سفرنامہ اطلاعی نوعیت اختیار کر گیا ہے۔ اس تکنیک کے بارے میں سفرنامے کے مرتبہ طیب علی عبد الرسول مقدمے میں لکھتے ہیں:

> اس سفر کے حالات ہم خود اپنے قلم سے نہیں لکھنا چاہتے بلکہ مختلف اخباروں کی مختلف اشاعتوں میں جو مضامین سفر مذکورہ کے متعلق شائع ہوئے ہیں ان سب کو ایک ترتیب کے ساتھ معہ ضروری نوٹوں کے ہم اس کتاب میں جمع کر دیتے ہیں اور بس۔ [۱۶]

مگر اس تکنیک میں ابھی تک کم سفرنامے تخلیق ہوئے ہیں۔ یہ صنف زیادہ مستعمل نہیں ہے۔ آج کے سفرناموں کے تکنیکی رنگ و روپ میں بہت زیادہ تنوع پیدا کیا گیا ہے۔ اس لیے اب ہمیں سفرنامے کئی شکلوں میں ملے گا۔

۶۔ آپ بیتی کی تکنیک:

سفرنامے میں سفرنامہ نگار کی نگاہ نہ صرف خارجی مناظر پر ہوتی ہے بلکہ اس کی باطنی زندگی بھی ہر لمحے اس پر اثر انداز ہوتی ہے۔ بہت سے حالات و واقعات ایسے ہوتے ہیں جو اس کی ذات سے وابستہ ہوتے ہیں۔ وہ جب ان کا بیان کرتے لگتا ہے تو سفرنامہ آپ بیتی میں ڈھلنے لگتا ہے اور ایسے لگنے لگتا ہے کہ یہ دونوں سگی بہنیں ہیں۔ کیوں کہ دونوں میں ادیب یا سفرنامہ نگار اپنے آپ کو براِ راست پیش کرتا ہے جیسے سر رضا علی کا اعمال نامہ جعفر تھانیسری کا سفرنامہ کالا پانی اور حمیدہ اختر کا ہم سفردونوں ایسی ایک دوسرے میں گڈمڈ ہیں کہ بعض اوقات حمیدہ اختر کی آپ بیتی کو سفرنامے اور مولانا تھانیسری کے سفرنامے پر آپ بیتی کا گمان ہوتا ہے۔ بقول رحمان مُذنب:

> سفرنامہ آج ادب کا قابلِ قدر اثاثہ ہے اس سے عین متصل آپ بیتی ہے۔ یہ دونوں سگی بہنیں ہیں کیوں کہ دونوں میں فن کار اپنے آپ کو براِ راست پیش کرتا ہے اور گویا ہوتا ہے۔ اس طرح سے آپ بیتی بھی سفرنامہ ہے۔ یہ بھی ذاتی واقعات، واردات، معاملات، تجربات، محسوسات، جذبات اور نظریات کامرقع ہوتا ہے۔ [۱۷]

۷۔ رپورتاژ کی تکنیک:

رپورتاژ اخباری رپورٹ کو کہتے ہیں۔ اس میں تخیل کی رنگ آمیزی اور خارج سے متعلق نقطہ نظر اسے سفرنامے سے الگ کر دیتا ہے۔ حج ناموں میں سفرناموں کی نسبت رپورتاژ کے عناصر زیادہ پائے جاتے ہیں۔ ممتاز مفتی کالبیک ، بلقیس

ظفر کا مسافتیں کیسیاور سید انیس جیلانی مقبوضہ ہندوستان رپورتاژ کی تکنیک میں ہے۔

۸۔ فلیش بیک کی تکنیک:

کچھ سفرنامہ نگاروں نے فلیش بیک کی تکنیک کو بھی نہایت خوبصورتی اور کامیابی سے استعمال کیا گیا ہے۔ اور یہ فلمی اور ڈرامائی تکنیک ہے۔ جس کے سہارے مصنف ماضی کی وادیوں میں چلا جاتا ہے۔ اور حال کے ساتھ ساتھ ماضی کی داستان بھی اپنے سفرنامے میں اس خوب صورتی سے بیان کرتا ہے۔ کہ وہ سفرنامے کا حصہ ہی معلوم ہوتی ہے۔ اس طریقے کو فلیش بیک کہتے ہیں۔ اس سے اشفاق احمد نےاپنے سفرنامے سفردرسفر اور عرش منور، قرۃ العین حیدر دکھلائیے لے جا کے اسے مصر کا بازار، محمود نظامی کا نظرنامہ اور ممتاز مفتی نے ہند یاترا میں اس تکنیک سے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں کہ:

> اشفاق احمد کا سفرنامہ اس فلم کی طرح ہے۔ جس میں فلیش بیک تکنیک سے زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ وہ ایک قدم آگے بڑھاتے ہیں لیکن اگلے قدم پر ہی ماضی اس کا دامن تھام لیتا ہے۔ [۱۸]

محمود نظامی بھی اپنے سفرناموں میں عہد رفتہ کی یادوں میں کھوئے رہتے ہیں اور اُن کا قلم بڑی روانی کے ساتھ اندرونی کیفیات و تاثرات کو پوری جزیات اور حاکمانہ قدرت کے ساتھ بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ بعض مقامات دیکھ کر چشم تصور میں زمانوں کا فاصلہ منٹوں میں طے کر کے اہرامِ مصر پہنچ جاتے ہیں اور ایک ایک جز کو ایسے سمیٹے چلے جاتے ہیں کہ تمام واقعات پر صداقت کا گمان ہوتا ہے۔

۹۔ منظوم سفرنامے کی تکنیک:

دنیائے ادب کے بہترین سفرنامے نثر میں ہی لکھے گئے ہیں اس لیے کہ نثر تفصیل کی زیادہ متحمل ہوتی ہے۔ اور اس کے برعکس نظم منظوم صورت میں ہوتی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ منظوم سفرنامے نہیں لکھے جا سکتے بلکہ مثنوی اور مسدّس کی ہیئت میں یہ سفرنامے لکھے گئے ہیں جو اس دور کی مقبول ترین صنف تھی اور کچھ حج ناموں میں نظم کی صنف کو عشق رسولؐ کی اظہار کے لیے

استعمال کیا گیا ہے۔ اردو کے منظوم سفرناموں میں قلق لکھنوی کا سفر آشوب (۱۸۷۲ء)، سندھی خا ن صفی کا تحفہ بنگال (۱۹۲۰ء)، ضیاء القادری بدایونی کا دیارِ نبی (۱۹۴۹ء)، واجد علی شاہ کا حزن اختر (۱۹۰۱ء) قابلِ ذکر ہیں۔

سفرنامے کا اسلوب:

کسی بھی ادیب و فنکار کے طرزِ تحریر یا لکھنے کے انداز کو اسلوب کہتے ہیں۔ اسلوب کسی بھی شخصیت کا اندازِ تحریر ہے جس سے لکھنے والے کی ذات کا اظہار ہوتا ہے۔ یعنی کوئی مصنف اور شاعر اپنے تخلیقی اظہار کے لیے جو انداز یا رویہ اختیار کرتا ہے وہی اس کا اسلوب کہلائے گا۔ اس طرح اسلوب سے مراد طرزِ تحریر، انداز، اظہارِ بیان، طرزِ بیان، راہ، روش ، اسٹائل، رنگ وغیرہ کے ہیں۔کشاف تنقیدی اصطلاحات کے مطابق:

> اسلوب سے مراد کسی ادیب یا شاعر کا وہ طریقہ ادائے مطلب یا خیالات و جذبات کے اظہار و بیان کا وہ ڈھنگ ہے جو اس خاص صنف کی ادبی روایت میں مصنف کی اپنی انفرادیت کے شعول سے وجود میں آتا ہے اور چوں کہ مصنف کی انفرادیت کی تشکیل میں اُس کا علم، کردار، تجربہ، مشاہدہ، افتاد طبع، فلسفہ حیات اور طرزِ فکر و احساس جیسے عوامل مِل جُل کر حصّہ لیتے ہیں اور اس لیے اسلوب کو مصنف کی شخصیت کا پرتو اور اس کی کلید سمجھا جاتا ہے۔[۱۹]

ہر تخلیق کار کا اپنا ایک طریقہ کار ہوتا ہے اور وہ اس پر چل کر اپنی ذات کا اظہار کرتا ہے۔ اس طرح ہر لکھنے والا اپنے لیے ایک الگ راہ نکالتا ہے اور اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کرتا ہے، اظہار کا یہی انداز و بیان اس کا اسلوب ہے۔ اسلوب کا تعلق جدت اور انفرادیت سے ہے۔ یہ جدت ہی کسی ادیب و شاعر کو ایک دوسرے سے ممتاز کرتی ہے اور اسے ایک الگ صاحبِ اسلوب کی حیثیت سے متعارف کرواتی ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے اسلوب کے متعلق یوں رقم طراز ہیں:

> شاعریا مصنف قدم قدم پر پیرائیہ بیان کی آزادی کا استعمال کرتا ہے۔ پیرائیہ بیان کی آزادی کا استعمال شعوری طور پر کرتا ہے اور غیر شعوری بھی۔ اس میں ذوق، مزاج، ذاتی پسند ناپسند، صنف، ہیئت کے

> تقاضوں نیز قاری کی نوعیت کے تصور کا بھی دخل ہو سکتا ہے۔ یعنی تخلیقی اظہار کے ممکنہ امکانات جو وجود میں آچکے ہیں اور جو وقوع پذیر ہو سکتے ہیں ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا (جن کا اختیار مصنف کرے) دراصل اسلوب ہے۔[20]

سید عابد علی عابد اسلوب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

> اسلوب دراصل فکر و معانی اور ہیئت و صورت یا مافیہ و پیکر کے امتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔[21]

اسلوب مصنف کی سوچ کا آئینہ دار ہوتا ہے بلکہ شخصیات کا تضاد اور ان کی جداگانہ حیثیت اسلوب ہی طے کرتا ہے۔ کسی بھی ادیب و شاعر کے اسلوب پر اس کا عہد بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ا سلوب کی اہمیت ادب میں بہت زیادہ ہے ایک طرح سے کسی ادب پارے کا اسلوب سے وہی رشتہ ہے جو روح کا جسم سے ہے۔ سفرنامہ ایک ایسا نثری بیانیہ ہے جس میں سفرنامہ نگار اپنے محسوسات، مشاہدات ، تاثرات اور تجربات کو تحریری صورت میں ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ لہٰذا سفرنامہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ دورانِ سفر اپنی ظاہری و باطنی آنکھیں کھُلی رکھے اور گردوپیش کا بڑی ذہانت اور باریک بینی سے مشاہدہ کر کے اپنے محسوسات کو خوبصورت زبان و بیان سے تحریر کرے۔سفرنامے میں معلومات کی فراہمی کے ساتھ ساتھ سفرنامہ نگار کا اسلوب بھی اہمیت رکھتا ہے۔ کیوں کہ اسلوب اس کی ذہنی کیفیات اور جذبات کا بھرپور عکاس ہوتا ہے۔ اس لیے سفرنامے میں گہرا مشاہدہ اور طرزِ بیان یا اسلوب کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور وہ سفرنامے سب سے زیادہ پسند کیے جاتے ہیں جو بہت خوبصورت اندازِ تحریر میں لکھے گئے ہوں۔ سفرنامے میں اسلوب کی اہمیت کے متعلق ڈاکٹر روبینہ شاہین لکھتی ہیں:

> سفرنامہ چوں کہ ہر قاری کی نظر سے گزرنے والی تحریر ہے لہٰذا سفرنامہ نویس کو عام فہم اور سادہ اسلوب استعمال کرنا چاہیے۔ واقعات کے بیان اور زبان پر خاص توجہ کی ضرورت ہے تاکہ عام ذہنی سطح کا آدمی اُسے پڑھ کر لطف اندوز ہو سکے۔ سفرنامے کی زبان جس قدر آسان، سلیس اور عام فہم ہو گی اسی قدر سفرنامہ کامیاب تصور کیا جائے گا۔[22]

سفرنامہ نگاری بھی ایک فن ہے جسے کمال تک پہنچانے کے لیے زبان وبیان کی خوبیوں کا ہونا اشد ضروری

ہے جو سفرنامے کو ادبی حُسن بخشتی ہیں۔ ایک سفرنامہ نگار کا اندازِ تحریر ایسا دلچسپ ہونا چاہیے کہ قاری جب اس کی تحریر کا مطالعہ کرے تو اس کو ختم کر کے ہی دم لے۔آج کے دورِ جدید میں سفرنامہ نگاری میں بھی اسلوب کے مختلف تجربات کیے گئے ہیں۔ ہر سفرنامہ نگار نے سفرنامہ لکھنے کے لیے اپنی پسند کے اسلوب کا انتخاب کیا ہے۔ بعض سفرنامے مزاحیہ اور افسانوی طرز میں لکھے گئے ہیں۔ کچھ نے اپنے سفری تاثرات کو سوانحی پیش کش کے رنگ میں ڈھالا۔ بعض ایسے بھی سفرنامہ نگار ہیں جنھوں نے شاعری کے اسلوب کو اپنایا، صحافیانہ اسلوب کے سفرنامے بھی لکھے گئے ہیں۔

۱۔افسانوی اسلوب:

جدید سفرنامے میں اسلوب اور طرزِ بیان کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ بعض اوقات سفرنامہ ایسی صورتحال اختیار کر لیتا ہے جیسے سفرنامے کا سیاح سفرنامے کا ہیرو ہو اور دورانِ سیاحت ملنے والی ہر لڑکی اس پر عاشق ہے۔ اس حوالے سے مستنصر حسین تارڑ بہت مشہور ہیں۔ وہ ایک سچے سیاح ہیں۔ انہوں نے اپنے سفرناموں میں قاری کوکمال کی خوبصورت دنیا دکھائی ہے۔ اس کا افسانوی اسلوب زندگی اور اس کی حقیقتوں سے اس قدر قریب ہے کہ ان کے سفرناموں کی طلسماتی حصار سے نکلنا دشوار ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوی انداز و تحریر سے سفرنامے کی صنف کو بامِ عروج تک پہنچایا ہے۔ ان کے سفرناموں پر افسانوں اور ناولوں کا گمان ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کے سفرناموں میں شوخی و شرارت بھی پایا جاتا ہے۔

۲۔مزاحیہ اسلوب:

سفرنامہ نگار اپنے سفرنامے میں صرف حادثات و واقعات اور خوبصورت مناظر کی منظر کشی ہی نہیں کرتا

بلکہ اپنی ذات کو بھی سمو کر کہانی کا تانا بانہ بنتا ہے۔ وہ سفرنامے کو دلچسپ اور موثر بنانے کے لیے بہت سے دوسرے حربے بھی استعمال کرتا ہے۔ بعض اوقات افسانوی رنگ ، شعری اسلوب اور مزاح کو شامل کر کے سفرنامے میں شگفتگی اور ہنسی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

سفرنامہ بظاہر ایک سنجیدہ صنف ہے۔ مگر بعض اوقات سفرنامہ نگار جب زندگی کو غیر متوازن، ناہموار اور اپنے ارد گرد بے اعتدالیوں، حماقتوں کو دیکھتا ہے تو وہ اپنی ذات کو شامل کر کے مزاحیہ انداز اختیار کرتا ہے۔اور یوں سفرنامہ مزاحیہ رنگ اختیار کرلیتا ہے۔ اس کے علاوہ جب ایک سیاح اپنی تہذیب و معاشرت کا دیگر ممالک کی تہذیب سے موازنہ کرتا ہے تو اس کو غیر سنجیدہ انداز میں پیش کر دیا جاتا ہے۔ بعض سفرنامہ نگاروں نے لطائف کا سہارا لے کر بھی شگفتگی پیدا کی ہے۔ اردو کے جن مزاح نگاروں نے سفرنامے میں مزاح کے روّیے کو برتا ہے۔ ان میں کرنل محمد خان کا بجنگ آمد، عطاء الحق قاسمی کا گوروں کے دیس میں اور شوق آوارگی ، کرنل شفیق الرحمان کا دجلہ ، اختر ممونکا کا پیرس ۲۰۵ کلومیٹر ، ابنِ انشاء کا چلتے ہو تو چین کو چلئیے اور ابنِ بطوطہ کے تعاقب میں پطرس بخاری کا سفر لندن وغیرہ مزاحیہ اسلوب کے حوالے سے خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ پطرس بخاری کے اسلوب کے حوالے سے ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کے الفاظ کچھ یوں ہیں:

> سفرِ انگلستان کے متعلق پطرس بخاری کے خطوط بنام امتیاز علی تاج اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر میں ہر ہر منظر پر پھلجھڑیا سی چھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ پطرس بخاری کے یہ خطوط سفرنامے کی روایت میں اس اعتبار سے ہمیشہ یادگار رہیں گے کہ اس کے بعد اردو سفرنامے میں مزاح کا عنصر لازم و ملزوم ہو کر رہ گیا۔[۲۳]

اردو ادب میں سفرنامے کی صنف کو مقبول بنانے میں جہاں دوسرے ادیبوں کا ہاتھ ہے وہاں مزاح نگاروں نے ان کی مقبولیت میں اضافہ کیا۔ ان سفرنامہ نگاروں نے سفرنامے کو ایک خاص مزاحیہ اسلوب عطا کیا ہے۔ ان کے سفرنامے اپنے اسلوب کی شگفتگی ، بیان کی بے ساختگی اور زبان کی شوخی کے اعتبار سے ایک شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے سفرناموں میں کارٹون کے علاوہ مزاح کے دیگر حربے ، تحریف، طنز، ظرافت، مقابلہ، موازنہ وغیرہ سے مزاح پیدا کیا ہے۔

۳۔بیانیہ اسلوب:

قدیم سفرناموں میں سیاح اپنے اردگرد پر سرسری نظر ڈال کر صرف مناظر کی تصویریں ہی پیش کرتے تھے۔ حالات و واقعات کو بیان کرتے ہوئے اپنے جذبات و احساسات کو پسِ پشت ڈال کر اور خوبصورت مناظر سے خود کو خارج کر کے سفرنامے کو شہروں، تاریخ، جغرافیے، معاشرت اور لوگوں کی بودوباش کا غیر جذباتی اور غیر تخلیقی بیان بنا دیتے تھے۔ ان کے سفرناموں میں معروف شہروں ، عمارتوں اور واقعات کا بیان زیادہ ہوتا اور باطنی احساسات اور محسوسات کا بیان ، جو کہ سفرنامے کے لیے بہت اہم سمجھا جاتا ہے، بہت کم عمل میں آتا تھا۔

اس عہد کے سفرناموں میں محض شہروں کی بنیادی معلومات اور سفر کی صعوبتوں سے آگاہ کیا جاتا تھا۔ تخلیقی تجربہ سے ان کا دورکا تعلق بھی معلوم نہیں ہوتا۔ ان سفرناموں کا اسلوب سادہ، سپاٹ، سنجیدہ اور معلوماتی گائیڈ بُک کا سا تھا۔ قدیم سفرنامہ نگار اپنی زیادہ توجہ معلوماتی کوائف جمع کرنے پر صرف کرتے تھے اور حقیقت ، حالات و واقعات پر ذاتی تاثرات کو غالب نہیں آنے دیتے تھے۔ ان کا اسلوب سادہ اور بیانیہ کا انداز معلوماتی اور تاریخی ہوتا تھا۔ وہ صرف سفری احوال کی سرگزشت کے بیان کو ہی ضروری سمجھتے تھے اور ان احوال کو بیان کرنے کا انداز خشک اور سپاٹ نثر کا سا ہوتا تھا۔

۴۔شعری اسلوب:

سیاح کے لیے نئی زمینیں، نئے مناظر، نئے لوگ اور نئی طرزِ بودوباش ہمیشہ سے پُرکشش اور پُر اسرار رہے ہیں۔ یہ سب اس کے لیے کسی عجائب سے کم نہیں، وہ انھیں دیکھ کر بچوں کی طرح مچلتا ہے، اور تمام کیفیات کو دل پر محسوس کر کے، اس میں دوسروں کو شامل کرنے کی خاطر تخلیقی عمل سے گزرتا ہے اور اپنے ذاتی تاثرات و مشاہدات کو ادبی اسلوب کے ساتھ سفرنامے کی صورت میں پیش کر دیتا ہے۔

دوسری اصناف کی طرح سفرنامے میں بھی طرزِ تحریر کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ وہی سفرنامہ کامیاب سمجھا جائے گا جس کاانداز تحریر سہل اور عام فہم ہو گا۔ ابتداء سے لے کر اب تک کے سفرنامے مختلف اسالیب میں تخلیق کیے گئے ہیں۔ جدید دور میں سفرنامے کو شعری اسلوب میں پیش کرنے

کا انداز بھی نمایاں ہو ہے۔ بہت سے شاعر سفرنامہ نگاروں نے سفرنامے میں غزل کی شعری روایت کو شامل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اپنے تاثرات کو شاعری کی معاونت سے پیش کیا ہے۔ بعض اوقات وہ بے ساختہ اور بے تکلف کیفیت میں اشعار اور مفرد مصرعے بھی لکھ جاتے ہیں اور اسی طرح کچھ سفرناموں میں تشبیہہ، استعارے اور رعایت لفظی کو بھی خوبصورتی سے استعمال کیا گیا ہے۔ جیسے بلدیو مرزا کا سفرنامہ ستروگا، بشری رحمن کا براِ راست، وحیدہ نسیم کا حدیثِ دل اور جمیل الدین عالی کے دنیا مرے آگے اور تماشا میرے آگے خوبصورت شعری اسلوب کا شاہکار ہیں۔ جمیل الدین عالی بنیادی طور پر ایک شاعر بھی ہیں۔ انھوں نے اپنے سفرناموں میں شعری اسلوب کا بہترین استعمال کیا ہے۔ اور سفرنامے کے نثری اسلوب کو شعری اسلوب کا جامہ پہنایا ہے۔ جمیل الدین عالی کے شعری اسلوب کی ایک مثال ملاحظہ کیجئے۔

آگے چلو میاں برلن دکھاؤ۔ مادام کی کوئی بات سناؤ، کوئی سنسنی خیز ،چٹپٹی بات یا کسی قحبہ خانے میں لے چلو یا کوئی غزل سناؤ۔ کیونکہ

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است
صراحئ مئے ناب و سفینہ غزل است[۲۴]

وحیدہ نسیم کے سفرنامہ حدیث دل کے اسلوب کے متعلق مرزا حامد بیگ لکھتے ہیں:

> خواتین کے ہی کیا، جملہ حجاز ناموں میں "حدیث دل" کی انفرادیت اس کا اسلوب ہے۔ شعری لحن نے اس میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔[۲۵]

۵۔انشائی اسلوب:

ان تمام اسلوب کے علاوہ چند ایک سفرنامہ نگاروں نے اپنی افتادِ طبع سے مجبور ہو کر سفرنامے میں دیگر اصناف کو استعمال کرنے کے شاندار تجربات کیے ہیں جیسے ڈاکٹروزیر آغا نے اپنے سفرنامے ایک طویل ملاقات کو انشائی مزاج میں تحریر کیا ہے۔ جو نہ صرف قاری کو سفرِ ہند کی روداد سناتا ہے۔ بلکہ

اس میں وزیر آغا کی ذات کے مخفی گوشے بھی آشکار ہوتے ہیں۔

سفرنامے کی اقسام

انسان نے حیات انسانی کی مختلف جہتوں، سمتوں اور مناظرِ فطرت سے آشنا ہونے کے لیے زمانہ قدیم سے ہی سفر کیا ہے اور سفر کی تفصیل اور سفر کے حادثات و واقعات کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ سفرنامہ ایک غیر افسانوی بیانیہ تحریر ہے جس میں سفرنامہ نگار اپنے محسوسات، تجربات، مشاہدات و واقعات تحریری صورت میں ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ سفرنامے میں سیاح کسی سفر، ملک اور اس کے باشندوں کی روداد کو بیان کرتے ہوئے نہ صرف اس علاقے کے متعلق اپنے نقطہ نظر کا اظہار کرتا ہے بلکہ اپنے تجربہ اور مشاہدات کے بل بوتے پر نتائج اخذ کرتے ہوئے اپنی سفری تحریر کو علمیت کی رنگا رنگی سے بھی ہمکنار کرتا ہے۔ سفرنامہ نگار کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی تحریر میں قاری کو وہ سب کچھ دکھا دے جس سے وہ خود گزرا ہے اور دیکھا ہے۔ اس طرح کا تمام انحصار سفر کرنے والے پر ہے کہ وہ کیا دیکھتا ہے اور کیا محسوس کرتا ہے اور پھر اپنے محسوسات و مشاہدات کو دوسروں تک کیسے پہنچاتا ہے۔ تجربے کو تخلیقی عمل کا حصہ بنانے کے لیے وہ کون سا رویہ یا انداز تحریر اختیار کرتا ہے۔ اس میں ایک طریقہ تو روایتی سفرنامے کا ہے جس میں سیاح کی نظر صرف سطحی ہوتی ہے اور وہ ملکوں کا حدود اربعہ، تاریخ اور لوگوں کی طرزِ معاشرت کو بیان کرنا ہی ضروری سمجھتے ہوئے وہ بنیادی معلومات فراہم کرتا ہے جو سفری گائیڈ کی ذیل میں آتی ہیں۔

دوسرا جدید روش کو اپناتے ہوئے اس معلومات میں اضافہ کچھ یوں کرتا ہے کہ وہ اپنی باطنی کیفیات اور محسوسات کو کہانی کی صورت میں تحریر کرتا ہے۔ قدیم اور جدید کے اس فرق کے بارے میں شفیع عقیل کہتے ہیں:

> قدیم اور جدید سفرناموں میں یہی فرق ہے کہ پہلے لکھنے والا اپنے تجربات و مشاہدات کو بنیاد بنا کر نئی نئی معلومات فراہم کرتا تھا لیکن اب جو سفرنامے لکھے جا رہے ہیں ان میں نئی نئی معلومات دینے کی

> بجائے مصنف اپنی مرضی اور پسند کے واقعات رقم کرتا ہے اور حقائق کو افسانے کی آمیزش سے پیش کرتا ہے۔[۲۶]

جدید سفرنامہ اپنے اندر متنوع کیفیات رکھتا ہے اور اس میں جمود کی بجائے حرکت کی کیفیت ملتی ہے۔ جدید سیاح اپنے شوقِ آوارگی میں ملکوں ملکوں اور قریے قریے گھومتا ہے اور وہاں سے معلومات اکٹھی کرنے کی بجائے اپنی ذات کی پہچان کے ساتھ ساتھ کائنات کے بھید بھی جاننے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ جن جگہوں سے گزرتا ہے ان کو اپنی روح میں اس طرح سموتا ہے کہ سفرنامہ نگار اور شہر الگ الگ نظر نہیں آتے جیسے محمود نظامی نے اپنے سفرنامے نظرنامہ میں لکھتے ہیں کہ میں بہت سے شہروں سے گذرتا ہوں مگر کچھ شہر ایسے ہیں جو میرے دل سے گذرے پھر سفرنامہ نگار اور شہردوئی کی بجائے اکائی بن جاتے ہیں۔ ابتدائی سطح پر ہم سفرنامے کو دو قسم قدیم اور جدید سفرنامے میں بانٹ سکتے ہیں۔ قدیم سفرنامہ نگاروں کی نظر اشیاء کی خارجی اور سطحی پہلوؤں پر رہتی ہے اور جدید سفرنامہ نگار اپنے باطن میں جھانکنے کے ساتھ ساتھ کائنات کے رازوں کو بھی فاش کرتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا سفرنامے کی اقسام کے بارے میں لکھتے ہیں:

> سفرنامے کئی طرح کے ہوتے ہیں مثلاً ایک قسم روایتی سفرنامے کی ہے جس میں سفر کرنے والا صرف ملک کا جغرافیہ بیان کرتا ہے۔ موسم کا حال، میدانی اور پہاڑی مناظر ، آدابِ معاشرت حاکم وقت کے خدوخال اور اگر وہ بیسوی صدی کا سفرنامہ نگار ہے تو غسل خانوں اور ہوٹلوں کا حال، مشروبات کی قلت یا فراوانی ہر قسم کے شعار کی جملہ تفاصیل اپنے سفرنامے میں سمیٹ لیتا ہے جس میں سفرنامہ نویس جغرافیہ کی بجائے صرف ملک کی تاریخ سے سروکار رکھتا ہے اور سُنے سنائے قصوں کے اظہار مکّرر میں لطف محسوس کرتا ہے۔[۲۷]

اس طرح سفرنامے کو صفات کے اعتبار سے دو حصوں قدیم اور جدید میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اول الذکر میں صرف خارجی معلومات ہوتی ہیں اور آخر الذکر میں ذاتی کیفیات اور احساسات کا اظہار۔ سفرنامے میں طریقِ اظہار کی بڑی اہمیت ہے۔ اگر کوئی صاحب طرزِ ادیب و شاعر

سفرنامہ لکھتا ہے تو وہ اپنے طرزِ بیان سے اس میں ایک ادبی شان پیدا کردیتا ہے۔ اس کے برعکس اگر سفرنامہ لکھنے والا اس خوبی سے عاری ہو تو پھر اس کے اندازِ تحریر میں وہ بات پید انہیں ہوتی۔ ہر سفرنامہ اپنے لکھنے والے کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ جیسا مصنف ویسا ہی اس کا سفرنامہ۔ یہ صنف اپنے اندر کافی وسعت رکھتی ہیں۔ اس میں ہیئت اور اسلوب کے تجربات کیے گئے اور یہ بہت سی اقسام میں لکھے گئے ہیں۔ اس کے متعلق ڈاکٹر مرزا حامد بیگ رقم طراز ہیں:

> سفرنامے کی دو قسمیں ہوں گی۔
> ۱۔ ادبی سفرنامہ
> ۲۔ محض سفری احوال
> اس دوسری قسم میں مزید تین اقسام کے سفرنامے دکھائی دیتے ہیں۔
> ۱۔ محض معلومات فراہم کرنے والے غیر تخلیقی انداز کے سفرنامے۔
> ۲۔ نجی یادداشتوں کے مماثل سفرنامے، جو آپ بیتی کا خام مواد بن سکتے ہیں۔
> ۳۔ اخبارات و ڈرائنگ روم رسالوں کا پیٹ بھرنے والے چلنتر قسم کے سفرنامے۔[۲۸]

ادبی سفرنامہ ایک تخلیقی بصیرت رکھنے والا ہی تخلیق کرسکتا ہے۔ مگر غیر ادبی سفرنامہ ایک سفری رپورٹ یا سفری روداد ہو گی۔ جیسے کوئی سفر کرنے والا سیاح لکھ سکتا ہے۔ بہت سے قدیم سفرنامے صرف معلومات فراہم کرنے کی غرض سے لکھے گئے ہیں جیسے مولانا شبلی نعمانی کا سفرنامہ روم و مصر و شام اور محمد حسین آزاد کا سفرنامہ ایران ہے۔ اس حوالے سے مولانا شبلی نعمانی اپنے سفرنامے میں لکھتے ہیں:

> سفرنامے میں جس قسم کی اطلاعیں لازمی اور ضروری ہیں یعنی ملک کی اجمالی حالت، انتظام کا طریقہ، عدالت کے اصول، تجارت کی کیفیات، عمارتوں کے نقشے، ان میں سے ایک چیز بھی سفرنامے میں نہیں البتہ معاشرت اور علمی حالت کے متعلق متعدد بہ واقعات ہیں۔ اگرچہ وہ بھی اس تفصیل کے ساتھ نہیں ہیں جس قدر ہونے چاہئیں۔[۲۹]

ہمارے ادب میں سفرنامے کی صنف عربی اور فارسی سے آتی ہے۔ قدیم دور کے سفرنامے انہی اصول وضوابط پر لکھے

گئے اور صرف سیاسی، تجارتی، تمدنی حالت کے ساتھ ساتھ تاریخی عمارتوں کے نقشے جات اور ملکوں کی صورت حال کے بارے میں بیان کرنا ہی ضروری سمجھا جاتا تھا۔ اس نقطے نظر سے سفرنامے کی بنیادی دو ہی اقسام قرار پائی ہیں مگر اس ذیل میں ڈاکٹر قدسیہ قریشی انیسویں صدی کے حوالے سے سفرناموں کو چار سمتوں میں کچھ یوں تقسیم کرتی ہیں۔

۱۔ یورپ کے سفرنامے
۲۔ مذہبی سفرنامے
۳۔ مشرقی سفرنامے
۴۔ مقامی سفرنامے

> انیسویں صدی کے سفرناموں کو چارحصوں میں تقسیم کیا گیا تھا تاکہ مختلف سفرناموں کی تحریر کے اسباب اور ان کی اہمیت کو اچھی طرح واضح کیا جا سکے۔ اس تقسیم کے علاوہ سفرناموں کو ادوار یا تاریخی ترتیب کے لحاظ سے بھی تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس میں یہ دشواری تھی کہ مختلف مقامات کے سفر سے متعلق متعدد سفرناموں کے بیان اور مباحث میں غیر ضروری تکرار اس حد تک بڑھ جاتی جو کہ ناگوار ہو سکتی تھی۔ اس لیے موضوع کے اعتبار سے ان کی تقسیم کو فوقیت دی گئی ہے۔ [۳۰]

سفرنامہ اپنے اندر متنوع کیفیات اور وسعت رکھتا ہے۔ اس میں حرکت و عمل کا پہلو ہونے کے ساتھ ساتھ علاقائی جزیات کو بھی سمویا جاتا ہے۔ معلومات کی فراہمی کے ساتھ اگر یہ باطنی کیفیات کا بھی ترجمان ہے تو ایسا سفرنامہ ادبی کہلائے گا۔ شروع شروع میں سفرنامہ محض تاریخی اور جغرافیائی معلومات فراہم کرنے والا ایک کتابچے کی حیثیت رکھتا تھا لیکن رفتہ رفتہ یہ اپنی ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے اور باقاعدہ و مقبول صنف کی صورت اختیار کر لی ہے اور اب سفرنامے کا میدان بہت وسیع ہے اور اس میں کئی موضوعات اور جہتوں میں بڑے عمدہ سفرنامے تخلیق کیے گئے ہیں۔ موضوعات کے حوالے سے بھی اس کی درجہ بندی کی جا سکتی ہے جیسا کہ

۱۔ سیاسی
۲۔ مذہبی
۳۔ تاریخی

۴۔ جغرافیائی

۵۔ تحقیقی نوعیت کے سفرنامے

سفرنامے کی اقسام کے بارے میں محمد برکت علی اپنے مضمون سفرنامہ ادب کا ایک حصہ میں لکھتے ہیں کہ

> اردو ادب میں جو سفرنامے آزادی کے بعد لکھے گئے ہیں انہیں بآسانی تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔
>
> اول: روایتی سفرنامے جن میں سفرنامہ نگار جغرافیہ اور تاریخ کے کوائف جمع کرتا ہے۔ موسموں کا حال اور مناظر کی کیفیت پیش کرتا ہے۔ سیاست اور بازار کے اتار چڑھاؤ کا گوشوارہ بناتا ہے اور یوں قاری کو ایک ایسی رہنما کتاب مہیا کر دیتا ہے جسے ہاتھ میں لے کر وہ آسانی سے بھاٹی گیٹ سے ایفل ٹاور تک سفر کرسکتا ہے۔
>
> دوم: محسوساتی سفرنامے جن میں سفرنامہ نگار نہ صرف آنکھیں کھلی رکھتا ہے بلکہ داخل کی تیسری آنکھ کو دیکھنے کی دعوت بھی دیتا ہے اور یوں معروضی حقیقت کے ساتھ موضوعی حقیقت کو بھی آشکار کرتا ہے۔
>
> سوم: اول الذکر دو اقسام کے سفرنامہ نگار حقیقت کو سیدھی آنکھ سے دیکھتے ہیں اور سچائی سے پیش کر دیتے ہیں۔
>
> مزاح نگار منظر کو قدرے ٹیڑھی آنکھ سے دیکھتا ہے اور دانستہ طور پر اس کا مضحکہ خیز پہلو ابھارتا ہے۔ اس قسم کے سفرنامے زیادہ تر کالم نگاروں نے لکھے ہیں۔[۳۱]

سفرنامے بہت سی اقسام میں لکھا جاتا رہا ہے۔ ہر سفرنامہ نگار نے اپنی افتاد طبع کے مطابق اس میں رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کو معلوماتی بنانے کے علاوہ اپنے جذبات کی رو میں بہہ جانے کے مناظر کو بھی قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ رحمن مذنب سفرنامے کی اقسام کے بارے میں لکھتے ہیں:

> سفرناموں کی کئی اقسام ہیں۔ ہر سفرنامہ اپنے لکھنے والے کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے جیسا مصنف ویسا سفرنامہ۔ ایک سفرنامہ ایسا بھی ہے جو سب سے الگ ہے۔ اس میں سفر کی نوعیت اور غایت بھی سب سے مختلف ہوتی ہے۔ اسے حج نامہ کہتے ہیں۔[۳۲]

ب۔سفر ناموں کی اہمیت:

۱۔ادبی اہمیت:

سفر نامہ میں مشاہدہ کی ضرورت زیادہ پائی جاتی ہے۔ جس شخص کا مشاہدہ جتنا وسیع ہو گا وہ اتنا ہی عظیم ادب تخلیق کرے گا۔سفرنامہ نگار جن کیفیات سے خود دو چار ہوتا ہے۔اور نظریں جن مناظر کواپنے اندر جذب کرتی ہیں۔ ان تمام حالات و واقعات میں شریک کرتا ہے۔ سفرنامے اپنے اندر لطف و حسن کے علاوہ دلچسپ معلومات، حادثات و واقعات ، ضروری اور غیر ضروری تفصیلات کی کافی گنجائش رکھتے ہیں۔ ان کے ذریعے ہمیں ملکوں ،قوموں ، انسانوں کا رہن سہن، جغرافیائی اور تاریخی حالات و واقعات سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔

سفر نامے کو اردو ادب میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ دوسری اصناف کی مانند اس میں بھی تخلیقی تجربات کی کارفرمائی پائی جاتی ہے۔ قدیم سفرنامے صرف خارج کا بیانیہ ہوتے تھے مگر اب سفرنامے ایک تخلیقی ادب میں شمار ہوتا ہے۔ سفر نامہ دنیا کے ہر ادب کی ایک مستقل صنف ہونے کے ناطے سے کچھ بنیادی تقاضے رکھتا ہے جو اسے دوسرے اصناف سے الگ کرتا ہے۔ پہلی یہ کہ جو کچھ بیان کیا گیا ہو سیاح اس سے خود بھی گزرا ہو اور جب وہ بیان کرے تو اس سے وہی لطف حاصل ہو جو کسی ادب پارے کی نثرکے مطالعے سے ہوتا ہے ۔

سفرنامے میں احساسات و جذبات کی ترجما نی کے ساتھ ساتھ خارجی واقعات اور معاشرتی حالات کی تصویر کشی بھی پائی جاتی ہے۔ ان تمام لوازمات نے سفرنامے میں ایک ادبی ستان پیدا کردی ہے اور یہ اہم ترین نہیں صرف اہم ادب کی ایک اہم صنف ماناجاتا ہے۔ سفر ناموں میں سفرنامہ نگار جہاں اپنی روداد سفر کو بیان کرتا ہے، وہاں اس ملک کے لوگوں کی تہذیب و معاشرت ، رہن سہن ، جغرافیائی حالات اور علم و ادب کے بارے میں بھی معلومات فراہم کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ کسی ملک کی ادبی تحریکوں ، وہاں کے ادبی مباحثوں اور مشاعروں کے بارے میں بھی تفصیل مہیا کرتا ہے۔

رئیس احمد جعضری سفرنامے کی ادبی اہمیت یوں بیان کرتے ہیں:

> سفرنامہ علمی و ادبی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ واحد ادب ہے جس کا تقریباًتمام اہم معاشرتی علوم سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ مورخوں، سوانح نگاروں اور جغرافیہ دانوں نے اس صنف سے بہت فائدہ اٹھایا ہے اور اسی وجہ سے دنیا کی تمام بڑی چھوٹی زبانوں کے ادبیات میں سفر ناموں کو ایک بہت اہم مقام حاصل ہے۔[۳۳]

اس طرح ا س بات سے قطعی انکار ممکن نہیں ہے کہ ملکوں کے سیاسی اتار چڑھاؤ اور انقلاب کا اثر وہاں کے سماجی ، اقتصادی ، ثقافتی، معاشرے اور ادب پر بھی پڑتا ہے اور یہ تمام تبدیلیاں اور تاریخی واقعات کا احوال سفرناموں میں پایا جاتا ہے۔ اس حوالے سے سفرناموں کی نہ صرف تاریخی اور سماجی اہمیت ہے بلکہ ادبی اور معاشرتی اہمیت بھی مسلم ہے ۔ مولانا شبلی نعمانی کا سفر نامہ روم ومصر و شام اور محمد حسین آزاد کا سیرایران کی ادبی اہمیت کے بارے میں ڈاکٹر قدسیہ قریشی لکھتی ہیں:

> ان کے سفر نامے کی اہمیت صرف سفر نامے کی حیثیت سے جو کچھ ہے وہ ہے ہی لیکن اس سے بھی زیادہ اس سفر نامے کی ادبی اہمیت ہے کیونکہ مولانا نے اپنے سفرنامے میں سفری حالات و واقعات کے علاوہ وہاں کی ادبی تحریکوں کا بڑا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ ان کے سفر نامے کی علمی اور ادبی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ۔[۳۴]

ناول اور افسانے کے بعد سفر نامہ اب مقبول ترین صنف ادب بن چکا ہے۔ دیگر اصناف کی طرح سفر نامہ نگاری بھی ایک فن ہے جسے کمال کی بلندیوں تک پہنچانے کے لیے زبان و بیان کی خوبیوں کا ہونا بھی اشد ضروری ہے۔ دلچسپ اندازوبیان سفر نامے کو ادبی حسن بخشتا ہے۔ بقول رفیع الدین ہاشمی:

> سفرنامے کی عمدگی اور خوبصورتی دو باتوں پر منحصر ہوتی ہے۔ ایک واقعات سفرکی نُدرت و جدت اور دوسرے انداز و بیان میں تازگی ، دلچسپی اور مقبولیت کے لحاظ سے ایک معیاری سفر نامہ ناول اور افسانے سے کسی بھی طرح کم نہیں ۔ دور جدید میں

> اردو اصنافِ نثر میں سفر نامہ ایک امتیازی اور منفرد صنف کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ [۳۵]

سفر ناموں سے کسی خطے کے لوگوں کی سماجی، اخلاقی ، مذہبی، زندگی کے ساتھ ساتھ وہاں کے علمی ادبی رجحان کا بھی پتہ چلتا ہے۔سفر نامے کی ادبی اہمیت کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید یوں رقم طراز ہیں:

> سفرناموں میں شخصیتوں کی تصویریں ہی نہیں ابھرتیں بلکہ علمی وادبی مجالس کا حال و احوال اور مختلف علاقوں کی ادبی صورتحال بھی نظر آتی ہے ۔ یوں ان کا سفر نامہ،"احباب نامہ"، " محبت نامہ" اور " عقیدت نامہ" ہونے کے ساتھ ادب نامہ بن جاتا ہے۔ [۳۶]

۲۔سماجی اہمیت:

سفر ناموں کی سب سے بڑی سماجی اہمیت یہ ہے کہ معاشرے کے بارے میں جو چیزیں اور واقعات بڑی بڑی کتابوں میں نہیں ، مختلف سفرناموں میں ان کے بارے میں تفصیلات مل جاتی ہیں۔ سفر نامہ اپنے عہد کی خاص رسم و رواج ، تہذیب و معاشرت ، شادی بیاہ کی رسومات، آداب و اخلاق، نشست و برخاست ، سب کے بارے میں اپنے پورے سیاق و سباق کے ساتھ پیش کر دیتا ہے۔ وہ جس واقعے کو جس انداز سے دیکھتا اور محسوس کرتا ہے ، پیش کر دیتا ہے۔ اس طرح سفرنامہ سیاسی و سماجی ، تہذیبی و تمدنی حالات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ پروفیسر تنویر حسین سفر نامے کے بارے میں لکھتے ہیں:

> سفر نامہ نگار اپنے ملک کی سیر و سیاحت کرے یا بیرون ملک کاروبار، سیاحت اور تعلیم کے لیے جائےتو اپنے دوران سفر پیش آنے والے حالات و اقعات کو اس ملک یا خطے کے جغرافیائی ، تاریخی ، سماجی،تہذیبی، اور ثقافتی پس منظر میں پیش کرے۔ [۳۷]

تنویر حسین کے اس اقتباس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سفرنامے کے لیے ضروری اصول کون سے ہونے چاہئیں۔ ان کے مطابق سفرنامے میں ملکوں کی اقتصادی ، تاریخی ، جغرافیائی حدود کے متعلق اور سماجی و تہذیبی حالت کے بارے میں بھی مفصل بیان ہونا چاہیے۔ اس طرح تمام قدیم سفر نامے زیادہ تر اسی طرز پر لکھے گئے ہیں ۔عجائبات فرنگ میں

یورپ کی تہذیب و معاشرت کے متعلق یوسف کمبل پوش نے بڑی و ضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اسی طرح سفرناموں کی سماجی اہمیت کے لحاظ سے ابن بطوطہ کا سفر نامہ بڑی اہمیت کا حامل ہے ۔ وہ چودھویں صدی عیسوی میں ہندوستان آیا اور اس نے اپنے سفر نامے میں ہندوستان کی تہذیبی اور معاشرتی حالات کی بڑی عمدہ تصوریر کشی کی ہے۔ مولوی عبیدالرحمان خان ، ابن بطوطہ کے سفر نامہ کی سماجی اہمیت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> وہ مختلف علوم و فنون میں دستگاہ رکھنے کے ساتھ ساتھ نگاہ دور بین رکھتا تھا۔ اس لیے وہ جہاں بھی کہیں گیا، وہاں کے سیاسی، سماجی، علمی اور ادبی حالات کا مطالعہ بڑی دقیقہ رسی کے ساتھ کیا۔ وہ کہیں بادشاہوں کے دربار میں اعزاز و اکرام کی بڑی کرسی پر نظر آتا ہے تو کبھی بڑی صوفیائے کرام کی مجلس و جدوحال میں شریک دیکھا جاتا ہے۔ اس بناء پر اس کا سفر نامہ جہاں بے حد دلچسپ اور دل آویز ہے وہاں پر نایاب اور بیش قیمت معلومات کا گنجینہ بھی ہے۔ ان میں بھی بہت سے معلومات ایسی ہیں جو کسی دوسرے ذریعے سے حاصل نہیں ہو سکتی۔
> ۳۸

اس طرح دوسرے بہت سے چینی، فرانسیسی عرب سیاح ہندوستان میں آئے اور انھوں نے اپنے سفر ناموں میں یہاں کے تاریخی ، تمدنی، جغرافیائی ، معاشرتی اور تہذیب کے بارے میں بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ابتداء سے ہی ہندوستان اپنے مخصوص تہذیب وتمدن کے سبب غیرملکی سیاحوں کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ ڈاکٹر قدسیہ قریشی فرانسیسی سیاح ڈاکٹر ’’ برنئیر‘‘ کے سفر نامہ کی اہمیت کے ضمن میں کہتی ہیں:

> ڈاکڑ برنیر فرانسیسی سیاح ۱۶۵۵ء میں اورنگزیب کے عہد میں ہندوستان آیا ۔ برنیر نے شاہجہان ، دارا اور او رنگزیب کے حالات لکھنے میں اپنا زورقلم خوب صرف کیا۔وہ فلسفہ کا عالم تھا، اس نے ہمارے ملک کے حالات کا جائزہ لیا اور اپنے سفر نامہ میں تمام حالات کا تفصیلی ذکر کیا ہے، مغل عہد کی داستان بیان کی ہے۔ مذہبی ، تہذیبی، تمدنی، معاشرتی ، علمی ، فنی، غرض ہر پہلو کو بڑی وضاحت سے قلمبند کیا، کچھ اندرونی حالات، شہزادوں کا معاشقہ

> اور انکی رنگ رَلیاں، رؤوسااور امراء اور عمائدین شہر کی رنگ رلیاں بھی بیان کی گئی ہیں۔ ملک کی تجارت اور پیداوار کا بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔[۳۹]

سفر نامے کسی بھی ملک کے سماج کی اہم دستاویز ہوتے ہیں۔ ان کے ذریعے ایسی معلومات ملتی ہیں جو کسی اور کتب میں اتنی تفصیل کے ساتھ ہی نہیں ملتی ۔ معاشرے میں موجود ایک چیز کی عکاسی میں سفر نامے کا کوئی ثانی نہیں جیسا کہ مغلوں کے عہد کی شان و شوکت ، ان کا اپنی رعایا کے ساتھ برتاؤ اور اس عہد کی رسومات حتی کہ لوگوں کی ترجیحات اور پسند نا پسند کے بارے میں جاننے کے لیے اس عہد کے سفر ناموں کا مطالعہ بڑا ناگزیر ہے۔

قدیم سفر ناموں میں موجود معلومات کسی لگی لپٹی اور مبالغے سے مبرا ہوتی ہیں اور جس طرح سفرنامہ ، تاریخ، جغرافیہ، سماجیات، ادب ، صنعت و حرفت ، سیاست ، معاشیات، مذہب وغیرہ سب کا احاطہ بڑی دل آویز زبان وبیان کے ساتھ کرتاہے۔ اسی طرح ہر شعبۂ زندگی کے بارٔ میں معلومات کسی ایک کتاب میں ملنا ممکن نہیں ہوتی ۔ سفر نامے میں کسی خطے یا ملک کی تہذیب و معاشرت کی ایسی جاندار عکاسی کی گئی ہوتی ہے۔ کہ جسے پڑھ کر وہاں کے لوگوں کے رہن سہن، رسم و رواج اور ان کی طرزِ زندگی سے آشنا ہوتے ہیں مگر ان تمام کو بیان کرنے کے لیے سفر نامہ نگار کے پاس مشاہدے کی گہرائی اور گہرائی کا ہونا بہت ضروری ہے۔ وہ جتنا باریک بین ہوگا اتنا ہی گردوپیش کی منظر کشی کرنے پر قادر ہوگا اور اس کے پاس حسن و قبیح کو پرکھنے کی آنکھ ہو کہ جس تجربات و مشاہدات سے وہ خود گزرا ہے، قاری کو بھی اس میں شامل کرے۔سفر نامے کی سماجی اہمیت کے متعلق آغا محمد طاہر سیر ایران کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> سفر ناموں میں انسانی زندگی کے ان گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جو تاریخ ، ادب اور جغرافیہ کی دوسری کتابوں میں تاریک چھوڑ دئیے گئے ہیں جیسے معاشرتی طور طریق، روائجو عقائد، مذہبی تعلقات، تجارتی و صنعتی خصوصیات ، فرقے، زبانیں، شکل و صورت سفر ناموں کی ایسی خصوصیات ہیں جس نے

> اسی کو جغرافیہ کی دوسری کتابوں سے منفرد کر دیا ہے۔[40]

سفرنامے معلومات کا بہت بڑا ذخیرہ فراہم کرتے ہیں۔ ان کے ذریعے لوگوں کا معیارِ زندگی ، عادات، عمارتوں کی بناوٹ، مذہبی تہواروں کا ذکر، کسی ایک علاقہ یا ملک کی سماجی زندگی کا نقشہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ یوسف کمبل پوش اپنے سفر نامے میں مصر کی سماجی زندگی اس طرح پیش کرتے ہیں۔

> انتیسویں تاریخ فروری۱۸۳۸ء کے بموجب رسم اس ملک کے ہم گدھے پر سوار ہوئے اور عنایت پر نکل صاحب سے ایک چوب دار بادشاہی راہ بتانے کے لیے ساتھ لے کر بازار کا تماشا دیکھنے چلے۔ ہر ایک دوکان اورتنگی راہ وہاں کی اور خرید و فروخت اشیاء کی مثل بنارس کے تھی، مگر ساخت بازار میں البتہ صورت دوسری یعنی یہاں درمیان دوکانوں کے چھپّر گھاس پھوس کا ڈالا ہے،بہ سبب اس کے مینھ اور غبار سے صحن بازار کا بچتا ہے۔دوکانیں حلوائیوں اور باورچیوں کی مانند، دوکانوں ہندوستان کے آباد نان بائیوں کی دوکان پر ترک و عرب روٹی کھا رہے تھے۔ دل شاد، چھوارا، بیچنے والے دوکانوں پر بیٹھے چھوارے بیچتے تھے، مکھیوں کے ان پاس ہجوم تھا۔[41]

۳۔ تمدنی اہمیت:

سفر ناموں کی تہذیبی اور تمدنی اہمیت بھی مسلم ہے۔ سفر ناموں سے بہت سے ایسے حالات و واقعات ، رسم رواج، آداب و اخلاق لوگوں کا آپس کا میل ملاپ ، رکھ رکھاؤ، لوگوں کا سیاسی اور سماجی نقطہ نظر کا علم ہوتا ہے۔ جو عام کتابوں میں نہیں ملتے۔ ان تمام کو سفر نامہ نگار اپنے نقطۂ نظر سے پیش کرتاً

تمدن کسی خطے یا ملک میں انسانوں کے مل جل کر رہنے کےطریقے ، طرز معاشرت اور کسی نظام کے تحت زندگی گزارنے کا نام ہے۔ انسائیکلوپیڈیا میں تمدن موروثی فنی کارناموں ، تکنیکی طریقوں ، تصورات، عادات، اور قدروں پر مشتمل ہے۔

سفرناموں میں سیاح نگری نگری گھوم کر اپنے تجربات و مشاہدات کو بیان کرنے ساتھ ساتھ لوگوں کی زندگی کے ہر

ایک زاویے کو بغور مشاہدے اور تجزیے کے بعد بیان کرتا ہے۔ وہ چھوٹے سے چھوٹے واقعے اور طرزِ معاشرت کو سفرنامے میں لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس طرح سے قاری سیاح کے تجربات میں شامل ہوکر اور اس خطے کے لوگوں کے رہن سہن سے آشنا ہوکرلطف محسوس کرتاہے۔ ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں کہ:

> سفر نامہ محض سیاح کے ذوقِ سفر کو ہی آسودہ نہیں کرتا بلکہ یہ رنگ، نسل ، زبان، اور عقیدے کے اختلاف کے باوجودایک ملک کو دوسرے ملک سے اور ایک انسان کو دوسرے انسان سے متعارف کرانے اور ان کے درمیان پل تعمیر کرنے کاو سیلہ بھی ہے اور اس سے کسی ملک کی جغرافیائی ، تاریخی، تہذیبی اور تمدنی معلومات بھی حاصل ہو سکتی ہیں۔ [۴۲]

سفر نامے کے ذریعے کسی ملک یا شہر کے بارے میں حتیٰ کہ وہاں کی زبان و ادب ، مذہبی رجحان ، تہذیب، و معاشرت، وہاں کا تمدن،لوگوں کے عقائد وغیرہ کے بارے میں حالات کا علم ہوتاہے۔ سفرنامہ نگاروں نے اپنی طبع کے مطابق مختلف زاویوں سے حالات کا جائزہ لیا اور کسی نے تاریخی پہلو اور کسی کے ملک کے جغرافیہ کو اور کسی نے عمارتوں ، بازاروں، سڑکوں کو اور کسی نے تہذیب و معاشرت کوبیان کرنے کو اہمیت دی اس طرح سفرنامہ معلومات کی فراہمی کا عمدہ وسیلہ ہے۔ ڈاکٹر قدسیہ قریشی سفرنامے کی تمدنی اہمیت یوں بیان کرتی ہیں:

> ہر زبان کے ادب میں سفرناموں یا سیاحت ناموں کی ایک خاص اہمیت رہی ہے۔ یہ وہ صنف ادب ہے کہ جو معلومات بھی بہم پہنچائی ہے۔ بصیرت بھی دیتی ہے اور پڑھنے والے کو تخلیقی ادب کا لطف بھی اور انبساط بھی فراہم کرتی ہے۔ اس کے ذریعے قاری دنیا کی دوسرے قوموں کے تہذیبی ، جغرافیائی اور تمدنی حالات کی آگاہی حاصل کرکے انسانی فطرت کی وسعتوں سے آشنا ہوتاہے۔ [۴۳]

سفر نامے کے ذریعے قاری گھر بیٹھے دوسری قوموں اور دوسرے خطوں کی سیر سے محظوظ ہوتا ہے۔ وہ سیاح کے ساتھ ساتھ ان نظاروں اور سڑکوں پر گھومتا ہے جو حقیقت میں اس کی دسترس سے دور ہیں۔ سفرنامہ نگار دو طرح سے قاری پر احسان کرتا ہے۔ ایک تو اس طرح کہ وہ اپنی

انگلی پکڑا کر قاری کو ان پہاڑوں ، آبشاروں اور بازاروں میں گھوماتا ہے یہاں وہ خود سیاحت کے مزے لیتا رہا ہے اور دوسرا وہ اُس لطف و سرور میں شامل کرتا ہے جس سے وہ خود دو چار ہواتھا۔

سفر ناموں کے ذریعے زندگی کے تمام شعبوں کے بارے میں معلومات ملتی ہے کیونکہ سیاح اپنا بہت سا وقت لوگوں کے درمیان گھومتا پھرتا ہے اور وہ نظام حکومت کا جائزہ لیتا ہے۔ حکمران وقت کا اپنی رعایا کے ساتھ سلوک، دینی نظریات، علماء اوربزرگانِ دین کی تعلیمات کا پر چار بھی کرتا ہے۔ سفر نامے میں بہت سے واقعات ایسے ملتے ہیں جن سے وہاں کی تہذیب و تمدن کا پتہ چلتا ہے نو اب لیاقت جنگ بہادر کا سفر نامہ یورپ و امریکہ سے اقتباس ملا حظہ ہو:

> مجھے امریکن لوگ طبیعت سے خشک معلوم ہوتے ہیں۔میرا خیال ہے کہ دولت کی وجہ سے ان میں رعونت آگئی ہے اور ہر وقت دولت پیدا کرنے اور کاروبار کو آگے بڑھانے کی فکر میں رہتے ہیں اس لیے مروت کا فقدان ضروری ہے۔ ہےسفید فام عورتیں جہاں کتوں سے انتہائی محبت رکھتی ہیں۔ انکے مردحبشیوں سے کتوں سے بھی بدتر برتاؤ کرتے ہیں۔
> ۴۴

سفرنامے کسی معاشرے کی بودوباش لوگوں کے رہن سہن اور ان کی روایات و عقائد کو جاننے میں بڑی مدد فراہم کرتے ہیں۔

۴۔علمی اہمیت:

علم حاصل کرو خواہ تمھیں چین ہی کیوں نہ جانا پڑے۔ علم کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ انسان مہد سے لحد تک جاننے کے عمل سے گزرتا رہتا ہے۔ سفر نامے بھی ایسی صنف ہے کہ جاننے کی جستجو سیاح کو ملکوں ملکوں ، قریے قریے گھومنے پر مجبور کیے رکھتی ہے اور سیاح اپنی اسی عادت کی وجہ سے کبھی ایک جگہ ٹھہر نہیں پاتا۔ وہ اپنی دوربین نگاہوں سے کائنات کا مشاہدہ کرکے اپنے واقعات اور جذبات میں دوسروں کو شریک کرتا ہے۔ وہ جہاں جہاں سے گزرتا ہے اس کو اپنے دل پر نقش کر لیتا ہے اور دوسرے ملکوں اور دوسرے لوگوں کی ایک ایک بات کو دوسرے لوگوں تک پہنچانے کوفریضہ سمجھ کر اچھی بری باتوں کو بیان کر

دیتا ہے۔ اس کے اس عمل سے حالاتِ حاضرہ اور واقعات پر روشنی پڑتی ہے۔ جس سے ان جگہوں اور حالات و واقعات سے دوسرے لوگ بھی واقف ہو جاتے ہیں اور اس سے انکے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر قدسیہ قریشی مذہبی سفر ناموں کی علمی اہمیت بیان کرتی ہیں:

> مذہبی سفر ناموں کی تعلیمی اہمیت بھی ہے۔ ان سے ایک طرف مذہبی تعلیمات حاصل ہوتی ہیں اور دوسری طرف متعلقہ ممالک کی زندگی سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ کیوں کہ جو بھی حج کرکے آتا ہے۔ وہ یہ سوچتا ہے کہ میں اپنے خیالات اپنے تجربات دوسروں تک پہنچاؤں، چونکہ یہ سفر نا مہ مذہب سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے ان میں سب سے پہلے مذہب کے بارے میں لکھا جاتا ہے۔حج اور اس کی ضرورت اور اہمیت پر زور دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ حج، عمرہ، اور تمام ارکان حج کی تفصیلات ان سفر ناموں میں مل جاتی ہے۔ بعض سفر ناموں میں دعائیں بھی لکھی ہوئی ہیں۔مذہبی سفرنامے دنیاوی اور دینی دونوں لحاظ سے مفید اور اہم ہیں۔ [۴۵]

سفر نامہ داستانی ادب کی پیداوار ہے۔ داستان کا ہیرو سالوں کسی نہ کسی مہم پر محو سفر رہتا تھا اور راستے میں پیش آنے والی ہزا رہامشکلات اور حادثات سے نبرد آزما رہنے کے بعد اپنی منزل کو پاتا تھا اور پھر ہنسی خوشی وطن لوٹ آتا تھا۔ ایک طرح سے داستان بھی سفر نامہ ہی ہے۔ مگر دونوں فنی لوازمات مختلف ہیں۔ دونوں کے اصول یکسر الگ الگ ہیں۔ اصول خواہ کچھ بھی ہوں ، دونوں میں سفرکی روداد بیان کی جاتی ہے۔ سیاح یا مسافر سفر سے واپسی کے بعد زبانی یا تحریری طور پر اپنے تجربات اور مشاہدات میں دوسروں کو شامل کرنے کی غرض سے سفری رودادبیان کرتا ہے۔ تاکہ دوسرے لوگ بھی دیس پردیس کے شہروں ، ادیبوں ، عالموں ، کتابوں ، مجلسوں، تعلیمی اداروں اور علمی وادبی مباحثوں سے واقف ہوں ۔ سفر نامہ نگار اپنی مباحث بھی بیان کرتا ہے جسے پڑھ کر قاری کے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔اور وہ ان دیکھے دیسوں کی سیر اور بہت سے لوگوں سے سفر نامے کے ذریعے ملاقات کرکے خوشی محسوس کرتا ہے۔ سفر نامہ نگار جب کسی ملک کی سیاحت پر ہوتا ہے تو وہ صرف مناظر ِقدرت کا ہی مشاہدہ نہیں کرتا بلکہ وہاں کی علمی،

ادبی،فنی اور صنفی اداروں کے بارے میں بھی معلومات جمع کرتا ہے۔ اس طرح سفرنامہ صرف مخص حالات سفری ہی پیش نہیں کرتا بلکہ معلوماتی اور علمی صحیفہ بھی ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اسلم فرخی لکھتے ہیں:

> قدیم سیاح بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے دور دیس کے کوچہ و بازار کی رونق عجائب و غرائب ، جغرافیائی اور تاریخی نو ادر اور معاشی کیفیات کی تفصیل قلم بند کرتے تھے۔ پڑھنے والے ان کی تفصیلی بیان سے گھر بیٹھے جغرافیے اور تاریخ دونوں سے بھرپور استفادہ کر لیتے تھے۔لیکن اب یہ ساری تفصیل عام ہوگئی ہے۔اور سیاح کا کام صرف یہ رہ گیا ہے کہ مخصوص ماحول اور حالات میں اپنے ذاتی اور انفرادی ردعمل کی وہ جھلک پیش کر دے جس سے قاری کی ذہنی وسعت اور انسان شناسی میں اضافہ ہو۔ [۴۶]

قدیم سفر نامے زیادہ تر اصلاحی مقصد کے تحت لکھے گئے۔ تب ذرائع آمدورفت محدودتھے اور دور دراز کی خبروں تک رسائی ناممکن تھی۔ ان حالات میں کوئی بیرونی ملک یا دوسرے علاقے کا سفر کرکے بھی آتا تو لوگ اس کی معلومات سے استفادہ کرتے۔ ڈاکٹر انورسدید سفرنامے کی علمی اہمیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> مسافر نے اس سفر کے دوران جو مشاہدات جمع کیے اور تجربات سمیٹے ہیں ان میں دوسرے لوگ بھی شریک کر سکیں۔قدیم سفرنامے میں اس قسم کا استفادہ عام کارِخیر سمجھ کر بھی انجام دیا جاتا تھا اور سفر نامے اس مقصد کے تحت بھی لکھے جاتے تھے کہ آئندہ ان راہوں پر سفرکرنے والوں کو مناسب راہنمائی فراہم کر سکیں۔سرسید احمد خان، شبلی نعمانی، محمد حسین آزاد اور متعدد دوسرے قدیم سفر نامہ نگار وں نے اس ذوقِ تحسین کی تسکین اور اس میں قومی منفعت کا زاویہ بھی شامل کیا اور علمی، تہذیبی اور تمدنی معلومات کے علاوہ جغرافیائی کوائف ، تاریخی واقعات ،بودوماند کی معلومات کا بیش بہا خزانہ بھی پیش کردیا۔ [۴۷]

سفر نامے قاری کو لطف اندوز کرنے کے علاوہ علم و دانش کی بیش بہا دولت بھی فراہم کرتے ہیں۔ سیاح جس جگہ قدم رکھتا ہے وہاں کے جذبات کو سمیٹتا چلا جاتا ہے اور وہ زیادہ سے زیادہ معلومات اکٹھی کرنے کی کوشش کرتا

ہے تا کہ وہ جو کچھ اس نے دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ اس میں دوسروں کو بھی شریک کرے ۔ وہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت لوگوں میں گزراتا ہے۔ ایک سچے سیاح کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ ان دیکھے راستوں پر گھومنے میں لطف وتسکین محسوس کرتا ہے۔ جب کہ مسافر کی نظریں اپنی منزل کی جانب لگی ہوتی ہیں اور وہ صرف راستے میں آنے والی جزیات کو سمیٹنے پر ہی اکتفا کرتا ہے۔

یہ وہ سفرنامے ہیں جن میں مصنف کی توجہ کا مرکز علم اور اس کے متعلق معلومات ہوتی ہے۔ ان سفرناموں میں ایسی معلومات فراہم کی جاتی ہے جو دوسروں کے لیے رہنمائی کا باعث بنے۔ سر سید احمد خان کا سفرنامہ مسافران لندن(۱۹۶۱ء)، محمد حسین آزاد کا سیر ایران (۱۸۸۶ء) اور شبلی نعمانی کا سفر نامہ مصر روم شام (۱۸۸۱ء) ایک خاص قومی مقاصد کے تحت لکھے گئے یہ سب سیرکی غرض سے بیرون ملک نہیں گئے تھے بلکہ ان کا مقاصد ان خزینوں تک رسائی کرنا تھاجنھیں اقوام مغرب لوٹ کر لے گئی تھی۔ ان کے سفرنامے علمی معلومات سے بھرپور ہیں۔ شبلی نعمانی کے سفر نامہ روم و مصر و شام سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو کہ

> علم یہاں ذریعہ دولت نہیں تاہم اس علاقہ میں کثرت سے اہل علم اور مصنفین پیداہوئے اور اب بھی موجودہیں خاص لبنان کے علماء و شعراء کے حال میں ایک مستقل کتاب لکھی گئی ہے۔ لیکن افسوس اور سخت افسوس ہے کہ یہ تمام علمی ترقی اور تصنیف و تالیف جو کچھ ہے۔عیسائیوں کے ساتھ مخصوص ہے مسلمان ان چیزوں کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے۔ [۴۸]

مسافران لندن سے یہ اقتباس دیکھئے:

> پس جو لوگ حقیقت میں ہندوستان کی بھلائی اور ترقی چاہتے ہیں و ہ یقین مان لیں کہ ہندوستان کی بھلائی صرف اس پر منحصر ہے کہ تمام علوم اعلیٰ سے لے کر ادنی تک انہی کی زبان میں ان کو دئیے جائیں۔ میری یہ رائے ہندوستان کے ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی پر بڑے بڑے حرفوں میں آئندہ ۸ زمانہ کی یادگاری کے لیے کھود دئیے جائیں۔اگر تمام علوم ہندوستان کو اسی زبان میں نہ دئیے جائیں گئے تو بھی

ہندوستان کو شائستگی اور تربیت کا درجہ نصیب نہ ہوگا۔[49]

سفر نامہ ایک ایسی مفید صنف ہے جو کہ علمی و ادبی ، تہذیبی ، معاشرتی، تاریخی، جغرافیائی معلومات میں اضافہ کرنے کا باعث بنتا ہے۔ سفرنامہ نگار نہ صرف تاریخی معلومات دینے پر اکتفاکرتا ہے بلکہ وہ ملکوں کی سیاست ، مذہب، لوگوں کے رسم و رواج اور بودوباش کے متعلق بھی اپنی افتاد طبع کے مطابق تحریر کرتا ہے جس سے قاری دوسرے ملک اور خطے سے واقف ہوتا ہے۔ پرانے سفر نامے معلومات فراہم کرنے کا ایک اہم ذریعہ سمجھے جاتے تھے کیونکہ اس وقت ذرائع آمدورفت نے اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ لوگ آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ جا سکیں اور دوسرے ممالک کے بارے میں جان سکیں۔ اس لیے لوگ سفر نامے سے مستفید ہوتے تھے۔ سفر نامے کی اہمیت کے بارے میں پروفیسر تنویر حسین لکھتے ہیں۔سفر نامہ کسی ملک یا خطے کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کا مثبت ذریعہ فراہم کرتا ہے۔[50]

سفر نامہ دنیا ئے ادب کی ایک دلچسپ اور اہم صنف ہے، اس لیے تمام زبانوں میں اسے تخلیق کیا گیا ہے۔ سفر نامہ دوسری اقوام کے تاریخی، ثقافتی، معاشی، سیاسی حالات، لوگوں کے رہن سہن اور معاشرت کو سامنے لاتا ہے اور سفر نامہ نگارمصلح قوم بھی ثابت ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنی باریک بین نگاہوں سے خامیوں اور خوبیوں کا تجزیہ بھی کرتا ہے۔

سفر نامہ ایک ایسی واحد صنف ہے جو کم وقت میں ہر طرح کی معلومات فراہم کرتا ہے۔ یہ معلومات ادبی، قومی اور انفرادی، زندگی کے ہر گوشے پر محیط ہے۔ سفر نامہ معلوماتی ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ اور لطف سے بھرپور صنف ہے۔

ج۔ جنوبی ایشاء میں سفر نامے کی روایت:

اٹھارویں صدی تک کے سفر نامے

سولھویں صدی عیسوی میں ہندوستان کے تعلقات انگلستان کے ساتھ اس وقت استوار ہونا شروع ہوئے،جب بادشاہ انگلستان نے اپنے سفیر سرٹا مس رو(Thomas Rao) کو جلال الدین محمد اکبر (۱۵۵۶ء۔۱۶۰۵ء) کے دربار میں بھیجا تاکہ وہ ہندوستان میں تجارت کرنے کا اجازت نامہ حاصل کریں اور انھیں ہندوستان کے کچھ علاقوں میں تجارتی کمپنیاں قائم کرنے کی اجازت مل گئی ۔ انگریز ایک خاص مقصد کے تحت ہندوستان میں آئے تھے۔ انھوں نے خود کو مغلوں کا خیر خواہ اور دوست ثابت کرنے کی حتی الامکان کوششیں کیں اور وہ اس میں کامیاب بھی رہے۔[۵۱]

انگریزوں نے آہستہ آہستہ دوسرے علاقوں میں بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے اپنے پنجے گاڑنے شروع کر دئیے اور پھر کچھ عرصے بعد ان کاتجارتی لین دین سیاسی عملداری میں بھی مداخلت کرنے لگا۔ انھوں نے حکومتی معاملات میں عمل دخل شروع کر دیا مگر جب تک مغل حکمران اپنی فہم وفراست اور رعب و دبدبے سے نظام حکومت چلاتے رہے۔ تب تک وہ اپنی سیاسی چالوں میں کامیاب نہ ہوئے مگر ۱۷۰۷ء میں اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھرنا شروع ہوگیا۔ ان کے جانشین نا اہل حکمران اپنی نا اہلی اور عیاشیوں میں پڑکر کمزور سے کمزورتر ہوتے گئے اور ان سب کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انگریز اپنی عیاری سے ہندوستان پر غلبہ پاتے گئے۔

اٹھارہویں صدی، ہندوستان کے زوال و انحطاط کی صدی ہے۔ مغلیہ سلطنت کے کمزور ہوتے ہی جاٹ، روہیلے، مرہٹے،اور انگریز ملکی لوٹ کھسوٹ میں لگ گئے۔ ان سب کے سامنے غریب عوام بے بس و مجبور تھی اور کسی کی بھی عزت و ناموس محفوظ نہ تھی۔ حتیٰ کہ روزی روٹی کے لالے پڑ گئے تھے۔ صنعتیں تباہ اور تمام پیشے اپنی اہمیت کھو بیٹھے تھے۔ عوام فارغ البالی اور خوف وہراس کی کیفیت میں تھے اور نہ صرف عوام بلکہ خود شاہی خاندان پر کئی کئی وقت کے فاقے کی نوبت آگئی تھی۔ معاشرے میں اطمینان او رآسائشوں بھرا دور ختم ہو چکا تھا۔ [۵۲]

۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد ہندوستا ن مکمل طور پر انگریزوں کے تسلط میں آگیا۔ انھوں نے ملکی نظام کو چلانے کے لیے ایک

طرف تو ملک میں صنعتوں کا جال بچھا دیا اور دوسری طرف اپنی انتظامی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے انگریزی اور سائنسی علوم کی تعلیم کے لیے مدارس اور کالج قائم کیے۔ ۱۸۰۰ء میں کلکتے میں فورٹ ولیم کالج کا قیام انھی مقاصد کی تکمیل کا شاخسانہ تھا۔ ایک طرف تووہ اس کے قیام سے ہندوستانی عوام کے دلوں میں اپنی وفاداری اور خود کو ان کا ہمدرد ثابت کرنا چاہتے تھے اور دوسری طرف انہوں نے اپنے نوآموز انگریز افسروں کی تربیت کے لیے اور ان کو اردو سے متعارف کروانے کے لیے کتابوں کے آسان اردو میں تراجم کروائے۔ یہ ایک ایسا دور ہے کہ جس میں انگریز اور مسلمانوں میں سرد مہری کی فضا پیدا ہوگئی تھی ۔ انگریز وں نے عذر کی تمام تر ذمہ داری مسلمانوں پر ڈالتے ہوئے ان کو اپنے عتاب کا نشانہ بنایا اور مسلمان انگریزوں سے مختلف وجوہات کی بناء پر متنفر تھے۔ ۵۳

اٹھارویں صدی ہندوستان کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ اس عہد میں ہندوستانیوں کی زندگی میں ایک عظیم انقلاب آیا۔ یوں تو سترھویں صدی میں سلطنت ِبرطانیہ کے تعلقات بادشاہ ہندوستان کے ساتھ قائم ہونا شروع ہوگئے تھے اور ایسٹ انڈیا کمپنی تجارت کی غرض سے اپنے مذموم مقاصد کے ساتھ اپنی اجارہ داری قائم کر چکی تھی مگر ہندوستان پر مکمل قابض ہونے کی خواہش اور نگ زیب عالمگیر کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد پوری ہوئی، جب مغلیہ سلطنت کے جانشینوں میں تخت کے حصول کے لیے خانہ جنگی شروع ہوئی تو انگریزوں نے برصغیر کی سیاست میں اپنی مداخلت شروع کرکے ہندوستان پر اپنی مکمل سلطنت قائم کرنے کے لیے کوششیں تیز کر دیں اور بالآخر ۱۷۵۷ء کے غدر کے بعد پورے ہندوستان پر سلطنتِ برطانیہ کی نو آبادی قائم ہوگئی۔اٹھارویں صدی میں انگلستان کا سفر نہایت دشوار تھا اور ذرائع آمدورفت محدود ہونے کی وجہ سے بہت کم لوگ سفر پر آمادہ ہوتے تھے۔ اسی وجہ سے اس صدی میں کم سفر نامے لکھے گئے اور جو سفر نامے میسر ہیں، وہ بھی فارسی زبان میں ہیں۔

۱ شاہ ولی اللہ فیوض الحرمین ۱۷۴۷ء

٢ ۔	محمد عبد اللہ	سفرنامہ روس و چین	١٧٧٠ء
٣ ۔	منشی اسماعیل	تاریخِ جدید	١٧٧٣ء
۴ ۔	مرزا اعتصام الدین	شگرف نامہ ولایت	١٧٧۵ء
۵ ۔	میر محمد حسین لندنی	مشاہداتِ فرنگ	١٧٧۵ء
۶ ۔	مولوی رفیع الدین مراد آبادی	سوانح الحرمین	١٧٨٧ء

اٹھارویں صدی میں لکھے جانے والے سفرناموں میں سے زیادہ ترحج نامے ہیں جو کہ حجاز مقدس کی وارداتِ قلبی کا سچّا بیان ہے۔ اور یہ سفر نامے راستے کی صعوبتوں میں دوسروں کو شریک کرنے کی غرض سے لکھے جاتے تھے۔ اس میں مناسکِ حج اور دیگر ارکان کے علاوہ راستوں ، لوگوں کے رسم ورواج اور ضروری اشیاء جو کہ زادراہ کا کام دیں، ان کے متعلق بھی ہدایات دی جاتی تھیں۔ اس طرح سے یہ سفری گائیڈ کی ذیل میں بھی آتے ہیں۔ یہ سفر نامے لوگوں کی رہنمائی کے لیے لکھے جاتے رہے ہیں۔

حج ناموں کی روایت پر نظر ڈالیں تو بہت سی سوانح عمریاں ایسی ملیں گی جن میں حجاز مقدس کے سفر کا احوال بھی پایا جاتا ہے۔ اس طرح وہ سوانح اور سفرنامے دونوں کی ذیل میں آتی ہیں جیسے کہ "*سوانح احمدی*" یہ حضرت سید احمد بریلوی شہید کی سیرت سے متعلق بڑی تاریخی اہمیت رکھنے کے ساتھ ساتھ حج کی سعادت سے متعلق بھی معلومات فراہم کرتی ہے۔ لیکن یہ ایک باقاعدہ حجاز مقدسہ کا سفر نامہ یا حج نامہ میں شمار نہیں ہوتی مگر اس حج نامے کی روایت میں شیخ عبدالحق دہلوی اور حضرت شاہ ولی اللہ نے تقدیس کا زاویہ پیداکیا۔ حج نامے کی اولیت کا سہرا شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے سر ہے۔ ا ن کاحج نامہ بہ عنوان"جذب القلوب(١۵٨٩ء) میں حج کی سعادت حاصل کرنے سے متعلق ہے۔ [۵۴]

دوسرا قدیم ترین حج نامہ حضرت شاہ ولی اللہ کا فیوض الرحمین (١٧۴٨ء) ہے۔ اس سفر نامے میں حج کی

روحانی واردات اور باطنی کیفیات کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ روحانی سفر حیرتوں کو جگانے کے ساتھ ساتھ روح کو بیدار کرنے کا فریضہ بھی انجام دیتا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ اسی شوقِ سفر کی تکمیل کے لیے زائرین کے قافلے کے ساتھ روانہ ہوئے۔ حضرت شاہ ولی اللہ برصغیر پاک وہند کی ایک ایسی برگزیدہ ہستی ہیں جنھوں نے اسلامی شعائر کے تحفظ کے لیے بڑی کوششیں کیں اور انگریزوں کے خلاف برسرِپیکار رہے۔ ان کا کام اور نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ جہاں کہیں بھی اسلامی تحریکوں کا نام آئے گا وہاں حضرت شاہ ولی اللہ تحریک کا نام بھی ضروری ہے۔ یہ سفر نامہ نہ صرف فارسی زبان کے اہم سفر ناموں میں شمار ہوتا ہے بلکہ اس میں مناسکِ حج اور وارداتِ قلبی کا خوبصورت بیان ملتا ہے۔

نوآبادیات کے اس عہد میں اہل مغرب مختلف مقاصد اور سیرو سیاحت کے لیے آئے اور برصغیر کے لوگ اپنے آقاکے انتظامی امور اور اثر و رسوخ سے متاثر ہوکر یورپ کی جانب مائل ہوئے اور اس طرح دونوں جانب سے اسفار کا سلسلہ شروع ہوا۔ اہلِ ہندوستان کی طرف سے کچھ اسفار ایسے بھی ہیں جو انھوں نے سلطنتِ برطانیہ سے تعلقات بڑھانے کے لیے یا انگریزوں کے کچھ سیاسی عزائم کی تکمیل کی خاطر انجام دئیے۔ ان سفر ناموں میں یہ عزائم کھل کر تو سامنے نہیں آتے مگر بعض سرگرمیوں سے اور ان سفرنامہ نگاروں کی تحریروں کے کچھ اقتباسات سے ان شکوک کو تقویت ملتی ہیں کہ وہ سلطنت برطانیہ کے منظورِ نظر تھے۔ ان سفرنامہ نگاروں میں سے ایک سفر نامہ "*روس و چین*" ہے۔ جسے محمد عبداللہ نے ۱۷۷۰ء میں تحریر کیا ۔اس سفر نامہ کو ڈاکٹر نجیبہ عارف نے دریافت کیا ، وہ اس سفر نامہ کی تلاش کے متعلق لکھتی ہیں کہ بعد از کوشش بسیار برٹش لائبریری ہی میں اس مخطوطہ تک رسائی حاصل ہوگئی۔[۵۵]

اٹھارویں صدی میں جنوبی ایشیاء سے مغرب کی جانب سفر کرنے والے محمد عبداللہ نے تقریباً ۱۷۷۰ء سے پہلے مختلف خطوں کا سفر کیا اور اس سفر نامہ میں دو الگ الگ اسفار کا حال مختصراً بیان کیا ہے۔ مصنف نے صرف راستوں اور شہروں کی تفصیل دی ہے اور بہت سی باتیں پردہ رازمیں رکھیں ہیں وہ جن لوگوں سے ملا ان کا ذکر بھی سرسری

کرتا ہے یا اس نے کسی مقصد سے سفر اختیار کیا ہے اس کے بارے میں بھی سفر نامے میں کوئی شہادت نہیں ملتی، مگر سفر نامے میں اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ وہ انگریزوں کا تنخواہ دار ملازم تھا۔ ڈاکٹرنجیبہ عارف اس سفرنامے کے بارے میں لکھتی ہیں:

> قرین قیاس ہے کہ محمد عبداللہ کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے کار پردازان نے کسی جاسوسی مہم پر روس و چین روانہ کیا ہوگا۔ اٹھارویں صدی میں ایسی مہمات کا سراغ ملتا ہے اور کچھ اور جاسوسوں کی ڈائریاں اور روزنامچے بھی برٹش لائبریری میں موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دورمیں ایسٹ انڈیا کمپنی کے اربابِ اقتدار ہندوستان، افغانستان، ایران اور روس تک جاسوسی کے جال پھیلا رہے تھے۔ [۵۶]

سفر نامے نگار نے بہت سی باتیں صیغۂ راز میں رکھیں ہیں اور اپنی تمام تر توجہ صرف مقامات کے نام، وہاں قیام کی مدت اوربہت کم لوگوں کے ناموں کے متعلق لکھا ہے۔ محمد عبد اللہ کے سفرنامے کاایک قلمی نسخہ بنگال کے گورنر جنرل وارن ہسٹنگز(Warren Hastings) کے ذریعے انڈیا آفس لائبریری برطانیہ پہنچا۔ یہ سفر نامہ اپنی اختصار نویسی کے باوجود اٹھارویں صدی کے تاریخی حوالے سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

کسی بھی خطے کی تاریخ، رسم رواج، سیاست،معاشرت اور دوسری معلومات کے لیے سفر نامے ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جنوبی ایشیاء میں اٹھارویں صدی تک اس صنف کی جانب کم توجہ دی گئی اور جو تھوڑے بہت سفر نامے تخلیق کیے گئے، وہ گوشۂ گمنامی میں پڑے کسی صاحبِ نظر کے انتظار میں ہوں گئے۔ ایسا ہی ایک سفر نامہ منشی اسماعیل کا تاریخ جدید ہے جو ۱۷۷۳ء میں فارسی زبان میں لکھا گیا ہے۔ منشی اسماعیل نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک افسرمسٹر کلارڈرسل کے ساتھ ۱۷۷۱ء سے ۱۷۷۳ء کے دوران کلکتے سے انگلستان کا سفر کیا اور سفر نامے کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سفر نامہ لکھنے کا خیال انھیں دورانِ سفر ہی آگیاتھا تاکہ وہ اپنی سرکاری نوکری اور سلطنتِ برطانیہ کا احوال قلم بند کرکے اپنے آقا کی خوشنودی حاصل کرے۔

اس سفرنامے میں منشی اسماعیل نے نہ صرف سفرکے مشاہدات و تجربات کو بیان کیا ہے بلکہ اپنے خاندانی حالات او ربنگال کی قحط زدہ صورت حال کا اظہار بھی باریک بینی سے کیا ہے۔ اس حوالے سے یہ سفر نامہ نو آباد یاتی عہد کی معاشرتی، سیاسی، ثقافتی،تاریخ کا ایک اہم دستاویز ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خود نوشت کی ذیل میں بھی آتی ہے۔ ان تمام باتوں کے علاوہ اس سفر نامہ کی اہمیت اس وجہ سے زیادہ ہے کہ یہ انگلستان کا اولین سفر نامہ ہے۔ منشی اسماعیل کے اس سفر نامہ تاریخ جدید کو بڑی کاوش و لگن کے ساتھ دریافت کیا ہے۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف اس سفر نامہ کی اہمیت کے متعلق لکھتی ہیں:

> منشی اسماعیل کے مذکورہ سفر نامہ کے دریافت کے بعدکہا جا سکتا ہے۔ کہ اب تک دست یاب معلومات کے مطابق"تاریخ جدید" ہندوستان میں لکھا جانے والا، انگلستان کا پہلا سفر نامہ ہے جس کی تالیف ۱۷۷۳ء میں ہوئی۔ یہ الگ بات ہے کہ کم وبیش دو سو سال تک یہ تحریر اہل علم کی نظروں سے اوجھل رہی۔[۵۷]

۱۷۵۷ء سے ۱۸۵۷ء برصغیر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی اجارہ داری اور سلطنت برطانیہ کی ابتدائی نو آبادیات کا عہد ہے بلکہ ہندوستانیوں کے بدتراستحصال اور تنزلی کا بھی عہد ہے۔نوآبادکاروں نے اپنی حکومت قائم کرنے اور تجارتی مقاصد کے حصول کی خاطر ہندوستانیوں سے جانوروں سے بھی بدتر سلوک کیا اور ان کی جانوں تک کی پرواہ نہ کی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر تسلط علاقوں میں ۱۷۶۹ء تا ۱۷۷۳ء تک کمپنی کی بدترین پالیسیوں کی وجہ سے خوف ناک قحط کی صورت حال پیدا ہوئی جس سے لاکھوں انسان لقمۂ اجل بنے۔نو آبادیات کے اس عہد میں اگر یورپ کا سفر اختیار کرنے والے سفر نامہ نگاروں کے ہاں دیکھیں تو انہیں اپنے حقوق کا تحفظ ، سیاسی شعور اور قومیت کا احساس تک نہیں بلکہ اس کے برعکس وہ اہل برطانیہ کی ذہنی قابلیت، انتظامی صلاحیت اور عدل و انصاف کے معترف دیکھائی دیتے ہیں۔

ان کے سفر نامے مغربی تہذیب و ثقافت اور انکی ترقیاتی کاموں کی قصیدہ خوانی کا دیوان معلوم ہوتا ہے۔ ابتدائی دور کے تمام سفر ناموں میں یہ رویہ پایا جاتا ہے۔ مرزا اعتصام الدین کا سفر نامہ شگرف نامہ ولایت بھی اس ستائش سے

بھرپور ہے وہ بھی انگریز وں کے خیرخواہ اور مغربی تہذیب و تمدن کے دلدادہ ہیں۔ یہ سفر نامہ ۱۷۷۵ء میں شائع ہوااور اسے منشی اسماعیل کے سفرنامہ تاریخ جدید کے دریافت ہونے سے پہلے ، انگلستان جانے والے پہلے ہندوستانی کا سفر نامہ سمجھا جاتا تھا۔ اعتصام الدین نے ۱۷۶۷ء سے ۱۷۶۹ء میں انگلستان کا سفر کیا اور اسے فارسی زبان میں تخلیق کیا۔ اس عہد کے مروجہ اسلوب کے مطابق اندازِتحریر ادبی اور جزیات نگاری پر مبنی ہے۔ یہ سفر نامہ بھی مغربی تہذیب و ثقافت اور ہندوستانی فضا اور سماجی و معاشرتی اور سیاسی حوالوں سے اہمیت کا حامل ہے۔

اسی عہد میں عربی میں لکھا جانے والا ایک اور اہم سفر نامہ جسے ۱۷۷۵ء۔ ۱۷۷۶ء میں میر محمد حسین لندنی نے رسالۂ احوالِ ملک فرنگ و ہندوستان کے نام سے لکھا۔ انہوں نے سیر وسیاحت کی غرض سے یورپ کا سفرا پنے ایک برطانوی انگریز دوست(Elliot) کے ہمراہ اختیار کیا وہاں جا کر انہوں نے اپنے دوست کے توسط سے انگریزی سیکھی اورا یک انگریزی کتاب کا فارسی میں ترجمہ بھی کیا۔ڈاکٹر نجیبہ عارف لکھتی ہیں:

> میر محمد حسین لندنی نے اس سفر سے واپسی پر اپنے تاثرات و مشاہدات کو سب سے پہلے عربی زبان میں لکھا مگر بعد میں اپنے دوست کی فرمائش پراسے فارسی میں ترجمہ کیا۔ ۲۰۱۰ء میں اس سفر نامہ کے مخطوطے کو محمد احمد برکتی نے ڈھونڈکر اس تعارف کے ساتھ "مشاہدات فرنگ" کے نام سے شائع کیا۔[۵۸]

اٹھارویں صدی میں لکھے جانے والے حج ناموں میں سے ایک اور اہم حج نامہ مولوی رفیع الدین مراد آبادی کا سوانح الحرمین ہے۔ جسے انہوں نے خود نوشت کے انداز میں ۱۷۸۷ء میں تحریرکیا۔ اس حج نامہ میں انھوں نے روضۂ رسولﷺ اور خدا پاک کے گھر کی عظمتوں کو وارداتِ قلبی سے بیان کیا ہے۔ اسی لیےیہ سفر نامہ فارسی زبان کا ایک عمدہ سفر نامہ شمار ہوتا ہے۔[۵۹]

۱۸۰۰تا ۱۸۵۷ء کے سفر نامے

برصغیر پاک و ہند میں انیسویں صدی بڑی کش مکش سے بھرپور صدی تھی اور ایسے حالات کی سنگینی کو سر سید

احمد خان کی دوربین نگاہوں نے بھانپ لیا اورمسلمانوں کو جدید علوم حاصل کرنے کی ناصرف تلقین کی بلکے علی گڑھ میں عملی طور پر عملی کام کاآغاز کیا۔ انھوں نے دوسری طرف سائنٹیفک سوسائٹی کے زیرِ اثر مغربی کتابوں کے تراجم بھی کروائے۔ اس طرح سرسید کی کوششوں سے عوام انگریزی علوم کی طرف راغب ہوئے اور انھی کی کوششوں سے کئی نئی اصناف مضمون نگاری ، سوانح، تنقید، ناول اور سیاحت نامے جیسی صنف اردو ادب میں داخل ہوئیں۔

سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء نے قومی مقاصد کے تحت مختلف ملکوں کے سفراختیار کیے اور واپسی پر سفر نامے تخلیق کیے۔ ان کے یہ سفر نامے علمی ، ادبی، سماجی اہمیت کے حامل ہیں۔ ہندوستان میں انگریز سلطنت کے ثمرات تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے قائم ہوتے ہی شروع ہوگئے تھےمگر اس میں تیزی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد آئی کیونکہ ان کے بعد وہ تمام سیاہ و سفید کے مالک بننے کے بعد تمام شعبۂ ہائے زندگی پر چھا گئے تھے۔ انگریز قوم ایک عرصے سے ہندوستان کے سحر میں گرفتار تھی۔ انھوں نے متعددبار ہندوستان کے سفر کیے اور بہت سے ہندوستانی اپنے آقاؤں کے دیس کی برکتوں اور ترقیوں سے فیض یاب ہونے کی خاطر یورپی سفر پر نکلے اور واپسی پر اپنی رودادِسفر میں دوسروں کو شریک کرنے کی خاطر سفر نامے لکھے۔

مسیر طالبی(۱۸۰۵ء)

مرزا ابو طالب نے اپنایہ سفر کلکتہ سے شروع کیا اور لندن کی سیروسیاحت پر روانہ ہوئے۔ ان کا یہ سفر خاص مقصد کے تحت تھا جن میں سلطنت برطانیہ کے اہم لوگوں سے ملاقاتیں بھی تھیں۔ اس سفر میں نہ صرف مسافرت لندن کا احوال ہے بلکہ برصغیر کے متعلق اہم اطلاعات بھی موجود ہیں۔ خاص کر ایرانی پارسیوں اور تاریخی عمارتوں کے متعلق اہم معلومات ہیں۔ اس سفر نامہ میں مرزا ابوطالب یورپی تہذیب سے متاثر نظر آتے ہیں۔

مثنوی نادر(۱۸۲۴ء)

یہ اہم سفر نامہ مثنوی کی صنف میں ۱۸۲۴ء میں شاعر نادر نے تخلیق کیا اور یہ مثنوی نادر کے نام سے مشہور ہے۔ یہ سفر نامہ اب تک غیر مطبوعہ شکل میں ہے۔ اس میں نادر نے

نواب اعظم جاہ والی ارکاٹ کے ، مدراس سے ناگور شریف کے سفرکے حالات و واقعات کو پیش کیا ہے اوراس سفرنامے کو دکنی اردو میں تحریر کیا گیا ہے۔ اس سفرنامے کی اہمیت کے متعلق ڈاکٹر قدسیہ قریشی کہتی ہیں:

> مثنوی نادر اردو سفر ناموں میں دو اعتبار سے بے حد اہم ہے۔ اول یہ کہ یہ اردو کا پہلا سفر نامہ ہے، اب تک جتنے سفر نامے دستیاب ہوئے ہیں ان میں تاریخی اعتبار سے قدیم ترین بھی ہے۔ اس کی دوسری اہمیت یہ ہے کہ یہ منظوم سفر نامہ ہے۔[۶۰]

اس منظوم سفر نامے سے اس عہد کے نوابوں کی زندگی اور اس عہد کی تہذیب و معاشرت کے بارے میں بہت سی اہم معلومات ملتی ہیں۔

سیاحت نامہ(۱۸۳۹ء)

نواب کریم خان کا تعلق ریاست جھجر سے تھا۔ انھوں نے یکم دسمبر ۱۸۳۹ء کو دہلی سے کلکتے کا سفر اختیار کیا اور وہاں سے ۱۴ مارچ ۱۸۴۰ء کو لندن کے لیے روانہ ہوئے اور وہاں وہ ۱۸۴۱ء تک مقیم رہے۔ اس دوران انھوں نے حکمران اعلیٰ سے ملاقاتیں کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی بے پناہ مصروفیت میں لندن کو سرسری نظر سے دیکھ کر، اپنے حالات سفرکو ڈائری میں قلم بند کرتے رہے۔اس قلمی نسخے کو ڈاکٹر عبادت بریلوی نے دریافت کر کے سیاحت نامے کے نام سے ۱۹۸۲ء میں شائع کیا۔

ترغیب المسالک الیٰ احسن المالک(۱۸۴۱ء)

نواب مصطفیٰ خان شیفتہ اردو ادب کے ایک نام اور شاعر ہیں۔انھوں نے اپنے حج کی واردات قلبی کو اس حج نامے میں لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے۔ انیسویں صدی میں نثر اپنی ارتقائی منازل طے کر رہی تھی اور اردو ادب کا ذخیرہ وسیع ہو رہا تھا مگر نواب شیفتہ نے اپنا سفر نامہ کو فارسی زبان میں لکھا۔ یہ سفر نامہ فارسی زبان میں بڑا اہم اور منفرد سفر نامہ سمجھا جاتا ہے۔ انیسویں صدی میں فارسی زبان میں جو بھی سفر نامے لکھے گئے ان میں نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کا ترغیب المسالک احسن المالک بھی اس سلسلے کی کڑی ہے۔[۶۱] نواب غوث محمد خان نے اپنا سیر المحتشم سفر نامہ ۱۸۵۱ء میں لکھا۔ اس میں انھوں نے ہندوستان کے مختلف

شہروں کے سفر کا احوال تفصیل سے بیان کیا ہے۔ یہ سفر نامہ تاریخی واقعات کے حوالے سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔کیونکہ ایک تو اس میں ہندوستان کی تہذیب و معاشرت ملتی ہے۔اور دوسرا مصنف نے مختلف عمارتوں اور مکانوں کی تصویریں اور نقشے بھی پیش کیے ہیں۔ یہ ایک تصویری سفر نامہ ہے۔

عجائبات فرنگ(۱۸۴۷ء)

یوسف خا ن کمبل پوش کا سفر نامہ عجائبات فرنگ جس کو تاریخ یوسفی بھی کہا جاتا ہے۔ اس سفر نامہ کو بجا طور پر اردو ادب کا پہلا سفر نامہ تسلیم کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے کوئی ایسا سفر نامہ دریافت نہیں ہوا جو اردو زبان میں لکھا گیا ہو۔ یوسف خان کا ایک اور نادر سفرنامہ سیرِ ملکِ اودھ جسے ڈاکٹر نجیبہ عارف نے دریافت کرنے کے بعد اس کو اپنے مقدمہ کے ساتھ ۲۰۱۷ء میں شائع کیا ہے ۔ یہ سفرنامہ ۱۸۴۷ء کے عرصے میں لکھا گیا تھا اور غیر مطبوعہ حالت میں برٹش لائبریری میں موجود رہا۔ یوسف خان کا سفر نامہ عجائبات فرنگ ۱۹۴۷ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ انہوں نے ۱۹۳۷ء /۱۹۳۸ء میں اپنے وطن کو خیر باد کہا اور لندن کی سیاحت کے لیے روانہ ہوا۔ یوسف نے یورپ کی تہذیب و معاشرت کو دیکھااور اپنے مشاہدات و تجربات میں دوسروں کو شریک کرنے کے لیے اپنا سفر نامہ تخلیق کیا۔

سیر کشمیر(۱۸۴۷ء)

سیر کشمیر پنڈت کنھیالال کا سفر نامہ ہے۔وہ ۱۸۴۷ء میں انگریزوں کے ساتھ ایک گائیڈ کے طور پر،کشمیر کی سیاحت پر روانہ ہوئے اور واپسی پر انھوں نے بہت مختصر سیر کشمیر کے نام سے یہ سفرنامہ لکھا۔ اس میں پنڈت کنھیا لال وادیٔ کشمیر کے خوبصورت مناظر کی منظرکشی کرتے ہیں۔یہ سفرنامہ انیسویں صدی کی اردو نثر کا بہترین نمونہ ہے۔

تاریخ افغانستان (۱۸۵۲ء)

سید فدا حسین کا سفر نامہ تاریخ افغانستان ۱۸۵۲ء میں اردو زبان میں لکھا گیا ہے۔ یہ روزنامچہ کی ہیٔت

میں ہے، اس میں فدا حسین نے اپنی جنگی مہمات اور دورانِ سفر پیش آنے والے واقعات کو حقیقت نگاری سے پیش

کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سفرنامے کا کینوس محدود ہے اور یہ جنگی وقائع نگاری کا ایک غیر مرقع نمونہ نظر آتا ہے۔[۶۲]

نو آبادیاتی عہد کے سفرنامے (۱۸۵۷ء تا ۱۹۴۷ء)

نو آبادیاتی عہد دیگر اصناف کی ترقی کی طرح اردو سفر نامے کے لیے بھی ایک اہم دور ہے۔ اس دور میں بہت سے سفر نامے لکھے گئے ہیں۔ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں جن میں سب سے پہلی وجہ یہ ہے کہ اس دور میں اہل یورپ سیروسیاحت ، امور سلطنت اور دیگر مقاصد کے تحت برصغیر میں آئے اور اسی طرح برصغیر کے لوگوں کے بھی یورپ کی چکا چوند نے اپنی جانب متوجہ کیا اور اس طرح یورپ جانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان کے علاوہ سفر میں بہت سی سہولیات پیدا ہونے کی وجہ سے بھی ایک ملک سے دوسرے ملک یا ایک خطے سے دوسرے خطے کی جانب آمدورفت استوار ہوئی اور ان سہولیات کی وجہ سے لوگوں میں سفر کرنے کا شوق پیدا ہوا۔انھوں نے سفر سے واپسی پر اپنے سفر کے تجربات اور حالات و واقعات کو سفر ناموں کی صورت میں بیان کیے۔

۱۔ حج کے سفر نامے:

حج دین اسلام کا ایک اہم فرض ہے او ر اس فرض کی ادائیگی کا ہر مسلمان خواہش رکھتا ہے۔ جب خدا کی ذات

کسی کو اپنے در پر بلاتی ہے تو اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہتا اور وہ بندہ خدا تمام دنیاوی مصروفیات سے خود کو آزاد کرکے اس کے بلاوے پر لبیک کہتا، درِ نبیﷺ کی جانب بھاگ پڑتا ہے۔

حج ایک ایسا روح پر ورمنظر ہے جو آنکھوں میں حیرت و ٹھنڈک پیداکرتا اور مسافر کو نئی نئی کیفیتوں سے آشنا کرتا ہے۔ اس سفر پر روانہ ہونے والے مسافر اپنے وطن سے دیارِ محبوب تک کا سفر اسی شوقِ عشق اور ذہن و قلب کی آسودگی کی خاطر کرتے ہیں۔اسی لیے یہ روحانی سفر دوسرے ارضی اسفار سے الگ نوعیت کا ہوتا ہے اور جب اس مقدس فرض کی تکمیل کے بعد وہ مسافر واپسی کا سفر کرتا ہے تو

اس کیفیت اور سرشاری میں کرتا ہے کہ وہ دنیا کی غلاظتوں سے پاک اور رب نے اپنے راضی ہونے کا عندیہ دے دیا ہے۔

ایک زائر جب اس محبت و عقیدت کے سفر سے واپس آتا ہے تو دور و نزدیک کے سب لوگ اس وارداتِ قلبی کی روداد سننے آتے ہیں اور ان مقاماتِ مقدسہ کی زیارتوں سے فیض یاب ہونے والا خود بھی، اپنے روحانی تجربات اور مشاہداتِ حج میں دوسروں کو شریک کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ شروع شروع میں یہ زبانی داستان سنائی جاتی تھی مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کو راستے کی مصیبتوں سے بچانے کی خاطر اور مناسک حج کی معلومات دینے کے لیے سفر نامے لکھے گئے۔ جیلانی کامران حج کے سفرناموں کے متعلق لکھتے ہیں کہ حج کے سفرنامے بنیادی طور پر محبت کے سفر نامے ہیں۔ محبت کے جذبے کے بغیر یہ سفر شروع ہی نہیں ہوتا اور وارداتِ حج کی باتیں عموماً عشق وجذب کی باتیں ہیں۔[۶۳]

اس جذباتی واردات کو مختلف لوگوں نے اپنے اپنے انداز سے بیان کیا ہے۔ اندازِ بیان مختلف ہے مگر احساس و جذبات سب کے یکساں ہیں۔ اس عہد میں جن لوگوں نے حج کے سفرنامے تخلیق کیے ان کے نام اور سنِ اشاعت درج ذیل ہیں۔

	مصنف	**سفرنامہ**	**سن اشاعت**
۱۔	نواب سکندر بیگم	تاریخ وقائع حج (قلمی)	۱۸۶۱ء
۲۔	حکیم فرید اللہ	سعادت دارین	۱۸۷۱ء
۳۔	حاجی محمد زردارخان	سفرنامہ حرمین	۱۸۷۳ء
۴۔	محمد بخش قادری	منبع الحرمین	۱۸۸۲ء
۵۔	محمد ایزدبخش	مفیدالدارین	۱۸۸۲ء
۶۔	سید محمد علی جونپوری	تبصرہ المومنین یلغب رفیق الزارین	۱۸۸۲ء
۷۔	حاجی سید وزیرحسین	وکیل الغربا	۱۸۸۴ء
۸۔	منشی سید برکت	رہنمائے حجاج	۱۸۸۴ء

	علی		
۹۔	محمد عمر علی خان	زادِ غریب	۱۸۹۰ء
۱۰۔	مولانا محمد حفیظ اللہ	سفر نامہ حجاز	۱۸۸۴ء
۱۱۔	حاجی علیم الدین	رسالہ حج	۱۸۹۲ء
۱۲۔	سید کاظم حسین شیفتہ	سفر نامہ حرمین شرقین	۱۸۹۳ء
۱۳۔	حکیم محمد محی الدین	سفر نامہ حرمین الشرمین	۱۹۰۳ء
۱۴۔	نواب احمد حسین خان	سفر نامہ حجاز و مصر	۱۹۰۳ء
۱۵۔	حاجی نور الدین قصوری	سفر نامہ حجاز و مصر	۱۹۰۴ء
۱۶۔	خان بہادر محمد عبدالرحیم	سفر حرمین الشرمین	۱۹۱۰ء
۱۷۔	خواجہ حسن نظامی	سفر نامہ حجاز و مصر و شام	۱۹۱۱ء
۱۸۔	فاطمہ بیگم	سفر نامہ حجاز	۱۹۲۴ء
۱۹۔	مولانا عبدلماجد دریابادی	سفیر حجاز	۱۹۲۹ء
۲۰۔	منشی امیر احمد علوی	سفرسعادت	۱۹۳۲ء
۲۱۔	مولوی ظفر احمد تھانوی	سفر نامہ حجاز	۱۹۳۳ء
۲۲۔	مولوی محمد عبدالعزیز	سفر نامہ بلا د/ اسلامیہ	۱۹۳۵ء
۲۳۔	نواب آف بھاول پور	حج صادق	۱۹۳۵ء
۲۴۔	عبدالمجیدخان	کلیدِ جنت	۱۹۳۶ء

۲۔ یورپ اور دوسرے ممالک کے سفر نامے:

نو آبادیاتی عہد کے اوائل ہی سے برصغیر میں یورپی ممالک کی سیرو سیاحت کا رجحان پایا جاتا ہے۔ کیونکہ اس عہد

میں تمام علومِ نو اور سائنسی ایجادات مغرب سے آرہے تھے اور مغرب نے کچھ ہی عرصے میں نہ صرف ملکی سیاست بلکہ برصغیر پر بھی دور رس اثرات مرتب کیے۔ ۱۷۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد نہ صرف مغل سلطنت کا خاتمہ ہوا بلکہ اس کے ساتھ ہی مشرقی تہذیب و معاشرت زوال آمادہ ہوگئی۔ ہندوستان کا صدیوں کا جادوئی سحر اپنا اسرار کھو بیٹھا اور اس کی جگہ مغربی تہذیب کا علوم اور سائنسی ایجادات باعث کشش بن گئیں۔

برصغیر پر اس مغربی غلبے نے لوگوں میں یورپ کی سیروسیاحت اور عجائبات سے مستفید ہونے کا شوق بیدار کیا۔ اس شوق میں دوطرح کے لوگ شامل تھے ایک تووہ جو صرف انگریزوں کے خیرخواہ یا ان کی تہذیب سے متاثر ہوکر سیاحت پر مجبور ہوئے تھے اور دوسرا وہ گروہ جن کا مقصد یورپ جاکر وہاں کے نظام تعلیم، اصول تدریس اور سیاسی و سماجی صورت حال کا جائزہ لے کر اپنے ملک کی تبدیلی کے خواہاں تھے۔ ان سیاحوں نے اپنے اپنے مقاصد کے تحت یورپ کا سفر کیا اور لوگوں کو وہاں کی طرز بودوباش اور رسم و رواج، رہن سہن اور عجائبات یورپ سے متعارف کروانے کے لیے سفر نامے تخلیق کیے۔ وہ سفر نامے یہ ہیں۔

	مصنف	**سفرنامہ**	**سن اشاعت**
۱۔	سرسیّد احمد خان	مسافرانِ لندن	۱۸۶۹ء
۲۔	منصب علی حاجی	ماِ مغرب	۱۸۷۶ء
۳۔	مولوی سمیع اللہ خان	سفرنامہ لندن	۱۸۸۰ء
۴۔	راما شنکر	آئینہ سکندری	۱۸۸۷ء
۵۔	نواب محمد عمر خان	فرہنگ فرنگ معہ آہنگ فرنگ	۱۸۸۹ء
۶۔	مرزا نثار علی بیگ	سفرنامہ یورپ	۱۸۹۰ء
۷۔	نواب محمد حامد علی خان	سیرِ حامدی	۱۸۹۲ء
۸۔	نواب محمد عمر	قندِ مغربی	۱۸۹۳ء
۹۔	نواب محمد عمر	سفرنامہ آئینہ	۱۸۹۵ء

		فرنگ	
۱۰۔	ڈاکٹر سیّد محمد شاہ علی سبزواری	خوفناک دنیا	۱۸۹۹ء
۱۱۔	منشی محبوب عالم	سفرنامہ یورپ	۱۹۰۰ء
۱۲۔	ناذلی رفیعہ سلطان	سیر یورپ	۱۹۰۸ء
۱۳۔	ڈاکٹر محمد حسین	سفرنامہ جاپان	۱۹۰۸ء
۱۴۔	سربلند جنگ بہادر بیگم	دنیا عورت کی نظر میں	۱۹۰۹ء
۱۵۔	حید اللہ سربلند جنگ بہادر	سفرنامہ قسطنطنیہ	۱۹۱۰ء
۱۶۔	خواجہ غلام الثقلین	روزنامچہ سیاحت	۱۹۱۲ء
۱۷۔	شاہ بانو	سیاحت سلطانی	۱۹۱۵ء
۱۸۔	قاضی عبد الغفار	نقشِ فرنگ	۱۹۳۱ء
۱۹۔	عطیہ فیضی	زمانۂ تحصیل	۱۹۲۲ء
۲۰۔	شوکت عثمانی	میری روس یاترا	۱۹۲۲ء
۲۱۔	پنڈت ٹھاکردت	سیرِیورپ	۱۹۲۴ء
۲۲۔	یعقوب	مشاہداتِ عرفانی	۱۹۲۵ء
۲۳۔	بیگم ہمایوں مرزا	سفرنامہ یورپ	۱۹۲۶ء
۲۴۔	مسٹر ولی محمد	سفر یورپ	۱۹۲۶ء
۲۵۔	نواب محمد ظہیر الدین	سیاحت نامہ	۱۹۳۳ء
۲۶۔	بدر الدین شکیب	یورپ کے تاثرات	۱۹۳۵ء
۲۷۔	خواجہ احمد عباس	مسافر کی ڈائری	۱۹۳۸ء
۲۸۔	ہارون خان شیروانی	یورپ جنگ سے پہلے	۱۹۴۴ء
۲۹۔	سر رضا علی	اعمال نامہ	۱۹۴۴ء

۳۔ علاقائی سفر نامے / اندرون ملک کے سفر نامے:

۱۸۵۷ء کے بعد سفری سہولیات کی دستیابی سے جہاں یورپ اور مشرقی ممالک جانے کا رجحان بڑھا، وہیں اندرون ملک بھی سیروسیاحت کو تقویت ملی اور سیاحوں نے علاقائی سفر نامے لکھے ۔ یہ سفر نامے ان مشاہدات و تجربات کو بیان کرتے ہیں جو علاقائی سیاحت میں سیاحوں کو پیش آئے ۔ ان سفر ناموں کی تعداد دیگر سفر ناموں سے کم نہیں ہے۔

دوسرے سفر ناموں کی طرح علاقائی سفرناموں کی بھی سماجی و ثقافتی اور تاریخی و مذہبی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے ذریعے اندرون ملک کے شہروں، لوگوں کے رہن سہن ، تاریخی عمارتوں کے متعلق ، ہر صوبے کے موسموں، زبانوں ، پہاڑوں ، ریگستانوں اور دریاؤں کی خوبصورتی کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ برصغیر پاک وہند دنیا کا وہ بڑا اور قدرتی وسائل سے مالا مال ملک ہے جو مختلف تہذیبوں، رسم و رواجوں اور مختلف زبانوں کا مجموعہ ہے اور اس خطے کی سب سے دلچسپ و عجیب بات یہ ہے کہ ہر شہر سے تھوڑے فاصلے پر رسم و رواج ، زبان کا لہجہ اور لباس تک تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اندرونِ ملک کے بہت سے شہر ہیں اور یہ تمام شہر ایک دوسرے سے رہن سہن کے لحاظ سے مختلف ہیں اس لیے یہ سفر نامے بھی دوسرے سفر ناموں کی طرح اہمیت کے لحاظ سے کم نہیں۔

۱۔	مثنوی نادر (غیر مطبوعہ)	نادر	۱۸۲۴ء
۲۔	سیر کشمیر	پنڈت کنھیالال	۱۸۴۷ء
۳۔	باغ نو بہار	سید کریم علی	۱۸۵۰ء
۴۔	سیر المحتشم	نواب غوث محمد خان	۱۸۵۱ء
۵۔	سفر نامہ امین چند	منشی امین چند	۱۸۵۵ء
۶۔	سرورِریاضی	شیخ محمد ریاض الدین	۱۸۶۰ء
۷۔	آئینہ حیرت	مرزا عوض علی بیگ	۱۸۶۶ء
۸۔	سیر دریا	مرزا عوض علی بیگ	۱۸۶۶ء

۹۔	ضمیمہ اودھ اخبار	نواب کلب علی خان	۱۸۷۰ء
۱۰۔	سفرنامہ کشمیر	کنہیا لال	۱۸۸۲ء
۱۱۔	سفرنامہ لالہ جنیدہ رام	لالہ جنیدہ رام	۱۸۸۲ء
۱۲۔	سیّد احمد خان کا سفرنامہ پنجاب	مؤلفہ مولوی سیّد اقبال علی	۱۸۸۴ء
۱۳۔	موج سلطانی	مرزا رئیس بخت	۱۸۸۴ء
۱۴۔	سیاحت کشمیر	سرکار کپور تھلہ	۱۸۹۰ء
۱۵۔	سفرنامہ حضور عالی	نواب محمد بسم اللہ خان	۱۸۹۱ء
۱۶۔	سیر دھلی	حاجی سیّد محمد شاہ اکبرؔ	۱۸۹۳ء
۱۷۔	دہلی اور اس کے اطراف	مولانا عبد الحئ	۱۸۹۴ء
۱۸۔	سیر پنجاب	کرشن پرشاد	۱۸۹۷ء
۱۹۔	سفرنامہ کشمیر	محمد دین فوق	۱۹۰۷ء
۲۰۔	سیاحت ہند	عبد الرحمن امر تسری	۱۹۰۹ء
۲۱۔	سفرنامہ پونا و مدراس	بیگم ہمایوں مرزا	۱۹۱۸ء
۲۲۔	تحفہ بنگال	سندھی خان صفی بجواڑیہ	۱۹۳۰ء
۲۳۔	تذکرہ سیفی	طیب علی شاکر جیل پوری	۱۹۳۰ء
۲۴۔	شاہ اودھ کا حسرت ناک سفر	واجد علی شاہ	۱۹۳۵ء
۲۵۔	سفیر شاہانہ	محمد اکبر علی	۱۹۳۵ء
۲۶۔	سفرنامہ شمیم	پنڈت شیو نرائن	۱۹۳۸ء

۴۔ مشرقی ممالک کے سفرنامے:

مشرقی ممالک کے سفر ناموں میں مصر، شام، ایران، عراق، قسطنطنیہ، چین، برما، افغانستان، وغیرہ شامل ہیں۔ یہ سفر مذہبی رسومات کے علاوہ سیاسی، علمی،یا سیاحت کے لیے کیے گئے ہیں۔ ان ممالک کی سیاحت سے وہاں کی

اقدارو روایات سے ہم آہنگی اور معلومات میں تبادلہ ہوتا ہے۔ بہت سے مندوبین اپنی ثقافت اور ادبی سیمینار میں شرکت کے لیے بھی ان ممالک میں جاتے ہیں۔ ان ممالک کے سفر ناموں میں سیاحوں نے طرزِ معاشرت، تہذیب، اور سماجی حالات کا نقشہ کھینچا ہے۔ عراق، ایران، عرب اور دیگر مشرقی ممالک کی تہذیب سے ہندوستانی تہذیب کا موازنہ کیا گیا ہے۔ ان سفر ناموں سے نہ صرف ملک کی صورت حال ، جغرافیہ، تاریخ، تمدن بلکہ بہادری ہماری اسلامی اقدار اور ثقافت سے قریب تر ہیں توان سے دلی یگانگت کا جذبہ بیدار ہوتا ہے اور ان ممالک میں جاکر اپنائیت کا احساس بھی ہوتا ہے۔ ان ممالک کے سفر نامے یہ ہیں۔

۱۔	مرزا کاظم برلاس	سیر دریا	۱۸۶۷ء
۲۔	محمد حسین آزاد	سیر ایران	۱۸۸۶ء
۳۔	نواب محمد عمر علی خان	سفرنامہ رئیس	۱۸۸۶ء
۴۔	نواب محمد عمر علی خان	فرہنگ فرہنگ	۱۸۹۱ء
۵۔	شبلی نعمانی	سفرنامہ روم و مصر وشام	۱۸۹۲ء
۶۔	عبد الخالق	سیرِ برہما	۱۸۹۲ء
۷۔	سیّد سخاوت علی	پیر پہاڑاسفرنامہ کھٹمنڈو	۱۸۹۶ء
۸۔	حفیظ اللہ	حالاتِ برما	۱۸۹۸ء
۹۔	عبد الغفور	سفرنامہ ملایا	۱۸۹۸ء
۱۰۔	عزلت بیگم صاحبہ	سفرنامہ عراق	۱۹۱۰ء
۱۱۔	مولانا عبد اللہ سندھی	کابل میں سات دن	۱۹۱۵ء
۱۲۔	بیگم ہمایوں مرزا	سفرنامہ عراق	۱۹۱۵ء
۱۳۔	منشی محبوب عالم	سفرنامہ بغداد	۱۹۱۸ء
۱۴۔	سید ابوظفر ندوی	سفرنامہ برما	۱۹۲۱ء
۱۵۔	قاضی ولی محمد کسمنڈوی	اندلس کا سفر	۱۹۲۴ء
۱۶۔	راحیل شرمانیہ	سفرنامہ بلاد مقدس	۱۹۲۹ء

۱۷۔	ڈاکٹر محمد حسین	افغانستان میں مرے اکیس دن	۱۹۲۹ء
۱۸۔	محمودہ عثمان حیدر	مشاہداتِ بلادِ اسلامیہ	۱۹۳۲ء
۱۹۔	سید سلمان ندوی	سیر افغانستان	۱۹۳۳ء
۲۰۔	مولوی محمد عبد العزیز	سفرنامہ بلادِ اسلامیہ	۱۹۳۵ء
۲۱۔	بیگم حسرت موہانی	سفرنامہ عراق	۱۹۳۵ء
۲۲۔	عبد الصمد مارم	سفرنامہ صارم	۱۹۳۸ء

نوآبادیاتی عہد اردو نثر کے لیے بڑا اہم دور ہے۔ اس میں دیگر اصناف کے ساتھ سفرنامے کی صنف کو بھی پذیرائی ملی اور بہت سے ہندوستانیوں نے ذرائع آمدورفت میں آسانی آجانے سے دوسرے خطوں کاسفر اختیار کیا۔ کسی دوسرے خطے یا ملک کا سفر اختیار کرنے کی مختلف وجوہات ہو سکتی ہیں۔ کچھ لوگ حصولِ علم کے لیے ، کچھ تجارت اور ملازمت کے سلسلے میں اور بعض نے سیاحت کی غرض سے سفر کیے اور انھوں نے دوسروں کی رہنمائی اور اپنے تجربات میں لوگوں کو شامل کرنے کے لیے سفرنامے لکھے۔

حوالہ جات

۱۔ سورہ العنکبوت، آیت نمبر ۲۰۔

۲۔ مرزا حامد بیگ، اردو سفر نامہ کی مختصر تاریخ،(اسلام آباد : مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء)،ص۹۔

۳۔ قدسیہ قریشی، اردو سفر نامہ انیسویں صدی میں ،(نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۸۷ء)، ص۲۴۔

۴۔ حفیظ صدیقی، *ابوالاعجاز*، کشاف تنقیدی اصطلاحات، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۹ء)، ص ۱۰۰۔

۵۔ خالد محمود ، اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ،(نئی دہلی: دریا گنج ، ۱۹۹۵ء)، ص ۲۲۔

۶۔ ارشد محمود ناشاد، سفر، سفرنامہ اور فرصت نگاہ، (مشمولہ سہ ماہی، عطاء سالنامہ، ۲۰۱۲ء)، ص۶۰۔

۷۔ انصاری ، سحر، *(فلیپ)*، دھوپ کنارہ،)کراچی: بیلا پبلی کیشنز، ۱۹۸۱ء(، ص ۳۔

۸۔ ویبسٹر سکول ڈکشنری(Webster School Dictionary)،)ایڈیشن ۱۹۸۰ء(، ص ۱۰۹۷۔

۹۔ نگہت ریحان خان، اردو مختصر افسانہ فنی و تکنیکی مطالعہ،)دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۵ء(، ص۱۶۵۔

۱۰۔ فاروقی، احسن، فکشن اور تکنیک، مشمولہ،) کراچی :سیپ،شمارہ ۲۹(، ص ۱۹۳۔

۱۱۔ شفیع عقیل، زندگی بھر کہاں،)لاہور: بک ہوم ، ۲۰۰۶ء(، ص ۹۔

۱۲۔ محمد شہاب الدین، اردو میں حج کے سفرنامے،)دہلی:بھارت آفیسٹ ، س۔ن۔(، ص۴۲۔
۱۳۔ نازلی رفیعہ سلطان، سیرِ یورپ،)لاہور:یونین اسٹیم پریس، ۱۹۰۸ء(، ص ۱ (تمہید)۔
۱۴۔ قدسیہ قریشی، ڈاکٹر، اردو سفر نامے انیسویں صدی میں، ص ۲۶۔
۱۵۔ انور سدید، اردو ادب میں سفر نامہ ،)لاہور :مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۸۷ء(، ص۴۴۳
۱۶۔ طیب علی، عبد الرسول، تذکرۂ سیفی (مرتبہ)،) جبل پور: مطبع نادری ، ۱۹۳۰ء(، ص۳۔
۱۷۔ رحمٰن مذنب،(مقدمہ) اردو میں سفرنامہ از ڈاکٹر انور سدید، ص ۲۰۔۲۱۔
۱۸۔ انور سدید، اردو سفر نامے کی مختصر تاریخ ،ص ۴۱۳۔
۱۹۔ حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز، کشاف تنقیدی اصلاحات، ص ۱۳۔
۲۰۔ گوپی چند نازنگ، ڈاکٹر، ادبی تنقید اور اسلوبیات ، (دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۱۸۸۹ء)، ص۱۵۔
۲۱۔ سید عابد علی عابد، اسلوب،(لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۱ء)، ص ۳۶۔
۲۲۔ روبینہ شاہین، سفر نامے کے بنیادی مباحث، مشمولہ، خیابان،(خزاں۲۰۱۴ء)، ص ۱۷۰۔
۲۳۔ مرزا حامد بیگ، اردو سفر نامے کی مختصر تاریخ ،ص ۹۱۔
۲۴۔ عالی، جمیل الدین، تماشا مرے آگے، (لاہور: غلام علی اینڈسنز، ۱۹۷۵ء)،ص۵۷۔
۲۵۔ مرزا حامد بیگ ، اردو سفر نامے کی مختصر تاریخ ، ص ۳۵۔
۲۶۔ شفیع عقیل، زندگی، پھر کہاں، ص۱۱۔
۲۷۔ وزیر آغا، سفر نامے کی بحث، مشمولہ اوراق, سالنامہ، (لاہور:۱۹۷۸ء)، ص۲۶۵۔
۲۸۔ مرزا حامد بیگ، اردو سفر نامے کی مختصر تاریخ ، ص ۹۔
۲۹۔ مولانا شبلی نعمانی، سفرنامہ روم و مصر وشام، (دہلی: قومی پریس، ۱۸۸۱ء)، ص۴۹۔

۳۰۔ قدسیہ قریشی، اردو سفر نامہ انیسویں صدی میں،ص ۶۴۔
۳۱۔ محمدبرکت علی،آج کل اورسفرنامہ،مرتب۳۲۔
۳۲۔ رحمٰن مذنب،مشمولہ (مقدمہ) اردو ادب میں سفر نامہ، از ڈاکٹر انور سدید اردو ادب میں سفرنامہ،(لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۸۷ء)،ص۲۱۔
۳۳۔ جعفری ، رئیس احمد، (مرتبہ) ، سفر نامہ ابن بطوطہ، (کراچی: نفیس اکیڈمی، ۱۹۶۱ء)، ص۳۔
۳۴۔ قدسیہ قریشی ، اردو سفر نامہ انیسویں صدی میں ،ص ۳۴۵۔
۳۵۔ رفیع الدین، ہاشمی، اصنافِ ادب،(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء)، ص۱۸۸۔
۳۶۔ انور سدید، اردو ادب میں سفر نامہ، ص۴۶۱۔
۳۷۔ تنویر حسین ، پروفیسر ، اصناف ادب اردو، (لاہور: مقبول اکیڈمی اردو بازار، ۲۰۰۹ء)، ص۲۲۹۔
۳۸۔ عبدالرحمان ، مولوی ، خلاصہ تحفہ النظار،(دہلی: جمال پریس، ۱۹۷۲ء)، ص۱۱۔
۳۹۔ قدسیہ قریشی، اردوسفر نامہ انیسویں صدی میں، ص ۴۰۔
۴۰۔ آزاد، محمد حسین، سیر ایران، مرتبہ، آغا محمد طاہر، (لاہور: کریمی پریس، ۱۸۸۶ء)، ص۷۔
۴۱۔ یوسف خان کمبل پوش، عجائبات فرنگ، (لکھنو: مطبع نول کشور، ۱۸۹۸ء)، ص۸۸۔
۴۲۔ انور سدید، اردو ادب میں سفرنامہ، ص۵۲۔
۴۳۔ قدسیہ قریشی، اردو سفر نامہ انیسویں صدی میں ،ص ۱۵۔
۴۴۔ نواب لیاقت جنگ بہادر، سفر نامہ یورپ و امریکہ ، (دکن: ۱۹۴۷ء)، ص ۲۷۹۔
۴۵۔ قدسیہ قریشی، اردو سفر نامہ انیسویں صدی میں ،ص ۷۰۔
۴۶۔ اسلم فرخی، کنارے کی دھوپ مشمولہ دھوپ کنارے ازجمیل زبیری،(کراچی: بیلا پبلی کیشنز، ۱۹۸۱ء)، ص ۱۲۔

۴۷۔ انور سدید، اردو ادب میں سفرنامہ، ص۲۷۔
۴۸۔ نعمانی، شبلی، سفرنامہ روم، و مصر و شام،(دہلی: قومی پریس، ۱۸۸۱ء)، ص۴۹۔
۴۹۔ سر سید احمد خان،، مسافران لندن، (لاہور:مجلس ترقی اردو، ۱۹۶۱ء)، ص۸۔
۵۰۔ تنویر حسین، پروفسیر، اصناف ادب اردو،(لاہور: مقبول اکیڈمی، ۲۰۰۹ء)،ص۲۳۰۔
۵۱۔ امجدعلی شاکر، دو قومی نظریہ: ایک تاریخی تجزیہ، (لاہور: ۲۰۰۹ء)، ص۳۱۔
۵۲۔ غلام حسین ذوالفقار، اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء)، ص۶۹۔
۵۳۔ ایضاً، ص ۷۱۔
۵۴۔ حامدمرزا بیگ، اردو سفر نامہ کی مختصر تاریخ، ص۲۶۔
۵۵۔ نجیبہ عارف، اٹھارھویں صدی کا ایک نادر سفر نامہ روس و چین، مشمولہ، بازیافت ،جلد۲۵،(جولائی تا دسمبر۲۰۱۴ ء)، ص ۵۴۔
۵۶۔ ایضاً،ص۵۵۔
۵۷۔ نجیبہ عارف ، جنوبی ایشیا میں اولین سفرنامہ انگلستان تاریخ جدید، مشمولہ ، بنیاد،(جلد ۵، ۲۰۱۴ء)، ص۱۲۵۔
۵۸۔ نجیبہ عارف، *Indology and South Asia Study*،۲۰۱۴ء، ص ۳۱۔۳۲۔
۵۹۔ انور سدید ، اردو ادب میں سفرنامہ، ص۱۰۷۔
۶۰۔ قدسیہ قریشی، اردو سفرنامہ انیسویں صدی میں، ص ۲۵۵۔
۶۱۔ انور سدید، اردو ادب میں سفرنامہ، ص۵۳۷۔
۶۲۔ مرزا حامد بیگ، اردو سفرنامہ کی مختصر تاریخ، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء)، ص۳۷۔
۶۳۔ جیلانی کامران، حج کے سفر ناموں کی روایت، مشمولہ، ماہ نور، (نومبر۱۹۷۸ء)، ص ۵۱۔

باب دوم

نو آبادیاتی عہد اور اردو سفر نامہ

الف۔ نو آبادیاتی عہد:ایک جائزہ

کسی طاقت ور ملک کا اپنی سرحد سے باہر، کسی دوسرے ملک کی حکومت کو ختم کرکے وہاں اپنی حکومت کو مستحکم کرنا اور مقامی لوگوں کے حقوق کا استحصال کرکے اپنی معیشت کو مضبوط کرنا نو آبادیات کہلاتا ہے۔ اس کے لیے انگریزی میںColonialism اور اردو میں نو آبادیات کی اصطلاح رائج ہے۔ ڈکشنری آف دی انگلش لینگوئج (Dictionary of the English Language)کے انسائیکلوپیڈیا ایڈیشن میں نو آبادیات کے متعلق یہ تعریف درج ہے۔

> The Policy of a nation seeking to acquire, extend or retain overseas dependencies. [1]

اس طرح آکسفورڈ انگلش ڈکشنری (Oxford English Dictionary)کے مطابق نو آبادیات سے مراد:

> A settlement in a new Country .....a body of people who settle in a new locality, forming a community Subject to or connected with their parent state, the Community so formed, consisting of the original settlers and their descendants and successors as the connnection with parent state is kept up. [2]

نوآبادیات کی تاریخ صدیوں پر محیط ہے۔ یہ ایک ایسا منظم نظام ہوتا ہے جس میں کسی غیر ملکی قوم کا دوسری

بیرونی اور نسبتاً غیر آباد ملک میں آباد ہونا، اپنی خوراک و رہائش کا بندوبست کرنا مگر اپنے اصل ملک سے بھی جڑے رہنا نوآبادی نظام ہے۔ اس کی وضاحت انگریزی کی لغت *Longman* میں اس طرح درج ہے۔

> Control by one power over a dependent area of people. A Policy advocating based on such control.[3]

اس تعریف کے مطابق کسی بھی خطے کی محکوم قوم یا کسی بھی ملک پر اقتدار حاصل کرنے کو نوآبادیات کہا گیا ہے جو عام حکومتی عمل سے کسی طرح بھی مختلف نہ ہو۔ اس طرزِ عمل کے بارے میں ایک ماہر ادیبہ Gina Wisker اپنی رائے کا اظہار یوں کرتی ہیں:

> Colonialism means the settlement of people and so the colonization of lands by powers from other, usually economically richer, more powerful lands. [4]

دی انسائیکلو پیڈیاامریکہ *(The Encyclopedia America)* میں نوآبادیات سے مراد یہ ہے:

> بہت سی یورپی طاقتوں نے اپنی آبائی ریاستوں سے معاشی اور عسکری فوائد کے لیے یورپ سے باہر جو

سکونتہ (Settlement)اختیار کی اسے نوآبادیات کہا جائے گا۔ [۵]

کولونیل ازم میں طاقت ورطبقہ کمزوروں پر حاوی ہوتا ہے اور وہ اپنی طاقت کے بل بوتے پر دوسروں کا استحصال کرکے خود کو مضبوط سے مضبوط تر کرتا چلا جاتا ہے۔کولونیل ازم جو تقریباً ہمیشہ امپریل ازم کا نتیجہ ہوتا ہے۔وہ دور دراز خطے پر آبادکاری کو مسلط کرنے کا نام ہے۔ [۶] نو آبادکار خود کو مستحکم اور قابض کرنے کے لیے مختلف حربے استعمال کرتا ہے۔اور اس کی دوصورتیں ہیں یا تو وہ اپنی طاقت سے دوسروں کو کچل کر اپنا مطیع و تابع بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسری صورت میں وہ ملک میں ایسی حکمت عملی اختیار کرتا ہے کہ محکوم آبادی اسے اپنا ہمدرد سمجھیں۔نو آبادیاتی نظام ایک ایسا قابضانہ نظام ہے کہ جس میں محکوم قوم کی ساری صلاحیتیں مفلوج کرکے اسے اپنا دستِ نگربنا کر اپنا مفاد حاصل کیا جاتا ہے۔نوآبادیات کی تعریف کے متعلق مختلف کتب اورلوگوں میں کافی تضاد پایا جاتا ہے۔

کولونیل ازم یا نو آبادیات میں طاقت ور قومیں طاقت کے بل بوتے پر اپنے خاص تجارتی مقاصد کے حصول کے لیے، کسی دوسرے علاقہ پر اپنا تسلط قائم کر لیتی ہیں۔ وہ نہ صرف وہاں کے مقامی باشندوں کو اپنا محکوم بناتی ہیں بلکہ ان کی معیشت ، ثقافت ، زبان و ادب، معاشرہ اور ہر ایک چیز کو اپنے قبضہ میں کرلیتی ہیں۔ ہر چیز کو مکمل طور پر اپنے قبضہ میں کرنے کے بعد سامراجی قوتیں مقامی لوگوں کا استحصال شروع کر دیتی ہیں۔ ایسا کرنے کے لیے وہ اپنی تمام تر طاقت کو بروئے کا ر لاتی ہیں۔

نو آبادیاتی نظام طاقت کے بل بوتے پر قائم کیا جاتا ہے اور محکوم آبادی کو اپنے قبضہ میں مستقل طور پر رکھنے کے لیے طاقت کے نئے نئے حربے استعمال کیے جاتے ہیں اور یہ لوگ اپنا دیرپا تسلط قائم رکھنے کے لیے انہیں ذہنی طور پر غلام بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ محکوم آبادی سے سیاسی، ثقافتی اور ذہنی اطاعت کا تقاضا بھی کرتے ہیں۔ وہ یہ سب بڑی منصوبہ بندی سے کرتے ہیں۔نو آبادکار مقبوضہ علاقہ کے

محکوموں کو حکومتی امور میں مداخلت کی اجازت نہیں دیتے بلکہ انھیں کم تر درجے کی نوکریاں فراہم کی جاتی ہیں اور کچھ لوگ انھیں ایسے بھی مل جاتے ہیں جنھیں یہ لوگ اپنے سامراجی مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کرتے ہیں ، نو آبادیاتی نظام کے متعلق ایڈورڈسعید لکھتے ہیں کہ سامراجیت کا مطلب اپنے تصرف سے باہر کی ، دوردراز اور دوسروں کی زیرِ ملکیت زمین کے متعلق سوچنا، وہاں آباد اور قابض ہونا ہے۔"[۷]

نو آبادیات دراصل ایک نظریہ ہے، ایک رجحان ہے کہ طاقت ور اقوام جب مفتوح اقوام پر قبضہ کر لیتی ہیں اور وہ انھیں اپنا محکوم بنا لیتی ہیں تو وہ ان کے سماجی و سیاسی ، معاشرتی، ثقافتی نظام پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ فاتح قوم محکوم سے ان کا کلچرچھین کر انھیں اپنے رنگ میں رنگ لیتی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ سب سے پہلے وہ لوگ ان کی زبان کی اہمیت ختم کر دیتے ہیں اور مفتوح قوم پریہ احساس ڈالتے ہیں کہ وہ ہی برتر ہیں کیونکہ زبان ہی سب سے بڑا آلہ کار ہے کسی قوم کو اپنے قبضے میں کرنے کا اور وہ زبان تبدیل کرتے ہیں اوروہ ا پنی حکمت عملیوں سے اپنی اقتدار کو وسعت دیتا جاتا ہے۔ایسے عمل میں محکوم آبادی مزاحمت تک کرنے کا حوصلہ کھو دیتی ہے۔ اس طرح وہ قابض قوم کو اپنا آقا تصور کرتے ہوئے اپنی قسمت پر صابر و شاکرہو کر رہ جاتے ہیں۔ ناصر عباس نیر لکھتے ہیں :

> نو آبادیات میں طاقت اور اختیار کو برابر وسعت دینے کی انمٹ پیاس ہوتی ہے۔ مگر یہ صرف سیاسی اطاعت میں اکتفا نہیں کرتی۔ یہ محکوم آبادی سے ثقافتی اطاعت شعاری کا تقاضا بھی کرتی ہے ۔ چونکہ یہ تقاضا سیاسی اطاعت کے مقابلے میں بڑا ہے۔ کہ سیاسی اطاعت میں نئے طرز حکمرانی کے خلاف بغاوت نہ کرنے کا عہد ہوتا ہے، جب کہ ثقافتی اطاعت شعاری کا مطالبہ انسانی وجود کے ان حصوں کو سر تسلیم خم کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ جو صدیوں کے پھیر میں صورت پزیرہوتے، ایک خاص شکل اختیار کرتے، اس کے تحت زندگی اور کائنات سے رشتوں کا

نظام پیداکرنے، علمی وتخیلی سرگرمیوں کو خاص
سمت دیتے اور اجتماعی شناخت قائم کرتے ہیں۔ [۸]

دنیا کے ہر خطے میں بادشاہت ، شہنشائیت اور سامراجی نظام طاقت کے زور پر قابض ہوتے رہے ہیں اور زمانے قدیم سے لے کر آج تک ایک ملک دوسرے ملک پر اپنی حکمت عملیوں اور طاقت کا استعمال کرکے تسلط قائم کرتے رہے ہیں ۔ یہ آبادکار دوسرے ملکوں پر قبضے کرنے کے لیے یکساں نو آبادیاتی حکمت عملی اختیار نہیں کرتے بلکہ ہر دوسری جگہ نئی حکمت عملی اور طاقت کے تصورات الگ الگ ہوتے ہیں ۔ نو آبادیات قائم کرنے کے لیے سب سے پہلے منصوبہ بندی کی جاتی ہے۔ پھر ہر ملک کے مقامی حالات اور زمینی حقائق کے مطابق پالیسیاں بنائی جاتی ہیں اور سامراجیت قائم کرنے کی مختلف تدبیریں اختیار کی جاتی ہیں۔ یہی طاقت کی کشمکش اور مصنوعات کی منڈیوں کی تلاش نے نو آبادیاتی نظام کو جنم دیا۔

جب ہم کرہ ارض پر نو آبادکاری کی شروعات پر غور وفکر کریں تو انسان کی اولین تہذیبی مصروفیات کی ابتدائی حالتوں کو دیکھنا چاہیے کہ ابتدائی انسانوں نے اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے گروہ تشکیل دئیے ، یہ گروہ آپس میں ایک دوسرے کی ذمہ داری ہوتے تھے اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انھیں اپنی بقا کے لیے نئی نئی مہارتوں کی ضرورت پڑی۔ اسی ضرورت کے تحت انسانوں میں سوچنے کی صلاحیت پیدا ہوئی اور وہ زندگی گزارنے کے طریقے ایجادکرنے لگا۔ خوراک انسان کی ابتدائی ضرورت ہے۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسانی ضروریات تبدیل ہونے لگیں اور حصول ضروریات کے لیے گروہوں کا آپس میں اتحاد مجبوری بن گیا۔ [۹]

مطلب یہ کہ انسان کی بقا علیحدہ رہنے میں ناممکن ہے۔ اب مختلف گروہ اپنی ضروریات کے تحت جب آپس میں اکٹھے ہوئے تو ان سب کے درمیان نظم و نسق قائم رکھنے کے لیے ایک طاقت ور سردار کا ہونا ضروری تھا جو ہر گروہ کے فرد کی ضروریات کا خیال رکھتا تھا۔ آپس کے میل ملاپ اور پھیلاؤ سے پھر معاشرے وجود میں آیا۔ اس طرح وقت گزرنے کے

ساتھ ساتھ زندگی کے نظام میں وسعت آئی اور بادشاہ، غلامی، مذہب، ثقافت، سیاست، معاشرت اور مختلف ادارے بننے لگے۔ انسان منزل بہ منزل آگے بڑھتا گیا اور معاشرے مملکتوں میں جب تبدیل ہو گئے تو پھر طاقت اور ملکیت کی بنیاد پر طبقاتی نظام وجود میں آیا۔ اس نظام میں طاقت ور طبقے کمزور طبقے پر حاوی تھا۔ یہ اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتے کرتے دوسروں کے علاقوں پر قبضہ کرنے لگے۔ اسی طاقت کے غلبے کی خواہش نے نوآبادیاتی سوچ پیدا کی۔ سید سبط حسن رضوی لکھتے ہیں:

> سومیراور بابل کے بیوپاریوں نے (اس دور کے) ان خطرات کی پروا نہ کی اور اناطولیہ، سندھ،کفان، مصر اور ایران، مختصر یہ کہ اس وقت کی پوری مہذب دنیا کا استحصال کرتے رہے۔خام مال کی خریداری اور مصنوعات کی فروخت ان کا بنیادی مقصد ہوتا تھا۔ دنیا کی اہم تجارتی منڈیوں میں ان کی نو آبادیاں قائم تھیں۔ [۱۰]

جدید نو آبادیات کا آغاز ۱۵۰۰ء میں اس وقت ہوا جب یورپی اقوام نے افریقہ اور امریکہ میں اپنی تجارتی منڈیوں کے لیے نئے سمندری راستے دریافت کیے اور اس عمل سے طاقت کا محور بری راستوں سے بحری راستوں میں بدل گیا۔ اس دور میں فرانسیسی ، انگریزی، پرتگالی ، ولندیزی، اسپینی قومیں ابھریں اور انھوں نے اپنی طاقت کے بل بوتے پر فتوحات حاصل کرنا شروع کیا۔اس طرح پوری دینا میں قبضہ، فتوحات اور نو آبادیاں قائم ہونا شروع ہوئیں۔

زمانہ قدیم سے ہی ہندوستان بیرونی حملہ آوروں کے لیے کشش کا باعث رہا ہے۔ اس سلسلے میں آریاؤں کی آمد کو خاص اہمیت حامل ہے۔ یہ قوم وقتاً فوقتاً یہاں آکر آباد ہوتی رہی بلکہ سینکڑوں سال تک ان کے قبائل برعظیم میں آکر یہاں کی بودوباش اور زبان پر اثرات ڈالتے رہے۔

ساتویں صدی عیسوی میں اسلام کے جانثاروں نے مغرب میں ایشاکو چک، شمالی افریقہ، ہسپانیہ اور مشرق میں عرب و عجم ، افغانستان کو فتح کرکے وہاں اسلامی تعلیمات کو

رواج دیا۔ اسلامی فتوحات کا یہ عظیم سلسلہ بنوامیہ کے دور حکومت میں کمال کو پہنچااور اس طرح اسلامی سلطنت کی حدود سندھ و ملتان تک پھیل گئی۔ مسلمان عرب فاتحین نے برصغیر میں اسلامی قانون نافذ کیا اور بہت سے غیر مسلموں کے سینوں کو اسلام کے نور سے منور کیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خلافت عباسیہ کے زوال و انحطاط کے بعد بہت سی ریاستیں خود مختار ہوگئیں اور آپس میں برسرپیکار رہنے لگیں۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دوسری طاقتوں کو برعظیم میں عمل حاوی کا موقعہ ملا۔ [۱۱]

سلطان محمود غزنوی نے ۱۰۰۱ء میں ہندوستان پر حملہ کیا اور پنجاب کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگر ے غوری ، خاندان غلاماں، خلجی ، تغلق، خاندان سادات، لودھی اور مغل سلاطین حملے آور ہوتے رہے۔ اور برصغیر میں اپنی نوآبادیاں قائم کرتے رہے۔برصغیر پا ک وہند دریاؤں ، پہاڑوں ، صحراؤں کی سر زمین ہونے کے ساتھ قدرتی دولت سے مالامال خطہ ہے اور یہ زمانہ قدیم سے ہی اپنی زرخیزی ، شادابی اور قدرتی ذرائع رکھنے کی وجہ سے پوری دنیا کے حملہ آوروں کے لیے کشش کا باعث رہا ہے۔ بہت سے سیاح اس کے طلسم کے زیر اثر سیاحت کرنے پر مجبور ہوئے اور انھوں نے اپنے سفر ناموں میں اسکے حسن اور زرخیری کے علاوہ یہاں کی تہذیب ومعاشرت کو بھی عمدہ الفاظ میں سراہا ہے۔

سولھویں صدی عیسوی میں انگریز تجارت کی غرض سے ہندوستان آئے اور انھوں نے اپنی چالاکی سے تجارتی مقاصد کی تکمیل کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے تجارتی حقوق حاصل کیے۔اور انھوں نے مدراس اور سورت میں تجارتی کوٹھیاں بنائیں۔ بھگت سنگھ لکھتے ہیں کہ:

> انگریزوں نے ۱۶۱۲ء میں سورت کے مقام پر اپنی پہلی مستقل چھاؤنی قائم کی اورہندوستان سے گرم مصالحہ،نفیس کپڑا وغیرہ یورپ لے جا کر دولت کمانے لگے۔ انگریزی حکومت کا سفیر(سرتھامس رو) بادشاہ جہانگیر کے دربارپہنچااور اس نے ۱۶۴۱ء میں مدراس کے مقام پر اپنا تجارتی اڈاقائم کرلیا۔ ۱۶۶۵ء میں انگریز بمبئی پہنچ گئے۔ اس طرح مغل بادشاہوں

> سے رعایت لیتے ہوئے وہ ۱۶۹۰ء میں ہگلی دریا کے کنارے مچھیروں کے ایک گاؤں میں پہنچے اور تجارتی مرکز قائم کرلیا۔ یہی گاؤں بعد میں کلکتہ بنا۔[۱۲]

شروع میں انگریزوں کو صرف ہندوستان میں تجارت سے دلچسپی تھی مگر اورنگزیب عالم کی وفات۱۷۰۷ء کے بعد تخت نشینی کے حصول کے لیے مغل شہزادوں میں چھڑی خانہ جنگی نے ملک میں انتشار کی صورت حال پیدا کرکے مغل سلطنت کو کمزور کر دیا اور پھر اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نوابوں اور راجاؤں نے سلطنت کی اطاعت سے انکار کرتے ہوئے اپنی الگ الگ ریاستیں قائم کر لیں ۔ جس سے مغل سلطنت کی شان و شوکت میں بہت کمی واقع ہوئی۔ مرکز کی کمزوری کے سبب ملک میں افراتفری اور انتشار پیدا ہوا، لوٹ کھسوٹ عام ہوا۔ بیرونی حملے آور آئے دن مار دھاڑ اور لوٹ مچاتے ۔ ان حالات کے متعلق ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں:

> ان حالات میں منصب داروں اور امراء نے اپنی حیثیت اور مراعات کو قائم رکھنے کے لیےاور اپنی جاگیروں سے زبردستی و تشدد کے ساتھ ٹیکس وصول کرنے کے لیے اپنی اپنی فوجیں رکھنا شروع کر دیں جو انکی ذات کے ساتھ وفادار ہوتی تھیں مگریہ امراء اپنے فوجیوں کو پابندی سے تنخواہ نہیں دیتے تھے اور ان کی آمدن کے ذرائع مال غنیمت اور لوٹ مار ہوا کرتے تھے۔ تنخواہ کے مطالبہ پر ان سے کہا جاتاتھا کہ فلاں شہر اور گاؤں لوٹ لو۔[۱۳]

ہندو پاک میں خانہ جنگی کی صورت میں بیرونی حملے آوروں کو بھی لوٹ کھسوٹ کرنے کا موقع مل گیا جس سے امن و امان کی صورت حال خراب ہوئی اور لوٹ مار ، ڈاکہ زنی کی وارداتیں عام ہونے لگیں اور معاشرہ خوف و ہراس میں مبتلا ہونے کے سبب سیاست و معیشت بھی تباہ و برباد ہوگئی۔ ا س تمام صورت حال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انگریزوں نے ہندوستان کی اندرونی سیاست میں مداخلت شروع کردی۔ اسی کشمکش کے نتیجے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان میں عسکری ضرورت کا احساس ہوا۔اس صورت حال میں ایسٹ انڈیا کمپنی برطانوی حکومت کو یہ باور کرانے میں

کامیاب ہوگئی کہ اگر کمپنی اپنے مفاد کا تحفظ چاہتی ہے اور ہندوستان میں منافع بخش کاروبار کرنے کی خواہش مند ہے تو اسے سیاسی اور عسکری معاملات میں حصہ لینا پڑے گا۔ اس طرح انھوں نے برطانوی سلطنت کو یہ باور کرایا کہ تجارتی مقاصد کے حصول کے لیے فوجی اور سیاسی غلبہ بہت ضروری ہے۔

برطانوی حکومت نے اس مطالبے کو منظور کرتے ہوئے کمپنی کو ہدایت کی کہ ہندوستان کے مقامی لوگوں کو فوجی تربیت دے کر فوج میں شامل کر لیا جائے اور انھیں تنخواہ ، گھوڑا، علاج معالجہ ، رہائش اور پنشن کی سہولیات دی جائیں۔ اس طرح لوگوں نے بادشاہ کی بجائے کمپنی کا ملازم بننا پسند کیا اور یوں کمپنی کی فوج مقامی ریاستوں کی فوجوں سے ہر لحاظ سے بہتر اور مضبوط ہوگئی۔

انگریزوں کا اب تجارتی لین دین سے زیادہ ہندوستان کے سیاسی اور معاشی نظام میں کنٹرول بڑھنے لگاا ور مختلف ریاستوں میں سازشوں کے ذریعے اقتدار کی لڑائیاں کرانا، ہندوستان کے مالی و سائل پر زیادہ سے زیادہ قبضہ کرنا اور لوگوں سے بھاری لگان وصول کرنا، یہ سب کمپنی کا معمول بن چکا تھا۔ جنگ پلاسی(۱۷۵۷ء) اور بکسر(۱۷۶۴ء) کی لڑائیوں نے انگریزوں کے لیے حاکمیت کے دروازے کھول دیے اور انھیں معلوم ہوگیا کہ اب ہندوستان میں ان کے مقابلے کے لیے ریاست میسور کے علاوہ کوئی قو ت نہیں ہے اور پھرانگریزوں نے ہندوستا ن میں مکمل کامیابی حاصل کرنے اور حکمران بننے کے لیے ریاست میسور (ٹیپوسلطان) اور نظام کے درمیان لڑائی کروائی۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل یوں رقم طراز ہیں :

> پلاسی کی فتح کے بعد بکسر کی لڑائی میں انگریزوں کی فتح نے مغلیہ حکومت یا شمالی ہندکو انگریزوں کا باج گزاربنادیا۔ اب محض جنوبی ریاست حیدر آباد (نظام) مرہٹےاور میسور کے حکمران حیدر علی ان کی راہ میں رکاوٹ تھے لیکن ان میں سے نظام نے انگریزوں کے ساتھ دوستانہ اور مفاہمانہ مراسم کو ترجیح دینے میں عافیت سمجھی۔مرہٹے ان ہی دنوں پانی پت میں احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں اپنی متحدہ

> قوت کھو بیٹھے تھے اور جنوب میں سمٹی ہوئی ایک منتشر قوت کے طور پر باقی رہ گئے تھے ان دونوں کے مقابلے میں ٹیپو سلطان ایک تازہ اور تواناقوت کے طور پر ابھرر ہاتھا۔ [۱۴]

کمپنی کے لیے جنگ پلاسی مالیہ وصول کرنے کا باعث بنی اور دوسرے علاقوں بہار، اڑیسہ اور بنگال میں وہ زیادہ مستحکم اور بااختیار ہوگئے جس کی وجہ سے انگریز سیاسی اور معاشی طور پر مضبوط ہوگئے ۔ اس سے ہندوستان کی سیاست پر گہرے اثرات پڑے۔ انگریزوں نے ٹیپوسلطان کو نظام اور مرہٹوں کی مدد سے شکست دی اور پھر اس بڑے معرکے کو سَر کرنے کے بعد کمپنی کے راستے کی تمام رکاوٹیں ختم ہوگئیں تھیں۔ انھوں نے اپنی عیاری اور عسکری قوت سے ہندوستان کی اہم ریاستوں کو اپنے ماتحت کر لیا تھا۔

ان میں سے کئی ریاستیں ایسی بھی تھیں جن کا فوجی نظام کمپنی کے ذمے تھا اور اس کے تمام اخراجات ریاست ادا کرتی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی فتوحات کو وسعت دینے کے ساتھ ساتھ تجارتی مراعات کے علاوہ بنگال میں ریونیو اکٹھا کرنے کا حق حاصل کرنے کے بعد بنگال کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا اور بنگال میں قحط کی صورت حال پیدا کرد ی جس سے ہزاروں کی تعداد میں لوگ لقمہ اجل بنے۔ [۱۵]

کمپنی کی بدعنوانیوں اور لوٹ مار کی کہانی جب سلطنتِ برطانیہ کے کانوں تک پہنچی تو برطانوی پارلیمنٹ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے معاملات کو سلطنت برطانیہ کی گرفت میں لانے اور اس کو اچھے طور پر چلانے کے لیے ۱۷۷۳ء میں ایک قانون "ریگولیٹنگ ایکٹ" پاس کیا۔ اس ایکٹ کے نافذ ہونے سے ہندوستان میں ایک نئے عہد (نوآبادیاتی)کا آغاز ہوا۔ علی عبداللہ یوسف کہتے ہیں کہ کہیں سے ہندوستان میں (نو آبادیاتی) تمدنی دور کا آغاز ہوا۔ اس سے پہلے پیدا ہونے والے سیاسی اور اقتصادی ہنگامے انگریز بدنظمی کا عہد تھے۔ اہلِ ہند پر اس کے اثرات ظاہر ہونا شروع ہو چکے تھے۔ [۱۶]

ہندوستان اب مکمل طور پر برطانوی نو آبادیات میں شامل ہو چکا تھا اور اب اس پر دیر پاقابض رہنے کے لیے اور

اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے عسکری اور سیاسی طاقت میں مزید اضافہ کرنے کا سوچا گیا۔ انھوں نے اس مقصد کے حصول کے لیے نئی پالیسیاں بنائی اور سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کو اپنے ساتھ شامل کرنے کے لیے انھیں مراعات دیں۔ اس کے ساتھ ساتھ عیسائیت کوپھیلانے کے لیے انگلستان سے مشنری منگوائے تاکہ سب لوگوں کامذہب ایک ہو جائے اور پھر انگریزی حکومت کو کسی بھی قسم کی مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ہندوستان میں کارپوریشن ، میونسپل کمیٹیاں بنائیں، سڑکیں تعمیر کیں، ہندی نظام بنایا، برقی تار کا نظام بہتر بنانے کے ساتھ پولیس کا نظام بھی وضع کیا۔ڈاکٹر خواجہ زکریا ان کے ترقیاتی کاموں کے سلسلے میں کہتے ہیں کہ یہ سچ ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں نے سڑکیں بنائیں، ریل کی پٹریاں بچھائیں، تار برقی کا سلسلہ جاری کیا وغیرہ۔ مگر ان تمام برکات کے اصل مقاصد کچھ اور تھے ضمناً لوگوں کو کچھ اور سہولتیں بھی میسر آگئیں۔ [۱۷]

مسلمان طبقہ معاشی طور پر کمزور سے کمزور تر ہوتاگیا اور ہندوؤں نے انگریزوں کے ساتھ اپنی وفاداری ثابت کرتے ہوئے ملازمتوں اور تجارت میں آگے بڑھنے لگے اور وہ تمام شعبہ ہائے زندگی پر چھا گئے ۔ نو آبادیاتی استحصال کی وجہ سے مسلمانوں کی زمین بنجر ہونے لگی اور ملازمتوں کے دروازے بھی ان پر بند کر دیے گئے کیونکہ انگریزوں نے ملازمتوں کا کوٹہ میں بھی ہندومسلم تفریق کو ذہن میں رکھ کر ترتیب دیا تھا۔ جس کی وجہ سے مسلمانوں میں احساسِ محرومی بڑھ گئی۔ انھوں نے فارسی زبان کی حاکمیت ختم کرنے کے لیے اردو کو سرکاری اور دفتری زبان کے طور پر رائج کیا جس سے مسلمانوں کا لسانی تفاخر اور احساس برتری ختم ہوا۔ نو آبادیاتی دور کا تجزیہ کرتے ہوئے ناصر عباس نیر کہتے ہیں:

> برصغیر کا یہ دور وہ نو آبادیاتی دور تھاجس میں ہندوستان میں انگریزوں کا تسلط مکمل ہو چکا تھااور انگریز اپنے برطانوی تسلط کو مضبوط اور مستحکم کرنے کے لیے یہاں کی آبادی کو اپنےنقطۂ نظر سے دیکھ رہے تھے۔ جس میں وہ دوسری قوتوں کی نسبت مسلمانوں کو اپنا سب سےبڑا حریف اور دشمن سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بطور حکمران

> تعلیم، سیاست اور ملکی وسائل میں مسلمانوں کو کسی قسم کی مراعات دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔
> ۱۸

انگریزوں نے ہندوستانیوں کے ساتھ مختلف حربے استعمال کیے۔ جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ لوگوں میں انکی اپنی تہذیب و ثقافت اور زبان سے بیزاری پیدا کی اور ان کو باور کرایا کہ ان کے زوال کا سبب خود ان کا قدیم نظامِ سیاست اور تہذیبی اقدار ہیں جو کہ جدید انگریزی نظام کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اس طرح نو آبادیاتی نظام نے ہندوستانیوں کے رسم و رواج ، زبان و ادب ، تہذیب و ثقافت اور تعلیمی نظام پر اپنی گہری چھاپ لگانے کی کوشش کی۔ انگریزوں نے لسانی مسائل پیدا کیے۔ فارسی کو دفتری اور سرکاری زبان سے ہٹا کر اردو اور انگریزی زبان کو رواج دیا۔ جب فارسی کی حاکمیت ختم ہوئی تو مسلمان اپنی زبان اور ادبی روایات سے دور ہونے لگے۔ اب جو کبھی حاکم تھے وہ سپاہی بننے پر مجبور ہو گئے، انصاف کا عمل ختم ہو رہا تھا کیوں کہ مسلمان قاضیوں کو عدالتوں سے فارغ کر دیا گیا اور قوانین ایسے بنائے گئے جس میں حاکم اور محکوم کے لیے الگ الگ قوانین تھے۔ اس نظام نے انگریزی زبان اور آمرانہ قوانین لاگو کر کے خود کو ہندوستان میں مستحکم کیا۔

برطانوی حکومت جب دوسرے ملکوں (خاص کر امریکہ) میں اپنی نو آبادیاں قائم رکھنے میں ناکام ہوگئی تو انہوں نے اس کے متبادل کے طور پر ہندوستان کی سرزمین کو غذائی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے منتخب کیا اور لارڈ کارن والس کی اس تجویز پر ہندوستان میں دنیا کا سب سے بڑا نہری نظام متعارف کروایا گیا۔ باری علیگ اس ضمن میں کہتے ہیں:

> انگلستان کو اب امریکہ کے بدل کی ضرورت تھی۔ وزارتِ انگلستان نے مشرق میں اس نقصان کو پورا کرنے کی ٹھانی ۔ انگلستان کو وسعتِ سلطنت درکارتھی، امریکہ یا ہندوستان؟اس سے کیا سروکار؟ امریکی نوآبادی نے اگر انگلستان سے آزادی حاصل کرلی تو کیا ہوا؟ انگلستان نے اب ہندوستان کے پاؤں میں زنجیریں ڈالنے کا عہد کر لیا اس ادارے کی تکمیل

> کے لیے وہی شخص موزوں ہو سکتا تھا۔ جس نے امریکہ کو واشنگٹن کے حوالے کیا۔کارن والس چونکہ جنگِ آزادی کو دبانے میں ناکام رہا تھا۔ اس لیے اسے ہندوستان میں برطانیہ کے لیے ایک وسیع سلطنت قائم کرنے کی غرض سے بھیج دیا گیا۔ [۱۹]

ہندوستان پر مکمل نو آبادی قائم کرنے کے بعد خوراک کی ضروریات پوری کرنے کے لیے زرعی نظام میں تبدیلیاں لائی گئیں۔ جدید مشینری کے استعمال کے ساتھ ساتھ نہروں کا جال بچھا دیا گیا۔ زمین داروں کو زمین کی ملکیت دینے کے علاوہ ہندوستان میں وراثتی جاگیر کا قانون بھی دیا۔جس سے غریب کسانوں کا استحصال ہوا اور اس وجہ سے بنگال اور بہار میں "تیتومیر" اور " دودھومیاں" کی مشہور کسان بغاوتیں ہوئیں۔ یہ بغاوتیں اس لیے پیدا ہوئیں کہ انگریز اپنی پسند کی نقد آور فصلیں نیل، افیون اور پٹ سن کاشت کرواتے تھے جس سے خوراک میں استعمال ہونے والی فصلوں پر توجہ نہ دینے کی وجہ سے قحط کی صورت حال پیدا ہوئی اور بہت سے ہندوستانی موت کے منہ میں چلے گئے۔ اس طرح کسان طبقہ بھی انگریزوں کے خلاف ہوگیا۔

دوسری طرف انگریزوں نے ہندوستانیوں کو اپنے سے کم تر، گھٹیا اور غیر مہذب قوم کہہ کر ان میں احساس کمتری پیدا کرنے کا بھی پروپیگنڈا کیا اور اپنے علوم و فنون کو ان پر تسلّط کیا۔ ایڈورڈ سعید کی رائے میں:

> نوآبادیاتی حکمران، مقامی باشندوں کے ماضی بعید سے دلچسپی یہ ثابت کرنے کے لیے ظاہرکرتے ہیں کہ ان کا کلچر مردہ ہو چکا ہے، وہ معاصر دنیا میں کلچر سے محروم ہیں۔ مقامی باشندوں میں یہ نفسیاتی ایقان پیدا کرنے کے بعد انہیں مہذب بنانے کا منصوبہ شروع کیا جاتا ہے۔ [۲۰]

اس لیے انھوں نے ایسا تعلیمی نظام بنایا جس میں ہندوستانی لوگوں کو نام نہاد مہذب بناکر یورپی مفادات کے قابل بنایا تھا۔ انگریزوں نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے سکول و کالج کھولے اور فورٹ ولیم کالج انہیں مقاصد کی تکمیل کا

شاخسانہ تھا۔ اس کے قیام کا مقصد ہندوستانی زبانوں کے فروغ کی بجائے انگریز افیسروں کو مقامی زبانوں سے آشنا کرانا تھا تاکہ وہ امور سلطنت بہتر طور پر انجام دیں سکیں۔ انھوں نے فارسی زبان کی اہمیت ختم کرکے انگریزی زبان کو فروغ دیا اور ہندوستانیوں کی ثقافت ، زبان، ادب ، اور تمدن سب کو بھلا کر رکھ دیا۔انیسویں صدی میں یورپ میں آزادی کے تصورات کو اجاگر کیا گیا اور فلسفہ، نفسیات اور سوشل ریفارمز کی بڑی تحریکیں چلائی گئیں۔ جمہوریت کو ضروری سمجھا گیا اور عورتوں کو ان کے حقوق و آزادی دی گئی۔ ایسی اصلاحات سے ایک نئی روح پیدا ہوئی جس میں ایک ایسے پلیٹ فارم کی کمی محسوس کی گئی جس کے ذریعے وہ انگریزوں سے اپنے مطالبات منوا سکیں۔ آل انڈیا کانگرس کی بنیاد رکھی گئی اور ایک باشعور طبقے نے اس جماعت کی قیادت سنبھالی۔ اس جماعت کے کوئی سیاسی مقاصد نہ تھے کیوں کہ اس پارٹی کے پہلے چارٹر میں مطالبات اور مسائل کا ذکر ہوا تھا اور چند اصلاحات کی خواہش بھی کی گئی تھی۔ ایک طویل عرصے تک یہ جماعت مطالبات پیش کرتی رہی اور پھر بعد میں جب ہندوستان کے سیاسی اور سماجی رویے میں تبدیلی نظر آئی تو اس جماعت کا نام آل انڈیا نیشنل کانگرس رکھ دیا گیا۔ عبد اللہ ملک لکھتے ہیں :

> انگریز نے انہی ضرورت کے لیے انڈین نیشنل کانگرس جو ایک انگریز افسر مسٹر ہیوم کے ذریعے قائم کی تھی لیکن جیسے جیسے یہ جماعت منظم ہوتی گئی اور ہندوستانیوں کے حقوق کے لیے اس کی آواز میں قدرے کھن گرج آنے لگی تو کچھ انگریز افسروں کو یہ بات کھلنے لگی۔ [۲۱]

ہندوؤں کو اس بات کی تربیت بھی دی گئی کہ کسی ایک پلیٹ فارم سے پیش کیے گئے مطالبات زیادہ پُر اثر اور قانونی ہوں گے۔ برطانیہ یورپ کا ایک عیسائی ملک تھا جس نے اپنا خرچ خود بنا لیا تھا۔ بادشاہ چرچ آف انگلینڈ کا سربراہ ہوا کرتا تھا اور یہاں بہت سے حکومتی طریقے کار رائج تھے۔ انگریزوں کے غیر مساویانہ سلوک نے انہی لوگوں میں رشوت ستانی میں بھی اضافہ کیا۔ اسی وجہ سے ان لوگوں نے مختلف

باتیں بھی سیکھیں جو بعد میں ان کے کام آئیں اور وہاں کے لوگوں کو یہ احساس بھی ہوا کہ وہ اکثریت میں ہیں اور قدیم ترین تہذیبوں کے مالک ہیں اور یہ کہ انہیں انگریزوں سے لڑنا چاہیے۔

بیسویں صدی کے آغاز سے ہی برطانوی حکومت نے مشکلات کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ بنگال میں انتظامی امور ٹھیک طریقے سے نہیں چل رہے تھے جس کے باعث اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ برطانوی حکومت کی بد انتظامی اور سرکاری نظم و نسق کی کمزوری کے باعث یہ فیصلہ لیا گیا تھا کہ ہندوؤں کے سخت ردِ عمل کی وجہ سے انہیں یہ فیصلہ واپس لینا پڑا۔ ۱۹۰۵ء میں جب تقسیم بنگال ہوا تو مسلمانوں کی خوشی کی انتہا نہ تھی کیوں کہ وہ اس فیصلے سے مستقبل میں معاشی و معاشرتی حالات میں بہتری کے آثار دیکھ رہے تھے لیکن ہندوؤں نے ہنگامے شروع کر دیے اور بالآخر برطانوی حکومت کو تقسیمِ بنگال کا فیصلہ واپس لینے کا اعلان کرنا پڑا۔ اسی بنا پر ہندوَ مسلم تضاد میں شدت آئی اور مسلم لیگ متحرک ہو گئی۔ اب ہندوستانی معاشرے میں مذہبی اور قومی تحریکیں بھی اپنی پوزیشن مضبوط کرنے لگیں اور سیاسیات کا لوگوں کی زندگی پہ گہرا اثر پڑنا شروع ہو گیا۔

انگریزوں نے اپنے مفادات کے حصول کے لیے اردو ہندی تنازع کو ہوا دی جس سے لسانی فسادات نے جنم لیا۔ اسی طرح لارڈ میکالے کے تعلیمی نظام سے ہندوستان میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہوا جو سلطنت برطانیہ کے حکومتی امور میں مدرگار ثابت ہوا اور انھوں نے انگریزی نظام تعلیم کو اپنا کر ملازمتوں کے دروازے خود پرواکیے۔ اس نازک موقع پر سر سید احمد خان نے ہندوستان کے مسلمانوں کو جدید تعلیم حاصل کرنے کی تلقین کی اور مسلمانوں کو جدید علوم و فنون سے آراستہ کرنے کے لیے عملی کوششیں بھی کیں۔ سرسید احمد خان کی ردنوآبادیات کے حوالے سے یہی کوشش کم اہمیت کی حامل نہیں کہ انھوں نے مسلمانوں میں قومیت کا تصور پیدا کیا۔[۲۲] احساس کمتری ختم کرکے ان کے اندر ایسا اعتماد پیدا کیا جو تقسیم ہند کا باعث بنا۔

ایڈورڈ سعید نے مغربی طاقتوں کے مشرق میں استبداد اور استعماری غلبے کو بڑی وضاحت اور دلائل کے ساتھ اپنی ایک فکر انگیز کتاب شرق شناسی (*Orientalism*)میں بیان کیا ہے۔ انھوں نے مغربی سامراج کے سائے میں پنپنے والی شرق شناسی کی علمی و تحقیقی کاوشوں ، تحریکوں اور مشرق کے بارے میں مغربی خیالات کا جائزہ لیا ہے۔ ان کے مطابق مغرب نے مشرق پر غلبہ حاصل کرنے اور اپنے اس غلبے کو دوام بخشنے کے لیے مشرق کے بارے میں ایسا علم ایجاد کیا جس میں مشرق کو ہر لحاظ سے مغرب کے مقابلے میں بہت پس اور پس ماندہ کر کے دیکھا گیا ہے تا کہ اہلِ مغرب کی نظروں میں مشرق بے حیثیت، بے ترتیب، بد شکل اور کم علم رہے۔ ایسے علم کو انھوں نے شرق شناسی کے نام سے متعارف کروایا ہے اور ایڈورڈ سعید کے بقول شرق شناسی مفادات کا ایک تانا بانا ہے۔ [۲۳]

یہ مغربی ملوکیت کا حامی علم مشرقی قوموں کے ماضی اور حال کے اپنے سیاسی ایجنڈے کی روشنی میں نئی تعبیر کرتا ہے اور غلاموں کو غلامی پر رضامند رکھنے کے لیے نت نئے منصوبے تیار کرتا ہے۔ اہلِ یورپ نے اپنے نوآبادیاتی نظام کی تشکیلِ نو اور اسے مستحکم بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے مشرق اور اسلام کے متعلق ایک گھٹیا اور کم تر تصور دنیا کے سامنے پیش کیا تاکہ مشرقیوں کو احساسِ کمتری میں مبتلا کر کے انھیں ایک مغلوب قوم بنایا جائے اور پوری دنیا کو ان سے متنفر کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے خود کو ایک اعلیٰ تہذیب یافتہ قوم کہہ کر مشرقی قوم کی تربیت اور انھیں مہذب بنانے کی ذمہ داری لی۔ بقول ایڈورڈ سعید کے شرق شناسی کھوئی ہوئی چیز یا مشرق کے بارے میں یورپی تخیل کا کرشمہ نہیں ہے بلکہ یہ نظریاتی اور مستقل کام ہے جس کو باقاعدہ منصوبہ بندی سے شروع کیا گیا ہے اور جس میں نسل در نسل سرمایہ کاری کی گئی ہے۔ [۲۴]

مشرقی قوم سے متعلق اس قسم کے نظریات کے خاتمے کے لیے شرق شناسی کا علم ضروری تھا تاکہ سب سے پہلے مشرق کو اچھی طرح سے جان لیا جائے اور پھر اس پر مکمل طور پر قابض ہونے کے لیے، مشرق کے متعلق گھٹیا افواہیں

اورادب شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے مغرب والوں نے نہ صرف سیاحت کی بلکہ بہت سے لوگوں سے اس قسم کے کاموں کو کروانے پر مامور کیا گیا۔مشرق کی اصطلاح مغرب والوں کی اختراع ہے۔ اور انھوں نے اس لفظ کو نئے مفاہیم دیے اور اس لفظ کے درپردہ وہ خود کو مشرق کے برخلاف لیتے تھے مگر ثابت یہ کرتے تھے کہ وہ اہلِ مشرق کے خیرخواہ ہیں۔ مشرق پر سب سے پہلے تحقیق کرنے ملک فرانس اور برطانیہ تھے۔ [۲۵]

یورپیوں کے نزدیک مشرق وہ ہے۔ جو متعارف کروایا گیا ہے۔ اور انھوں نے اس علم کو اپنے سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کیا۔ ایڈورڈ سعید نے شرق شناسی کے متعلق اپنی بحث کو مدلل بنانے کے لیے بہت سے شرق شناسی کی کتابوں کا تجزیہ بھی پیش کیا اور مغرب کی مشرق کے بارے میں سوچ کا احاطہ بھی کیا ہے۔ ایک جگہ ایڈورڈ سعید مغربی شرق شناسی لارڈ کرومر کا مشرق کے متعلق نظریہ یوں پیش کرتے ہیں:

> دنیا مغربی لوگ ہیں، مشرقی بھی۔ اول الذکر حکومت کرتے ہیں اور ثانی الذکر کو لازماً محکوم ہونا چاہیے۔ اس کا عام فہم مطلب یہ ہے کہ مشرق ممالک پر مغربی ممالک کو قبضہ کر لینا چاہیے۔ ان کے اندرونی معاملات کی سخت پابندی ہو اور ان کا تن من دھن کسی ایک یا کسی دوسری مغربی طاقت کے قبضہ میں ہو۔ [۲۶]

شرق شناسی میں ایڈورڈ نے نوآبادیاتی اور مابعد نوآبادیاتی صورت حال میں مغرب کی سوچ کا محققانہ اور تنقیدی جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ ان وجوہات کی بھی نشان دہی کی ہے۔ جس سے مغرب میں مشرق کے بارے میں متضاد اور غلط قسم کے تصورات نے جنم لیا۔ وہ مشرقی قوموں کو یہ تلقین کرتے ہیں کہ ان سامراجی نظریات کو رد کر کے ، اپنے ماضی کی مسخ تصویروں کو قبول نہ کریں بلکہ اپنے ماضی کی خود بازیافت کریں۔

ب۔ نو آبادیاتی عہد میں اردو سفر نامہ

نوآبادیاتی عہد میں ذرائع آمدورفت میں آسانی پیدا ہونے سے لوگوں میں سفر کی جانب رغبت بڑھی اور انہوں نے دور دراز کے سفر اختیار کیے۔ ان میں مغرب کے سفر، دیار مقدسہ کے سفر، سیاسی و سفارتی سفر، علمی سفر اور تجارتی و تفریحی سفر شامل ہیں۔ان اسفار سے واپسی پر تمام واقعات و مشاہدات کو سفرنامے کی صورت میں تحریر کرنے کا رواج بڑھا اور بہت سے سفرنامے تخلیق ہوئے۔ یہ عہد سیاسی، سماجی ، ثقافتی اور معاشرتی لحاظ سے بڑا اہم دور ہے۔ اس دور کے سفرناموں کا مطالعہ دراصل اس عہد کے سیاسی وسماجی منظرنامے کا مطالعہ ہے۔

یوں تو ہندوستان میں نوآبادیاتی عہد کی ابتدا سترھویں صدی سے ہو ئی لیکن ہندوستان کو ایک سلطنتِ برطانیہ کی باقاعدہ نوآبادیاتی حیثیت ۱۸۵۷ء کے بعد دی گئی اس کے بعد ہندوستان کے ادب پر مختلف الجہت اثرات اوربہت سی نئی اصناف متعارف کروائی گئیں اور زبان و اسلوب میں بھی تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ اس دور میں مقبول ہونے والی نثری اصناف میں سفرنامے بھی شامل ہے۔ یہ سفرنامے مختلف قسم کے اور مختلف مقاصد کے تحت لکھے گئے تھے۔ذیل میں نوآبادیاتی عہد کے ان سفرناموں کا اجمالی تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ دیار مقدسہ کے سفر:

مذہب انسانی زندگی کا اٹوٹ انگ ہے اور اس میں کچھ فرائض ایسے ہوتے ہیں جن کا ادا کرنا انتہائی ضروری ہے۔ ہر عقیدے میں ادائیگی فرض کے طریقے مختلف ہیں جیسا کہ مسلمان دن میں پانچ بار نماز ادا کرنے کے لیے مسجد میں اکٹھے ہوتے ہیں، یہودیوں کے ہاں صرف اتوار کے دن بڑے اجتماعات منعقد ہوتے ہیں، سکھ اور ہندو دن میں ایک بار اپنی اپنی عبادت گاہوں میں جاتے ہیں۔ اسی طرح عیسائی بھی گرجا

گھر حاضری دیتے ہیں ۔ ان روز کے فرائض کے علاوہ بھی سال میں کچھ ایسے تہوار آتے ہیں جنھیں ہر مذہب کے لوگ بڑے جوش و خروش اور عقیدے سے مناتے ہیں۔یہ تہوار نہ صرف بندے کا اپنے معبود کے سامنے سربسجود ہونا ثابت کرتے ہیں بلکہ ان سے لوگوں کو آپس میں میل ملاپ بھی بڑھتا ہے۔ اور باہمی یگانگت، اخوت، بھائی چارہ او راتحاد کاد رس بھی دیتے ہیں۔ ان تمام مذہبی فرائض کا اصل مدعا و مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ لوگوں میں اتفاق و محبت کاجذبہ بیدار ہو۔

بعض مذہبی فرائض کے لیے غیر ملکی سفر بھی کرنے پڑتے ہیں جیسا کہ فریضہ حج کے لیے مکے و مدینے ، زیارت کربلا وعراق و شام جانا، اسی طرح سکھ بھی اپنے گرو نانک کی یاترا کے لیے جاتے ہیں ۔ ان اسفار میں مسافروں کو بہت سی مشکلات سے گزرنا پڑتا تھا کیونکہ ابتدائی زمانوں میں سفری سہولیات ناپید تھیں۔ لوگ قافلوں کی صورت میں مہینوں سفرکرتے تھے اور راستے کی صعوبتیں بعض اوقات جان لیوا بھی ثابت ہوتی تھیں۔ اس لیے ان مقدس سفر پر جانے والے زائرین نے لوگوں کو راستے کی مشکلات سے آگاہ کرنے کے لیے شروع شروع میں معلوماتی گائیڈ بک لکھیں اور یہیں سے سفر نامے لکھنے کا رجحان پروان چڑھا۔ اب ان دیار مقدسہ کے سفر ناموں سے بہت سے معلومات مثلاً دعائیں، راستے کی تیاری کا سامان، وہاں کا موسم، ملک کا جغرافیہ، راستے کی مشکلات وغیرہ وغیرہ حاصل ہوتی ہیں۔ اس لیے یہ سفر نامے زائرین اور حجاج کرام کی راہنمائی میں بڑے مددگار ثابت ہوتے ہیں اب ہم ان دیار مقدسہ کے سفر ناموں کا سرسری کا جائزہ لیتے ہیں۔

نواب سکندر بیگم والئی بھوپال نے ۱۸۶۱ء میں سفر حج اختیار کیااور تاریخ وقائع حج اس سفر کی یادگار ہے۔ اس سفر نامے کی اہمیت اس لحاظ سے بھی زیادہ ہے کہ یہ بھوپال کی خاتون حکمران کا پہلا سفر نامہ ہے۔ اس میں حج کے مقدس فریضہ کے علاوہ مختلف زیارت گاہوں کی تفصیلات بھی ملتی ہیں یہ سفر نامہ غیر مطبوعہ ہے اور اس کا ایک قلمی نسخہ رضالائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔اس سفرنامہ کا ۱۷۸۰ء میں ترجمہ کیا گیا ۔ [۲۷]

سفر نامہ سعادت دارین حاجی فریدالدین نے ۱۸۷۱ء میں لکھا ہے۔ انھوں نے اپنے اس سفر نامے میں ، سفر کی اہمیت، دوران سفر دواؤں کا استعمال ، ضروری اشیاء اور زائرین کی رہنمائی کے لیے نقشے بھی شامل کیے ہیں۔حاجی محمد زردارخان نے اپنے سفر نامہ حرمین میں حج کے واقعات کے علاوہ مختلف مقامات کے نقشہ جات اور آنحضور کے اسماء شریف بھی تحریر کیے ہیں۔ اس سفر نامے کو مطبع نول کشور نے ۱۸۷۳ء میں شائع کیا۔ منبع الحرمین مولوی محمد ایزدبخش کا دوجلدوں پر مشتمل حج نامہ ہے۔ اس کی پہلی جلد منبع الحرمین ۱۸۸۰ء اور دوسری جلد مفید الدارین کے نام سے ۱۸۸۲ء میں شائع ہوئی مصنف نے یہ سفر نامہ لوگوں کو سفر حج اور آداب حج سے واقف کرانے کے نقطہٗ نظر سے لکھا ہے۔

ایک سفر نامہ سید محمدجو نپوری نے تبصرہ المومنین بلقب رفیق الزائرین کے نام سے ۱۸۸۲ ء میں لکھا۔ انھوں نے اپنا یہ سفر نامہ روزنامچے کی ہیئت میں تحریر کیا۔ اس میں نجف شریف ، کربلا مصلیٰ اور دیگر مقدس مقامات کو بیان کیا ہے۔

حاجی سید وزیر حسین کا سفر نامہ وکیل الغربا ۱۸۸۴ء میں منظر عام پر آیا۔ انھو ں نے اپنے سفر حج کے حالات و واقعات کو لوگوں کی رہنمائی کے لیے شائع کیا تا کہ سفر حج پر جانے والے اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اس میں مصنف نے ایک واقعہ اور مکہ و مدینہ کے حالات پر گہری نگاہ ڈالی ہے۔ سفر نامہ رہنمائے حجاج جیسا کہ نا م سے ظاہر ہے حجاج کرام کی رہنمائی کے لیے منشی سید برکت علی نے ۱۸۸۴ ء میں روزنامچے تکنیک میں لکھا ہے۔ اس سفر نامے کو بڑی تحقیق اور تفصیل سے لکھا گیا ہے۔

نواب محمد عمر خان سیرو سیاحت نے بڑے شوقین تھے انھوں نے زادغریب زائرین حج اور زیارات کے سیاحوں کی رہنمائی کے لیے ۱۸۹۰ء میں تخلیق کیا۔ نواب صاحب نے سفر نامے میں عراق و بغداد، روم و مصر اور عرب کی تاریخ کو

پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ ارکان حج اور اسلامی ملکوں کی سماجی و تہذیبی حالات کی عمدہ تصویر کشی بھی کی ہے۔

مولانا محمد حفیظ اللہ کا سفرنامہ عرب مطبع احمد پٹنہ نے ۱۸۹۲ء میں شائع کیا ہے۔ اس میں سفرنامہ نگار نے کافی تحقیق و جستجو کے ساتھ عربوں کی رسوم و عادات، حکمرانِ عربوں کا اپنی رعایا کے ساتھ اچھا برتاؤ بھی پیش کیا ہے۔ اس سفرنامہ کو حج نامہ سے زیادہ عرب کا سیاحت نامہ کہا جا سکتا ہے۔

حاجی علیم الدین کا رسالہ حج حجاج کرام کے لیے ایک رہبر کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ پہلی بار ۱۸۹۲ء میں چھپا یہ سفرنامہ تین حصوں پر مشتمل ہے۔ سفرنامہ زادالزائرین المعروف بہ معین الزائرین کے دو حصے ہیں اسے مرزا قاسم علی نے ۱۹۰۰ء میں تحریر کیا۔ اس میں انھوں نے مختلف زیارات مثلاً کربلائے معلیٰ، مشہد، نجف شریف، خراسان اور ہندوستان کے حالات کو تفصیلاً بیان کرنے کے علاوہ عربی اور فارسی کے اشعار کو بھی استعمال کیا ہے۔

خواجہ حسن نظامی اردو ادب میں بڑی حیثیت کے مالک ہیں انھوں نے دیگر تصانیف کے علاوہ سفرنامہ نگاری میں بھی اپنی قابلیت کا لوہا منوایا اور سفرنامہ تخلیق کیے۔ ان کا حجاز مقدسہ کا سفرنامہ حجاز و مصرو شام جو انھوں نے فلسطین، شام، مصر اور عرب کی روحانی سیاحت کی اور فریضہ حج ادا کیا اور اس سفر کی روداد کو ۱۹۱۱ء میں لوگوں کے سامنے پیش کیا۔

سفرِ حجازمولانا عبد الماجد دریا بادی کا حج نامہ ہے۔ اس سفرنامہ کو ۱۹۲۹ء میں معارف پریس اعظم گڑھ نے مرتب کیا۔ یہ سفرنامہ مصنف کی وارداتِ قلبی کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔منشی امیر احمد علوی نے ۱۹۳۲ء میں سفرِ سعادت کے نام سے اپنے حج کے واقعات کو قلمبند کیا ہے۔ سفرنامہ نگار نے باریک بینی سے سعودی حکومت اور وہاں کے سماجی و اندرونی کیفیتوں کا اظہار بھی کیا ہے۔

محمد حفیظ الرحمن حفیظ نے اپنے سفرِ حج کی قلبی واردات کو سفرنامہ حجاز کے نام سے ۱۹۳۲ء میں تحریر کیا۔ یہ سفرنامہ اپنی صداقت اور عقیدت کا عمدہ فن پارہ ہے۔ اسی طرح محمد شریف امرتسری کا سفرنامہ حج حاجیوں کے لیے ایک مختصر سی گائیڈ بک طرز کا سفرنامہ ہے جس میں انھوں نے اپنے حج کے تاثرات کو روایتی انداز میں بیان کیا ہے۔

پیر محمد غوث قریشی نے اپنے مریدین کی تبلیغ و رہنمائی کے لیے اپنی حج بیتی سفرنامہ غوثیہ کے نام سے لکھی۔ اس میں ہدایت و ضروریات سفر کے علاوہ ارکانِ حجاور احکامِ حج تفاصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ پیر محمد غوث کا یہ حج نامہ لکھنے کا مقصد تبلیغِ دین اور حج کے احکام سے آشنائی کروانا تھا۔ سرگزشت حجازِ مرزا عبد الحلیم بیگ کا لکھا ہوا سفرنامہ ہے۔ا س سفر کی جذباتی کیفیت کو ۱۸۹۵ء میں مطبع نول کشور لکھنؤ سے چھپی۔ اس کو صرف ایک حج گائیڈ کی ذیل میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

ایک اور حج گائیڈ کی طرز کا سفرنامہ سبیل الرشاد ڈاکٹر عبد المجید صدیقی نے ۱۹۳۶ ء میں آراستۂ قلم کیا اس سفرنامہ میں مقصدیت غالب ہے اور روحانی زاویہ دب گیا ہے کیونکہ اسے انجمن پنجاب کراچی نے حجاج کرام کی رہنمائی کے لیے شائع کیا ہے۔ سفرنامہ نگار محمد حفیظ الرحمن کا سفرنامہ رہِ وفا ایک منظوم سفرنامہ ہے۔ انھوں نے اپنا سفر مقدس زیارت گاہوں کے مراکز شام، فلسطین، عراق، مصر سے شروع کر کے حجاز مقدسہ پر ختم کیااور اس روحانی داستان کو ۱۹۳۸ء میں قریشی بک ڈپو علی گڑھ کے تعاون سے شائع کیا ہے۔ محمد حفیظ الرحمن نے حقیقت کو وجدانی صورت دی ہے اور یہ سفرنامہ منظوم سفرناموں میں اہمیت رکھتا ہے۔

نواب صادق بہاول پور جب حجاز کے سفر پر روانہ ہوئے تو محمد عزیز الرحمن عزیز نواب صاحب کے حاجی کیمپ کے نگران تھے اور نواب صادق کے قریب ہونے کی بنا پر انھیں حج کے حالات و واقعات قلمبند کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی

تو اس طرح محمد عزیر الرحمٰن نے اپنے قلم سے مقاماتِ مقدسہ کا احوال بیان کیا۔ اس سفرنامے کے شروع میں نواب خاندان کی تاریخ اور تعریف بیان کی ہے۔ اور یہ سفرنامہ ۱۹۳۵ء میں چھپا۔

مولانا غلام رسول مہر کے سفرنامے کو ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری نے ڈھونڈ کر ۱۹۳۰ء میں مرتب کیا۔ ان کے سفرنامے میں قدیم عمارتوں اور تاریخی مقامات کے ذکر کے ساتھ ساتھ کعبہ شریف اور مکہ کے مضافات کے نقشے بھی ہیں۔

بیگم صغرا ہمایوں حیدر آباد دکن کی ایک روشن خیال خاتون تھیں۔ انھوں نے انیسویں صدی میں بہت سے

کارہائے نمایاں انجام دیے اور وہ انجمن خواتین دکن کی رکن ہونے کی وجہ سے ہمیشہ عورتوں کی فلاح اور حقوق کے لیے کوشاں رہیں۔ انھوں نے تعلیم نسواں اور بیداریِٔ نسواں کی تحریک میں فعال کردار ادا کیا ہے۔ بیگم صغرا نے متعدد سفر کیے اور پھر سفرنامے بھی تخلیق کیے۔ ان سفرناموں میں سے سفرنامہ عراق بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں وہ زیارات کے سفر کے تجربات و مشاہدات کو باطنی کیفیت کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔ یہ سفرنامہ ۱۹۱۵ء میں عورتوں کو بیرونی ممالک کی تہذیب و ثقافت کے ساتھ ساتھ زیارات کی تفصیل کو آشکار کرتا ہے۔

بیگم نشاط النساء اردو ادب کے نامور شاعر حسرت موہانی کی شریکِ حیات تھیں۔ بیگم حسرت ایک تعلیم یافتہ اور آزاد خیال خاتون ہونے کی وجہ سے زندگی کے ہر سفر میں اپنے شوہر کے ہم قدم رہیں۔ انھوں نے برصغیر کی جدوجہد آزادی میں مولانا حسرت موہانی کے ساتھ مل کر خدمات انجام دیں۔ انھوں نے بہت سے سفر کیے اپنے ان اشفار کی روداد کو سفرناموں سفرِ حجازاور سفرنامہ عراق میں بیان کیا ہے۔

محمودہ عثمان حیدر نے اپنے شوہر سیّد عثمان حیدر کے ساتھ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۲ء تک کے مشرقِ وسطیٰ کے سفر کو اپنے سفرنامے مشاہداتِ بلادِ اسلامیہ میں پیش کیا ہے۔ یہ

سفرنامہ مقدس زیارت گاہوں کے بارے میں بڑی اہم معلومات فراہم کرتا ہے۔

اسی طرح راحیل شروانیہ نے اپنے مقدس سفری کوائف کو سفرنامہ بلاد مقدس (۱۹۲۹ء) اور بیگم عزلت صاحبہ نے سفرنامہ عراق (۱۹۱۰ء) میں اپنی باطنی کیفیات اور مشاہدات و حالات کو پیش کیا ہے۔

۲۔ علمی سفرنامے:

اردو ادب میں اب تک جو بھی سفرنامے تخلیق کیے گئے ہیں وہ مختلف موضوعات کے اور مختلف مقاصد کے تحت کیے گئے اسفار کا احوال پیش کرتے ہیں جیسا کہ بعض صرف سیر و سیاحت، کچھ کا مقصد مقاماتِ مقدسہ کی زیارت، کچھ تجارت، کچھ سفر سیاسی نوعیت کے تھے اور کچھ علمی خزانوں کی تلاش میں دوسرے ملکوں کی خاک چھانی گئی۔ ان مقاصد کے تحت بہت سے لوگوں نے دوسرے خطوں کا سفر اختیار کیا اور پھر سفرناموں کی صورت میں اپنی یادداشتیں لوگوں کے سامنے پیش کیں۔

نوآبادیاتی عہد میں مغرب سے اکتسابِ علم کرنے کی روایت کو تقویت ملی اور دیگر مشرقی ممالک کے سفر علمی مقاصد اور اپنے ملک و ملت کی تعمیرِنو اور بھلائی کے لیے کیے گئے ۔ اس لیے ہر سفرنامے میں واقعات و حالات کی صداقت کے ساتھ ساتھ علمی طلب بھی نظرآتی ہے۔ سفرنامہ نگار بیرونِ ملک جب کسی علمی و ادبی شخصیت اور علمائے کرام سے ملاقات کرتا ہے تو ان کی اخلاقی اور علمی گفتگو اور زندگی کو بھی سفرنامے میں پیش کردیتا ہے تاکہ دوسرے بھی ان کے علمی کاموں اور کتب خانوں سے واقف ہوں۔ اس ذیل میں ہم سفرناموں کا جائزہ لیں گے۔

سفرنامہ مسافرانِ لندن سرسید احمد خان کے علمی اور تحقیقی سفر کی روداد ہے۔ انھوں نے یہ سفر اپنے بیٹے سید محمود کے ہمراہ کیا اور یہ سفرنامہ ۱۸۶۹ء میں چھپا۔ سرسیّد نے سفر کرنے کا اصل مقصد انگلستان کے نظامِ تعلیم ، معاشرت، تہذیب سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد انھیں اپنے ہم

وطنوں سے متعارف کروانا تھا۔ اُن کا یہ سفرعلمی سفر تھا اور انھوں نے ایسی معلومات جمع کرنے کی کوشش کی جو ہندوستان کے لوگوں کے علمی تقاضے پورا کر سکے۔

سرسیّد احمد خان کا ایک اور سفرنامہ سفرنامۂ پنجاب ہے۔ جسے ۱۸۸۴ء میں سید اقبال علی نے مرتب کیا۔ یہ سفرنامہ سرسید کی تقاریر پر مشتمل ہے۔ جو انھوں نے پنجاب میں مسلمانوں کی تعلیم کے سلسلے میں کی تھیں۔ وہ مسلمانوں کو انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی تلقین کرتے ہیں تاکہ وہ زندگی کے میدان میں کسی طور پیچھے نہ رہیں۔ ان کا سفرنامہ پنجاب قومی و علمی مفاد کو پیش کرتا ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد کا سیر ایران ان کی دلچسپ تقریر اور روزنامچے پر مشتمل ہے۔ اُن کا سفرنامہ، ان کی وفات کے بعد آغا طاہر نبیرہ نے ۱۸۸۶ء میں مرتب کیا۔ مولانا نے علمی مقاصد کے لیے ۱۸۸۵ء میں ایران کا سفر کیا اور سات ماہ کی سیاحت کے بعد لاہور آنے کے بعد سفر کی روداد ایک جلسے میں سنائی اور آزاد کی تقریر بڑی دلچسپی سے سنی گئی۔ مولانا آزاد نے ایران کا سفر لغت کی تیاری کے سلسلے میں ، کتابوں کی تلاش میں کیا۔ اس لیے انھوں نے وہاں بہت سے علماء سے ملاقاتوں کے علاوہ ایران کے مختلف کتب خانوں سے بھی معلومات اور کتابیں اکٹھی کیں۔ اس حوالے سے اس سفر کی نوعیت علمی تھی اور سفرنامے سے یہ تمام باتیں آشکار ہوتی ہیں۔

علمی سفر کے حوالے سے مولانا شبلی نعمانی کا سفرنامہ روم و مصر و شام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ یہ سفرنامہ ۱۸۹۴ء میں شائع ہوا۔ مولانا نے یہ سفر خالص علمی اور تعلیمی مقصد کے تحت کیا۔ اس سفرنامے میں انھوں نے وہاں کی تحریکوں اور اداروں کے متعلق تفصیل سے تحریر کیا ہے۔ مولانا شبلی مختلف جامعات گئے اور وہاں کے علماء و فضلاء سے ملاقات بھی کیں۔ ترکی کے نظامِ تعلیم کا بھی جائزہ لیا۔ ان تمام حالات و واقعات کی تفصیل کو بیان کیا۔ مولانا عبد الحئ نے ۱۸۹۴ء میں علم دینی کی غرض سے سفر کیا تھا اور ان کے سفرنامے میں دہلی کے گردو نواح کی تاریخی عمارتوں

کے متعلق، اس دور کی ممتاز علمی ہستیوں سے ملاقات کرنے اور علمی معاملات پر تبادلۂ خیال کرنے کا تفصیلی ذکر پایا جاتا ہے۔ زمانۂ تحصیل عطیہ فیضی رحمین اُس سفر کی یادگارِ جب وہ سرکاری وظیفہ پر تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے گئی تھی۔ یہ سفرنامہ اُن کے خطوط سے مرتب شدہ ہے جو عطیہ نے اپنی بہن زہرہ بیگم کو لکھے تھے اور زہرہ بیگم نے ان خطوط کو سلسلے وار سفرنامہ کی صورت میں تہذیب نسواں میں برصغیر کی خواتین کے لیے شائع کرواتی رہیں۔ کتابی صورت میں ۱۹۲۲ء میں شائع کیا گیا اور یہ سفرنامہ ڈائری کی تکنیک میں ہے۔

محمد بدر السلام فضلی کو ٹوکیو یونی ورسٹی کی طرف سے اردو اور فارسی کا پروفیسر مقرر کیا گیا اور محمد بدر السلام اپنے تدریسی فرائض کی انجام دہی کے لیے جاپان میں قیام پذیر رہے تو انھوں نے اپنے اس تجربہ میں دوسروں کو شامل کرنے کے لیے اپنا سفرنامہ "حقیقت جاپان" ۱۹۳۰ء میں تخلیق کیا۔ سید سلمان ندوی نے ۱۹۳۳ء میں افغانستان کا سفر کیا اور سیرِافغانستان کے نام سے سفرنامہ لکھا۔ ان کے اس سفر کا مقصد افغانستان میں تعلیمی اصطلاحات کا جائزہ اور علمی اکابرین سے ملاقاتیں کرنا تھا۔ اس لحاظ سے یہ سفرنامہ تعلیمی نوعیت کا ہے اور انھیں مشاہدات و واقعات کا بیان اس سفرنامہ میں ملتا ہے۔

آغا محمد اشرف نے اپنے سفرنامہ دیس پردیس ۱۹۳۹ء میں لکھا جب وہ لندن یونی ورسٹی میں استاد کے فرائض انجام دینے گئے تھے۔ وہاں ان کا قیام تقریباً چار سال رہا۔ آغا محمد اشرف نے روایتی اور رسمی سفرنامہ سے انحراف کرتے ہوئے سفر کے حالات و واقعات کو پہلے مضامین کی صورت میں شائع کیا اور بعد میں انھیں اکٹھا کر کے سفرنامہ کی صورت دی۔ یہ مضامین سفرنامہ کے ابواب لگتے ہیں۔ انھوں نے اپنے تعلیمی تجربات کو جاندار اسلوب میں پیش کیا ہے۔ مولوی عبد الخالق تبلیغ کی غرض سے برما گئے اور سفرنامہ برما میں اس علاقہ کے مذہبی اعتقادات، رسوم و رواج اور تاریخی و معاشرتی معلومات کو سچائی سے بیان کیا ہے۔

۳۔ سیاسی یا سفارتی سفرنامے:

برصغیر پاک و ہند میں انگریزوں کی آمد نے مغل سلطنت اور ملکی سیاست پر بڑے گہرے اثرات ڈالے۔ ان کی سیاسی چالوں نے کئی سوسالوں کی مغلیہ بادشاہت کو آہستہ آہستہ کمزور کرکے اپنے لیے راستہ ہموار کیا اور وہ کچھ ہی عرصے میں تخت وتاج کے بلا شرکت غیرے مالک بن گئے۔

پورے ملک کے اختیارات سنبھالنے کے بعد انھوں نے ملک میں نئی اصلاحات نافذ کرنے کے ساتھ ترقیاتی کاموں کا بھی جال بچھا دیا، نہری نظام، ڈاک خانے، ریلوے نظام، تعلیمی نظام ، حتیٰ کہ تمام نظامِ زندگی کو متاثر کیا۔ ملک میں اپنے خیر خواہ پیدا کرنے کے لیے جاگیریں تقسیم کیں، ملازمتیں دیں اور بھاری رقوم کے عوض سیاسی مقاصد کے لیے لوگوں کو استعمال کیا۔ اس طرح جب آقا اور غلام اپنے اپنے مفادات کی ڈور میں بندھے ہوں تو تعلقات کی نوعیت کیا ہوتی ہے۔ وہ ہم سب جانتے ہیں اور سیاسی کھیل برصغیر کی سرزمین پر کھیلاجانے لگا۔

امورِ سلطنت کی انجام دہی کے لیے انگریزوں کا آنا جانا شروع ہوا مگرکچھ سیاح ہندوستان کے جادوئی سحر میں سیاحت پر مجبور ہوئے۔ ان حالات کے برعکس برصغیر سے جن لوگوں نے سفر کیاوہ سیاحتی نوعیت کا یا پھرزیادہ تر سیاسی مقاصد سے بھر پور تھا۔ یہ لوگ سلطنت برطانیہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر لندن گئے اور اکابرینِ سلطنت سے ملاقاتیں کیں۔ انگلستان کی زندگی کا بغور مشاہدہ کیا اور وہاں کی ایک چیز مثلاً تہذیب و تمدنی زندگی، وہاں کے عجائبات و ترقیاں، سڑکوں بازاروں کی رونقیں ، صنعت و حرفت وغیرہ کا معائنہ کیا اور اپنے سفر ناموں میں ان سب تجربات و واقعات کو پیش کیا۔

ہندوستان سے سیاح جب بیرونی ممالک سفارتی نمائندے بن کے یا کسی اور سیاسی مقصد کے تحت گئے تو انھو ں نے

وہاں کی ہر چیز کوا پنے وطن سے بڑھ کر پایا اور وہ اس سے مرعوب ہوا یا احساس کمتری میں مبتلا ہوتا ہے اور ایسے سفرناموں میں یا تو ستائشی انداز پایاجاتا ہے یا پھر وہ اپنی، ہر چیز کا موازنہ اس ملک سے کرنے لگتا ہے اور یوں دوسرے ملکوں کا رہن سہن، رسم و رواج، جغرافیہ، تاریخ، اور زندگی کے ایک ایک زاویے کو سیاح سفر نامے کی زینت بناتا ہے۔

ریاست جھنجر کے نواب خاندان سے تعلق رکھنے والے نواب کریم خان ۱۸۳۹ء میں بہادر شاہ ظفر کے ایک مقدمے کی پیروی کے سلسلے میں ، ان کے سفیر کی حیثیت سے لندن گئے اور انھوں نے اپنے روز کے معمول کو ڈائری میں باقاعدگی سے لکھااور پھر اس کو وطن واپسی پر سفر نامے کی شکل دی۔ ان کے سفر نامے میں امراء سلطنت ، وزرا و حکماء سے ملاقاتوں کے علاوہ سیاسی سرگرمیوں کی رودار بھی ملتی ہے۔

محمد حسین آزاد ۱۸۶۵ء میں سیاسی مشن پر سیاحت پر گئے۔ وہ ایک سرکاری وفد میں شامل تھے جنھیں انگریز حکومت نے وسط ایشیائی ممالک کے حالات دریافت کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ یہ سفر چونکہ سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لیے کیا گیا تھا اس لیے اس سفر کے حالات کو مولانا آزاد نے صیغۂ رازمیں رکھا۔ اس سفر کے سیاسی مقصد کے متعلق اس سفر نامے کے مرتب آغامحمد اشرف لکھتے ہیں:

> اس وقت روس کی فوجیں ترکستان سے گزرتی ہوئی ہندوستان کی شمالی سرحدوںکی طرف بڑھ رہی تھیں اور وسط ایشاء کی اسلامی ریاسیتں پکے ہوئے پھل کی طرح اس آندھی کے سامنے گرتی جاتی تھیں۔ انگریزوں کو خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ زارِروس کے لشکر ہندوستان کی سرحدوں پر آن پہنچیں گئے۔ [۲۸]

اس سفر کے دوران مولانا آزاد بہت سی مشکلوں اور تکلیفوں سے بھی گزرے۔ مولانا کے اس سفر کی یادوں کو آغا محمد اشرف نے مرتب کرکے اس سفر نامے کو انیسویں صدی میں وسط ایشیا کی سیاحت کے نام سے ہمدرد اکادمی کراچی سے ۱۹۶۰ء میں شائع کیا ہے۔

سید فدا حسین کا سفر نامہ تاریخ افغانستان ان کی دورانِ انگریزی ملازمت مہم جوئی کی داستان ہے۔ وہ انگریزی افواج میں بھرتی ہونے کیوجہ سے کابل پر چڑھائی کی مہم میں شامل تھا اپنے اس سفر کے حالات کو انھوں نے روزنامچے کی تکنیک میں۱۸۵۲ء میں تحریر کیا ہے۔

مسیح الدین علوی کا سفر نامہ سفیراودھ خالصتاً سیاسی سفرکی رودارد پر مشتمل ہے۔۱۸۵۶ء میں واجد علی شاہ نے انہیں اپنا سفر مقرر کرکے اپنی والدہ، بھائی اور ولی عہد کے ساتھ انگلستان روانہ کیا اور اسی سفر کے دوران انہوں نے حج بیت اللہ کی سعادت بھی حاصل کی ۔اس سفر نامہ میں مسیح الدین علوی سیاسی مشین کی تکمیل اور اس سے متعلقہ امور میں مصروف رہے۔

مولانا جعفر تھانسیری کا کالاپانی ان کی سیاسی قید کی داستان ہے۔ مولاناجعفر سید احمد شہید کی تحریک مجاہدین کےسرگرم رکن تھے۔ انگریزوں نے انہیں اپنے لیے خطرہ سمجھتے ہوئے، اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے مقدمہ چلایا اور انہوں نے انگریزوں کا حریت پسندوں پر کئے گئے مظالم اور جزیرے کے رسم ورواج ، جغرفیہ، تاریخ اور تہذیب و معاشرت کو بیان کیا۔

نواب حامد علی خان ریاست رام پور کے نواب خاندان میں سے تھے۔ اس کے ساتھ وہ حکومت انگلستان کے بھی خیرخواہ تھے۔ انہیں انگلستان کے دورے کی دعوت حکومت برطانیہ کی جانب سے دی گئی تھی اور انہیں سفری مراعات بھی انگریز سرکار کے مہمان کی حیثیت سے دی گئی۔ اس سفرسے واپسی کے بعد انہوں نے ۱۸۸۴ء میں اپنا سفر نامہ سیر حامدی تحریر کیا۔

شاہ بانو کا تعلق ریاست بھوپال کے نواب خاندان سے تھا اور انہیں نواب سلطان جہاں بیگم کے ساتھ ۱۹۱۱ء میں یورپ جانے کا موقع ملااور یہ لوگ حکومت انگلشیہ کے مہمان خصوصی بنے۔ان کے اعزاز میں محل میں اور لوگو ں کے ساتھ انہیں بھی مدعو کیا گیااور ان کوخاص لوگوں سے بھی

ملواياگیا۔ شاہ بانو بیگم کو آزادانہ گھومنے کی آزادی نہ تھی بلکہ اس سفر نامے کے زیادہ تر کوائف نواب سلطان بیگم نے فراہم کیے تھے اور انہوں سے سفر نامہ ترتیب دیا۔

حکومتِ برطانیہ نے ۱۹۲۱ء ہندوستان سے تحریک خلافت کے رہنماؤں کا ایک وفد صلاح و مشورے کے لیے بلایا تو ان میں قاضی عبدالغفار بھی شامل تھے۔ وہ اپنے سفر نامے نقش فرنگ میں انگلستان کی سیروسیاحت کے علاوہ مدبرین سے ہونے والی گفتگو کی تفصیلات بھی بیان کرتا ہے۔ ان کا یہ سفر نامہ ۱۹۲۴ ء میں شائع ہوا۔

کابل میں سات دن سیاسی نوعیت کا سفر نامہ ہے۔ مولانا عبیداللہ سندھی کو ۱۹۱۵ء میں شیخ الہند سید حسین احمد نے افغانستان بھیجا۔ انہیں ایک سیاسی منصوبہ دے کر کابل روانہ کیا گیا اور تمام امور خفیہ رکھنے کا حکم تھا۔ چنانچہ ان کے اسلوب پر آزاد روی کا فقدان ہے۔ اس لیے ان کا سفر نامہ صرف سیاسی نصب العین اور حکومتی ارکان سے ملاقات کو بیان کرتا ہے۔ اس سفر نامہ پر خودنوشت سوانح کا انداز نمایاں ہے۔

شوکت عثمانی ایک سیاسی شخصیت تھے اور وہ ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے سرگرم تھے۔ اس جدوجہد میں شامل ہونے کیوجہ سے انگریزوں کے عتاب کا شکار ہوئے۔ اس سے بچنے کے لئے وہ بھاگ کر روس چلے گئے۔ اس سفر میں انہیں بہت سی مشکلات کو بھی برداشت کرنا پڑامگر روس کی سر زمین شوکت عثمانی کے نظریات سے ہم آہنگ تھی۔ اس لیے انہوں نے بڑے ستائشی انداز سے روس کی بودوباش ، رسم و رواج اور معاشرت کو دیکھا ہے۔

خواجہ احمد عباس ایک ادیب و صحافی تھے۔ انہوں نے ۱۹۳۸ء میں ورلڈ یوتھ کانفرس میں نمائندگی کے لئے نیویارک کاسفر کیا اور لوگوں تک اپنے تجربات پہنچانے کے لئے مسافر کی ڈائری تخلیق کیا۔ اس میں انہوں نے ہر ایک منظر اور چیزکو ایک ادیب کی آنکھ سے دیکھا اور پرکھا ہے۔ جو ان کے اس

سفر نامے میں سیاسی عقائد اور نظریات کی جھلک بھی نمایاں ہے۔ اس کاشمار سیاسی سفر ناموں میں ہوتا ہے۔

سر رضا علی برصغیر کی اہم شخصیت میں شمار ہوتے تھے۔ اور ان کے انگریز حکومت سے گہرے مراسم ہونے کی وجہ سے سرکاری حثیت سے یورپ کا سفر اختیار کرنے کا موقع ملا۔ اس طرح کے ایک سفر ۱۹۲۵ء میں وہ ایک سرکاری وفد کے ساتھ جنوبی افریقہ گئے ۔ ان کا سفر نامہ اعمال نامہ انہی اسفار پر مشتمل ہے۔ اس میں افریقہ کی سر زمین سیاسی حالات اور ان کی اپنی ذات کا بیان ہے۔

۴۔ تجارتی یا تفریحی سفرنامہ:

ابتدائی عہد کے سفر نامے دیکھ کر سیاحوں کی ہمت اورحوصلہ مندی کی داد دینا پڑتی ہے۔ کیونکہ اس وقت ذرائع آمدورفت محدود ہونے کی بناء پر سیاح بڑے بڑے مصائب سے دوچار ہوتا تھا اور ان کا سفرمہینوں جاری رہتا تھا۔ دوران ِسفر بہت سی تکالیف سے دوچار ہوتاتھامگر ایک سیروسیاحت کا شوقین ان تمام مشکلات کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے نئی زمینوں کی دریافت میں آگئے ہی بڑھتا جاتا تھا اور نئے منظروں کو سامنے پاکر اس کی خوشی دیدنی ہوتی اور وہ اس خاص کیفیت میں دوسروں کو شامل کرنے کے لیے سفر نامہ تخلیق کرتاہے۔

پنڈت کنہیالال نے ۱۸۴۷ء میں برطانوی سیاح کی بطور گائیڈ سیاحت میں مددکی تھی۔ ونڑیم سیاحت کے شوقین تھے، اسے ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو کشمیری زبان اور وہاں کے رسم و رواج جانتا ہو تو پنڈت کنہیاکو انہوں نے ان تمام خصوصیات پر پورا اترنے کی وجہ سے اپنے لیے بطورگائید منتخب کیا اور کشمیر کی سیاحت کے دوران یہ ان کے ساتھ رہے۔ اور واپسی پر اس کو سیر کشمیر کے نام سے قلم بند کیا۔

منشی امین چند نے۱۸۵۰ ء میں ہندوستان کے مختلف شہروں کی سیاحت کی اور ۱۸۵۹ء میں اپنا یہ سفر نامہ امین چند شائع کیا۔ اس سفر نامہ کے دو حصے میں جس میں انہوں

نے تمام شہرو ں کی تاریخ اور حالت کو تفصیل سے پیش کیا ہے۔ شیخ محمد ریاض الدین امجد نے اپنے سفر نامے میں شاہ جہاں پورے دہلی کا دس روزہ سفرکے واقعات کے بیان کیاہے۔ انہوں نے اس میں دہلی کے بازاروں ، تاریخی عمارتوں ، مزاروں، اور معتبروں کے علاوہ مرزا غالب سے ہونے والی ملاقات کا بھی ذکر کیا ہے۔

موج سلطانی شہزادہ مرزا رئیس بخت کا سفر نامہ ہے۔ آپ بہادر شاہ ظفر کے پوتے تھے اور سیاحت کے بے حد شوقین تھے ۔ انہوں نے اپنے سفر نامے میں ہندوستان کی مختلف شہروں کی سیاحت کو بیان کیا گیا۔ ان کا یہ سفر نامہ ۱۸۸۴ء میں مطبع منشی نول کشور سے شائع ہوا۔ مرزا رئیس بخت کے سفر نامے میں بہت سے عمارتوں، مقبروں، راجاؤں کی تفصیلات پائی جاتی ہیں۔ اس سفر نامے میں مصنف نے اپنی تصویر کی بھی شامل کیا ہے۔ ان کی یہ تصویر اس زمانے کی فن مصوری کے رجحان کا پتہ دیتی ہے۔

نواب بسم اللہ خان نے ۱۸۹۱ء میں ہندوستان کے بہت سے شہروں کا سفرکیا اور اس سفر کے حالات و مشاہدات کو سفرنامہ حضور عالی کے نام سے تحریر کیا۔ نواب صاحب ریاست رادھن پور گجرات کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے اپنے سفر نامے میں دیگر تفصیلات کے علاوہ مشہور مقامات کی تصویریں اور نقشے بھی دئیے ہیں۔

سفر نامہ سیرِریاستیں مرزا کا ظم برلاس نے جزیرہ لنکا کے سفر کے واقعات کوبیان کیا ہے۔ انہوں نے اپنے سفرنامے کا آغاز حمد سے کرنے کے بعد جزیرے کے متعلق ضروری معلومات فراہم کی ہے۔ ان کا یہ سفر نامہ نہایت مختصر مگر معلومات میں جامع ہے۔

نواب حاجی محمد علی خان ریاست محمد گڑھ کے نواب تھے اور سیاحت کے شوقین تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں بہت سے ملکوں کے سفر کیے۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ سفر میں گزرا۔ نواب محمد عمر نے اپنے اسفار کو اپنے ان سفر ناموں سفر نامہ رئیس اور سفر نامہ ارژنگ چین میں

خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ سفر نامہ برہما میں عبدالخالق خان نے برما کی سیاحت کو پیش کیا۔ انہوں نے وہاں کافی عرصہ بسر کیا اور وہاں کی زبان سیکھی۔ ان کا سفر نامہ اس ملک کے حالات، مذہب ،آب و ہوا ، قوم ،خوراک اور ررسم ورواج کو بیان کرتا ہے۔ یہ سفر نامہ پانچویں بار ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا۔ نواب محمد علی خان یورپ سے ہوتے ہوئے مصر، شام، استنبول ، اسکندریہ اور الجیریہ گئے اور اس سفر سے واپسی پر اپنے دوستوں کے اصرار پر سفر نامہ لکھا۔ جس میں انہوں نے عام فہم واقعات بیان کیے اور مبالغے سے اجتناب کیا ہے۔ واقعات کو بیان کرتے ہوئے مزاح کی چاشنی بھی شامل کر دیتے ہیں۔

عجائبات فرنگ اردو ادب کا سب سے پہلا سفر نامہ ہے جس سے یوسف خان کمبل پوش نے ۱۸۴۷ء میں یورپ کی سیاحت کے بعد لکھا۔ سیروسیاحت کا شوق انہیں یورپ لے گیا اور انہوں نے یہ تمام سفر اپنے من کی ترنگ کے ساتھ کیا۔ یوسف خان نے اس سفر نامے میں یورپی تہذیب و معاشرت کو بے حد سراہنےکے ساتھ ساتھ اپنے ملک سے موازانہ بھی کیا ہے۔ ان کا انداز تحریر تصنع اور بناوٹ سے مبرا تھا۔

مولوی محمد سمیع اللہ خان نے ۱۸۸۰ء میں اپنے ساتھیوں حمید اللہ خان، حامد علی خان، محمد رفیع کے ہمراہ لندن کا سفر کیا اس میں انہوں نے لندن کی زندگی کے بہت سے اہم پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ ان کا یہ سفر نامہ لندن ۱۸۸۱ء میں شائع ہوا۔ آئینہ سکندری میں بابو اماشنکر نے انگلینڈ، جرمنی اور فرانس کے حالات بیان کیے ہیں۔یہ سفر نامہ ۱۸۸۷ ء میں منظر عام پر آیااس میں انہوں نے یورپی طرز زندگی کی مکمل تصویرکشی کی۔

مرزا نثار علی بیگ کو یورپ کی سیاحت کا بے حد شوق تھاکیونکہ وہ وہاں کی طرز معاشرت دیکھ کر یہ اندازہ لگانا چاہتے تھے کہ کن وجوہات کی بناء پر یورپ دوسروں ملکوں پر سبقت لے گیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے انگریز دوستوں سے ملاقات بھی کرنا چاہتے تھے۔ دوران سفر انہوں تمام حالات کو

ڈائری میں لکھا اور وطن واپسی پر ۱۸۹۰ء میں سفر نامہ یورپ کے نام سے شائع کیا۔

ڈاکٹر شاہ علی سبزواری کا سفر نامہ خوفناک دنیا ۱۸۹۹ء میں شائع ہوا۔ انہیں سیروسیاحت کے علاوہ شکار کرنے کا بھی شوق تھا۔ اس مقصد کے علاوہ تجارت کی غرض سے بھی افریقہ گئے۔ وہاں انہوں نے جنگلوں میں مہم جوئی کی اور اپنی اس والہانہ کیفیت میں دوسروں کو شامل کرنے کے لیے سفر نامہ لکھا۔

نازلی رفیعہ سلطان ۲۵اپریل۱۹۰۸ء کو نواب سرسیدی احمد خان بہادر، عطیہ بیگم فیضی، علی اصغر بیگ فیضی، سردار سیدی حسن اور ڈاکٹر ہاشم لکھانی کے ہمراہ یورپ کی سیاحت پر روانہ ہوئیں۔ انہوں نے تقریباً چھ ماہ وہاں قیام کیا اور ۱۷اکتوبر ۱۹۰۸ءمیں وطن واپس آئے۔ نازلی بیگم کا سفر نامہ سیر یورپ سے لکھے گئے خطوط ہیں۔جو انہوں نے اپنے عزیز وں کو برصغیر میں لکھے۔ اور ان خطوط کو زہرہ بیگم فیضی نے تاریخ وار مرتب کرکے سفر نامہ کی صورت میں شائع کیا۔

سفر نامہ قسطنطنیہ میں محمد حمید ارشد خان سے بلند جنگ نے نہ صرف اپنے سفری احوال کو بیان کیا ہے۔ بلکہ اپنی باطنی کیفیات کو بھی اچھے لفظوں میں سمو کر پیش کیا ہے۔ ان کے انداز تحریر پر خوشی اور سرشاری کی کیفیت چھائی ہوئی ہے۔ انہوں نے یہ سفر مختلف ملکوں کی سیاحت کی غرض سے کیا۔ روزنامچہ سیاحت میں خواجہ غلام الثقلین نے اپنے سفر روس، عراق، قسطنطنیہ ایران اور عرب کو بڑی بے تکلفی سے بیان کیا ہے۔ خواجہ صاحب کی نگائیں ان چیزوں کا بھی مشاہدہ کرتی ہیں۔ جنھیں ایک عام انسان غیرضروری یا غیر اہم سمجھ کر چھوڑ جاتا ہے۔ اس میں انہوں نے چھوٹی سے چھوٹی بات کا ذکر کیا ہے۔

قاضی ولی محمد کسمنڈوی نے۱۹۲۴ء میں اندلس کا سفر کیا اور سفر نامہ اندلس ان کے تجربات اور واردات قلبی کا بیان ہے۔ اس میں مصنف نے ماضی کی تاریخ کو بھی ڈھونڈنے

کی کوشش کی ہے۔ صغریٰ بیگم ہمایوں اپنے خاوند بیرسٹر سید ہمایوں کے ساتھ یورپ کی سیاحت پر گئی۔ انہوں نے وہاں یورپی تہذیب و معاشرت کا بغور مشاہدہ کیا اور جو کچھ دیکھا اسے اپنے سفر نامہ یورپ میں بیان کیا۔ اس کے علاوہ ابھی انھوں نے سفر نامے تخلیق کیے ہیں۔ پنڈت ٹھاکردت کا سفر نامہ سیر یورپ خطوط کی تکنیک میں لکھا گیا ہے۔ انہوں نے ۱۹۲۴ ء میں مغربی ممالک فرانس، سوئز لینڈ ار لندن کی سیر کی۔ ان کا یہ سفرنامہ ان کے یادگار سفر کی داستان ہے۔

یقوب علی عرفانی نے یورپ اور بلاد اسلامیہ کو مذہبی نقطہ نظر سے دیکھا اور دکھ اور افسوس کی کیفیت سے دوچار ہوئے۔ ان کا سفر نامہ مشاہدات عرفانی ان کی اندرونی کیفیت کا ترجمان ہے۔ وہ پورے سفر نامہ میں تا سف کی کیفیت میں متبلا دیکھائی دیتے ہیں۔ اور ایک سچے سیاح کی آزاد روی سے کو سوں دور ہیں۔ مرزا حسین احمد بیگ رکن میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ جب وہ ایک بیماری میں متبلا ہوئے تو تبدیلی آب و ہوا کے لئیے اپنے دو بھائیوں کے ساتھ ۱۹۳۰ء میں ممالک غیر کی سیاحت پر روانہ ہوئے ۔ انہوں نے اس سفر میں قاہرہ، سوئزرلینڈ، کولمبو، بیت المقدس ، وحی آنا، برلن ، پیرس اور لندن کی ایک ایک چیز کو دیکھا اور چھوٹی سے چھوٹی جزیات کو سفر نامہ میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ اس سفر میں مرزا احمد حسین نے تمام خوش رنگ چیزوں پر نظر رکھی اور سب کو خوش دلی سے بیان کیا ہے۔

سیاحت نامہ کے مصنف نواب محمد ظہیر الدین حیدر آباد رکن کے نواب تھے۔ سیاحت کا شوق انہیں ۱۹۳۳ء میں امریکہ اور یورپ لے گیا۔ اس سفر نامہ میں انہوں نے یورپ کی سماجی زندگی کے علاوہ وہاں کے پارکوں، تھیٹروں، بازاروں کے بارے میں لکھا ہے۔ اس سفر نامہ میں زبان وبیان کی سادگی، روانی اور حقیقت بیان کی ہے۔ نواب لیاقت جنگ بہادر نے یہ سفر سیاحت سے زیادہ تجارتی اور صنعتی دیکھنے اور ان سے تجارتی مراسم بڑھانے کی عرض سے یورپ گئے تھے۔ انہوں نے اس سفر نامہ میں اپنے مقصد کو اسلوب پر غالب نہیں آنے دیا

بلکہ اس سفر نامہ سے مسرت اور تحسیر کا احساس جھلکتا ہے۔

عشرت علی صدیقی نے ۱۹۴۴ ء میں سیاحت کی غرض سے روس کا سفر کیا اور روسی تہذیب و معاشرت کے ساتھ ساتھ وہاں کی عملی زندگی کو بھی آشکار کیا ۔ انہوں نے اس سفر نامہ لینن گراڈتا سمر قند میں اپنے بھر پور مشاہدہ سے وہاں کی ایک ایک چیز کو سمیٹا ہے۔ان تمام سفرنامہ نگاروں میں خواتین کی خاصی تعداد بھی شامل ہے۔

حوالہ جات

۱۔ دی نیو انٹرنیشنل ویبسٹرز کمپری ہنسیو ڈکشنری آف انگلش لینگویج(*The New International Webster's comprehensive Dictionary*

of the English Language)، ۲۰۰۶ء،
(انسائیکلو پیڈیا ایڈیشن)، جلد ۱،
Naples: Trident Reference Publishing
۲ آکسفورڈ ایڈوانس لرنرز ڈکشنری (*Oxford Advance Learners*
Dictionary)، ۲۰۰۴ء، ۷ایڈیشن
۳ لانگ مین ڈکشنری آف انگلش لینگویج (*Longman Dictionary of*
English Language)،۱۹۸۴ء، ص ۲۸۸
۴ کِی کنسپٹس اِن پوسٹ کولونیل لٹریچر(*Key Concepts in Post*
Colonial Literature)، نیویارک: پال گریو میک میلین (Palgrave
Macmillian)، ۲۰۰۷ء
۵ دی انسائیکلو پیڈیا امریکن (*The Encyclopedia*
Emerican)، انٹرنیشنل
ایڈیشن، ص۸۸
۶ ناصر عباس نیر، مابعد نو آبادیات اردو کے تناظر میں،
(کراچی: اوکسفرڈ یونی ورسٹی، ۲۰۱۳)،
ص۷
۷ ایڈورڈ سعید، ثقافت اور سامراج، مترجم: یاسر جواد،
(اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۰ء)، ص۲۰
۸ ناصر عباس نیر، مابعد نوآبادیات، ص ۸
۹ عبد الوحید، عالمی جنگوں کا انسائیکلوپیڈیا،(لاہور:
نگارشات، ۲۰۰۷ء)، ص ۴۲
۱۰ سید سبط حسن، ماضی کے مزار،(کراچی: مکتبہ دانیال،
۱۹۸۷ء)، ص۱۱۹
۱۱ نصیر احمد ناصر، اسلامی ثقافت ،(لاہور: فیروز سنز
لمیٹڈ، ۱۹۸۴ء)، ص ۱۰۱
۱۲ بگے بھگت سنگھ، پنجاب کی سیاسی جدوجہد، مترجم:
یاسر جواد، (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۳ء)،
ص۱۱
۱۳ مبارک علی، تاریخ اور سیاسیات، (لاہور: فکشن ہاؤس،
۲۰۰۵ء)، ص ۶۳

۱۴۔ معین الدین عقیل، فتح نامہ ٹیپو سلطان، (لاہور: گنج شکر پرنٹرز)، ۱۹۹۹ء، ص۱۴۔

۱۵۔ محمد مجیب، تاریخ، تمدن ہند ، (لاہور: پروگریسو بکس، ۱۹۸۶ء)،ص۲۲۔

۱۶۔ یوسف علی عبد اللہ، انگریزی ادب میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ، (لاہور: دوست ایسوسی ایٹس، ۲۰۰۳ء) ، ص۳۸۔

۱۷۔ خواجہ زکریا، اکبر الٰہ آبادی: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ ، (لاہور، ۲۰۰۳ء)، ص ۲۔

۱۸۔ ناصر عباس نیر، مابعد نوآبادیات، ص ۲۲۔

۱۹۔ باری علیگ، کمپنی کی حکومت، (لاہور: سویرا آرٹ پریس، ۱۹۶۹ء)، ص۱۰۴۔

۲۰۔ ایڈورڈ سعید، شرق شناسی (*Orientialsim*)، مترجم: محمد عباس،(اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۲ء)، ص ۴۔

۲۱۔ ملک عبد اللہ، پاکستان کی بنیادی حقیقتیں اور پاکستانی فوج کی ابتدا، (لاہور، ۱۹۸۸ء)، ص ۳۶۔

۲۲۔ مولوی عبد الحق، سرسید احمد خان: حالات و افکار، (کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۹ء)، ص۱۰۴۔

۲۳۔ ایڈورڈ سعید، شرق شناسی، ص ۴۔

۲۴۔ ایضاً، ص ۷۔

۲۵۔ ایضاً، ص ۲۰۔

۲۶۔ ایضاً، ص ۴۱۔

۲۷۔ قدسیہ قریشی، اردو سفرنامہ انیسویں صدی میں ،ص ۷۷۔

۲۸۔ آغا محمد اشرف، سیرِ ایران، مشمولہ: اردو ادب میں سفرنامہ، انور سدید ،(لاہور: قومی پریس، ۱۹۸۷ء)، ص۱۵۱۔

باب سوم

نوآبادیاتی عہد کی خواتین سفرنامہ نگار

برطانوی عہدِ حکومت میں جب ذرائع آمدورفت میں اضافہ ہوا اور سالوں کا سفر مہینوں میں ہونے لگا تو سفر کے رجحان نے تقویت پائی اور ہندوستان کے لوگوں نے سفرِ حج کے علاوہ زیارت و سیاحت کی جانب رختِ سفر باندھا۔ چنانچہ گزشتہ صدیوں کے مقابلے میں بیسویں صدی کے نصف اوّل میں یہ رجحان زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔

برصغیر پاک و ہند میں برطانوی سامراج کے مکمل تسلط کے بعد نہ صرف یہاں کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی نظام میں تبدیلیاں رونما ہوئیں بلکہ تعلیم کی جانب بھی اس قدم نے خصوصی توجہ دی جس کی وجہ سے ہندوستان کے لوگوں میں تعلیم کا رجحان بڑھا۔ خصوصاً سرسیّد کی اصلاحی تحریک نے اس تعلیمی رجحان کی جانب مسلمانوں کو متوجہ کیا اور انھیں جدید تعلیم حاصل کرنے کی طرف مائل کیا۔ ان تمام تبدیلیوں کے اثرات ہندوستانی عورتوں پر بھی مرتب ہوئے اور وہ جدید تعلیم کے لیے کوشاں ہوئیں۔ معاشرے میں تعلیم کی ترقی کی وجہ سے بیداری آئی اور خواتین کو اپنے محدود دائرے سے نکل کر ایک وسیع اور کھلی فضا میں اپنی صلاحیتوں کو منوانے کا موقع ملا۔ اب انھیں گھر کی چار دیواری سے باہر نکل کر دوسرے خطّوں اور ملکوں کی جب سیاحت نصیب ہوئی تو ان خواتین نے اپنے مشاہدات و تجربات میں دوسرے لوگوں کو شریک کرنے کے اسی سفر کے احوال کو تحریری صورت دی تو خواتین کے کئی سفرنامے سامنے آئے۔

اردو میں خواتین کے اولین سفرنامے انیسویں صدی کے اواخر میں لکھے گئے لیکن بیسویں صدی میں خواتین نے کثرت سے سفرنامے لکھے۔ اس میں حج کے سفرنامے، مقامی سفرنامے، زیارت گاہوں کے سفرنامے اور یورپ کے سفرنامے شامل ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ خواتین نے سفر کرنے کے ساتھ ساتھ سفرنامے تحریر کرنے پر بھی خصوصی توجہ

دیے اب ہم درج ذیل سفرنامہ نگار خواتین کے علمی ، سیاسی و سماجی حالات و پس منظر کا جائزہ لیں گے۔

۱۔ نواب سکندرجہاں بیگم

ہندوستان میں جہاں بہت سے نامور لوگ پیدا ہوئے وہاں بعض عورتیں بھی اس بلند مقام و مرتبے پر پہنچیں کہ جنہیں آج کئی صدیاں گزرنے کے بعد بھی دنیا قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ ان عظیم ہستیوں میں ایک نام نواب سکندر بیگم کا بھی ہے۔

نواب سکندر بیگم ۳۱ اگست ۱۸۱۸ء بمطابق ۱۲۳۳ھ کو بھوپال میں پیدا ہوئیں۔[۱] ان کے والد نواب نظر محمد خان کا ان کے بچپن میں ہی انتقال ہو گیا جبکہ سکندر بیگم ابھی ایک سال تین ماہ کی تھیں ۔ انہوں نے ۱۱ نومبر ۱۸۱۹ء کو ایک حادثہ کی وجہ سے وفات پائی۔[۲] انہوں نے اپنی شفیق اور مدبرانہ صلاحیتوں کی مالک ماں (قدسیہ بیگم)کے زیرِ سایہ تربیت پائی اور اس کے ساتھ اُس عہد کے مشہور علماء اور باکمال اساتذہ سےتعلیم حاصل کی۔ ان کی تعلیم و تربیت کے لیے تمام علوم و فنون کے الگ الگ اساتذہ مقرر تھے۔ دیگر فنون کے علاوہ بیگم سکندر کو فن سپہ گری میں بھی مہارت کمال حاصل تھی۔ وہ بڑی بہادر اور جری خاتون تھیں۔ شیر کا شکار ان کا محبوب شوق تھا۔ پولو کھیلنا بھی انہیں پسند تھا جبکہ شمشیر زنی میں بھی انہیں مہارت حاصل تھی۔[۳] انہیں مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ قرآن پاک بھی ترجمے کے ساتھ پڑھایا گیا جس کا اثر نواب بیگم کی شخصیت پر بہت زیادہ پڑا۔ اس کا ثبوت وہ تحریریں اور تقریریں ہیں جس میں وہ برجستہ آیاتِ قرآنی حوالے کے طور پر استعمال کرتی تھیں۔ نواب سکندر بیگم کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے ان کی والدہ (قدسیہ بیگم) اپنے ایک خط میں گورنر جنرل کو تحریر کرتی ہیں کہ میں نے سکندر بیگم کی تعلیم میں بڑی کوشش کی ہے اور وہ عقل و فراست رکھتی ہیں اس لیے انہیں بغیر کسی مداخلت کے ریاست سپرد کیا جائے۔[۴] نواب قدسیہ بیگم اپنی

اکلوتی بیٹی کو مسند ریاست پر فائز دیکھنا چاہتی تھیں مگر نواب نظر محمد خان (والد سکندر بیگم) کی وصیت یہ تھی:

> نظر محمد خان نے میجر ہنری پولیٹیکل ایجنٹ بھوپال اور شہزاد مسیح کو یہ وصیت کی تھی کہ میرے بعد میری بیگم حکومت کریں اور اراکینِ سلطنت مثل میرے ان کی اطاعت کریں، میری بیٹی سکندر بیگم کی شادی ہونے پر ان کا شوہر نواب بھوپال کہلائے۔[۵]

نواب قدسیہ بیگم نے اپنے شوہر کی وفات کے بعد نظامِ حکومت سنبھالی جس میں ان کی مدد کچھ وفادار وزراءِ سلطنت نے کی۔ ان کے دورِ حکومت میں ریاست بھوپال میں بہت سے ترقیاتی کام ہوئے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے خواتین کی تعلیم و بہبود کے لیے بھی عملی اقدامات کیے۔ بیگم قدسیہ کے ذمہ ایک فرض یہ بھی تھا کہ وہ ریاست بھوپال کے لیے کوئی قابل حکمران تلاش کریں اور پھر بالآخر ایسٹ انڈیا کمپنی اور اراکینِ ریاست کے مشورے کے بعد انھوں نے اپنی بیٹی سکندر بیگم کے عقد کے لیے نواب نظر محمد خان کے بڑے بھائی نواب امیر محمد خان کے چھوٹے بیٹے جہانگیر محمد خان کا انتخاب کیا اور نسبت طے کر دی۔ اس وقت جہانگیر محمد خان کی عمر تقریباً آٹھ یا نو سال تھی۔ قدسیہ بیگم نے ان کی تعلیم و تربیت کے لیے قابل اساتذہ مقرر کیے اور انھوں نے کوشش کی کہ جس طرح سکندر بیگم کی تعلیم ہوئی ہے اسی طرح جہانگیر خان کی بھی اعلیٰ تعلیم اور تربیت ہو اور پھر ۱۹۳۵ء میں دونوں کی شادی تو ہو گئی مگر اختلافات کی ایک ایسی سرد جنگ شروع ہوئی جو ۱۸۴۴ء میں نواب جہانگیر کی وفات کے بعد ہی ختم ہوئی۔

نواب جہانگیر خان کی وفات کے بعد نواب شاہ جہاں بیگم ۲۱ جنوری ۱۸۴۵ء میں رئیسہ فرماں روا کی حیثیت سے تخت نشین ہوئیں، مگر اس کے ساتھ ہی جو شرط نواب سکندر بیگم کے لیے مقرر تھی وہ ان کے لیے بھی قائم رہی کہ جس کے ساتھ نواب شاہ جہاں کی شادی ہو گی وہی شخص امیر ریاست ہو گا۔ نواب شاہ جہاں ابھی کم سن تھیں تو اس لیے نواب فوجدار محمد خان جو نواب سکندر بیگم کے ماموں

اور نواب غوث محمد خان کے بیٹے تھے، مختار ریاست مقرر ہوئے۔

ان کے زمانے مختاری میں ریاست کے نظم و نسق میں بدنظمی، انتشار اور سازشیں پیدا ہونے لگیں تو نواب سکندر بیگم نے ان خطرات کو محسوس کیا جو اس صورت حال سے سامنے آنے والے تھے۔ "انہوں نے ریاست کے تحفظ کے لیے اعتراض و احتجاج بلند کیا اور بالآخر جنوری ۱۸۴۷ء میں خودمختار قرار دی گئیں۔[۶] اب اس کے بعد نواب سکندر بیگم نے اپنے دلائل و براہین کی قوت سے آئندہ کے لیے حکومت برطانیہ سے یہ طے کرایا کہ نواب شاہ جہاں بیگم ریاست کی فرماں روا ہوں گی اور ان کے شوہر برائے نام نواب ہوں گے۔ ۱۵ محرم ۱۲۶۳ھ کو نواب سکندر بیگم مختار ریاست اور نواب شاہ جہاں بیگم کی مسند نشینی ریاست کی رسمیں اکٹھی ادا ہوئیں۔[۷] حکمران ریاست بننے کے بعد نواب سکندر بیگم اپنی قابلیت، شب و روز محنت، بیدار مغزی اور فرماں روائی کے مخصوص اوصاف کی وجہ سے تمام مالی و ملکی انتظام و امور کو بہتری کی جانب لائیں۔ انہوں نے فوجی نظام کی اصلاح کرنے کے ساتھ ساتھ فوجی تربیت اور اسلحہ خانے کی طرف خصوصی توجہ دی۔ نواب سکندر بیگم کی اپنی ریاست کے لیے کی گئی خدمات کے بارے میں امین زبیری لکھتے ہیں:

> پولیس کو باقاعدہ بنایا۔ زراعت پیشہ رعایا کو سود خوروں کے ہاتھوں سے نجات دی۔ شہر کی آراستگی پر توجہ کی اور عالی شان عمارات بنائیں۔ تمام ضروری قوانین نافذ فرمائے اور عدالتیں قائم کیں۔ ملک کی پیمائش کر کے بندوبست کیا اور مالگذاری کے قواعد مقرر کیے۔ عام تعلیم کے لیے ہرگاؤں میں اردو، ہندی کے مدرسے قائم کیے، شہر خاص میں عربی، فارسی، انگریزی اور دستکاری و صنعتی تعلیم کے مدرسے جاری کیے۔ رفاہِ عام کے کاموں سے ان کو بہت دلچسپی تھی۔ سب سے پہلے انہوں نے ہی ریاست میں مدارس اور شفاخانے جاری کیے اور بیرون ریاست بھی امداد دینے کا سلسلہ قائم کیا۔[۸]

انہوں نے اپنی مدبرانہ صلاحیتوں سے کام لے کر بھوپال کو ترقی دی اور ساتھ ساتھ اپنے حقوق ووراثت کی جدوجہد بھی

کرتی رہیں کیونکہ وہ مسند ریاست کی اصل حقدار تھیں (نواب نظر محمد خان کی بیٹی تھی) مگر وہ مختار ریاست کے طور پر امور انجام دیتی رہیں ۔ آخرکار یکم مئی ۱۸۶۰ء بمطابق ۱۲۷۶ء کو ۴۳ سال کی عمر میں ، ۱۱ سال مختار ریاست رہنے کے بعد فرمانروائے بھوپال اور اپنے باپ کی جانشین قرار دے دی گئیں۔ طیبہ بی نے نواب سکندر کی ہمت و استقلال کو ان الفاظ میں سراہا ہے:

> سکندر بیگم فطرتاً امن دوست، صلح پسند تھیں۔ اونہوں نے بھوپال اور اہل بھوپال کی اصلاح کو اپنی زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد قرار دیا تھا۔ اس لئے اونہوں نے کسی مشکل کی پرواہ نہ کی اور خدا کی مدد اور اپنی ہمت پر بھروسے کر کے ان تمام رکاوٹوں اور مشکلات پر فتح پائی جو ان کی راہ میں حائل تھیں۔ [۹]

سکندر بیگم کی فہم و فراست، حسن تدبیر اور محنت شب و روز ریاست بھوپال کو استحکام بخشا۔ انھوں نے حکمران ریاست بننے کے بعد پوری ریاست کا دورہ کیا، لوگوں سے ملاقاتیں کیں اور انگریز عمائدین سے سامنے تقاریر کیں۔ وہ غالباً ہندوستان میں پہلی خاتون تھیں جنھوں نے مجمع میں تقاریریں کیں۔ [۱۰] اور غدر کے بعد ان کو جی۔سی۔ ایس۔آئی کا خطاب ملا۔ ان کی کوششوں کی وجہ سے جامع مسجد دہلی میں مسلمانوں کو نماز پڑھنے کی اجازت ملی اور اسے مسلمانوں کے لیے کھول دیا گیا ۔ انھوں نے ہندوستان کی تمام ریاستوں سے پہلے بھوپال ریاست میں فارسی کی بجائے اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا اور اردو زبان و ادب کی سرپرستی بھی کرتی رہیں۔

نواب سکندر بیگم نے امور سلطنت میں استحکام لانے کے بعد حج بیت اللہ کا ارادہ کیا اورریاست کے تمام انتظامات کے لیے ایک کونسل آف ایجنسی قائم کر کے نواب شاہ جہاں کو اس کا صدر نامزد کیا ۔ کونسل کی کاروائی کے لیے ایک ضابطہ کار مقرر کر کے اپنی والدہ نواب قدسیہ بیگم کے ہمراہ ۶ جنوری ۱۸۶۴ء کو حج کے لیے روانہ ہوئیں۔ ان کے ہمراہ تقریباً ایک ہزار مرد و زن کا قافلہ تھا۔ نواب سکندر بیگم کو حکمران ہندوستان میں سے سب سے پہلے حج کی سعادت حاصل کرنے

کا شرف حاصل ہوا۔[۱۱] اس سے پہلے صرف سلطنت تیموریہ کی تاریخ میں گلبدن بیگم (جو کہ اکبر اعظم کی بہو تھیں) کو اس فرض کو بجا لانے کی ہمت ہوئی تھی۔سفر حج کے دوران سکندر بیگم نے ہر چیز کو بڑی سنجیدگی اور غوروحوض سے مشاہدہ کیا اور روزنامچہ لکھتی رہیں اور بعد میں اس کو یادداشت تاریخ وقائع حج کے نام سے تحریر کیا۔

نواب سکندر بیگم حیرت انگیز صلاحیتوں کی مالک اور ایک خاص قسم کے دل و دماغ کی خاتون تھیں۔ وہ اپنی ذہانت اور کمال قابلیت سے ہر کسی کو متحّیر کرنے کی صلاحیت سے مالا مال تھیں۔ انھوں نے ریاست کے شفاخانوں کو وسعت دی۔ سڑکیں، کنویں، تالاب اور مسافروں کے لیے سرائیں بنوائیں، باغات لگائے اور کئی خوبصورت عمارتیں بھی تعمیر کروائیں۔ ان کے دور میں خزانہ بھر گیا اور ریاست قرض سے سبکدوش ہوئی۔

نواب سکندر بیگم محنتی ، جفاکش، دلیر و مدبر حکمران ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سلیقہ منداور ماہر خاتون خانہ بھی تھیں۔ انھیں سلائی کڑھائی میں بھی دلچسپی تھی۔ ایسی باہمت اور قابل حکمران بھوپال نے باون سال کی عمر میں ۳۰ اکتوبر ۱۸۶۸ء بمطابق ۱۲ رجب ۱۲۸۵ھ کو وفات پائی۔

۲۔ نواب سلطان جہاں بیگم

نواب سلطان جہاں بیگم جی سی ایس آئی۔جی سی آئی سی۔ سی آئی جی بی ای سابق فرمانروائے بھوپال، ہندوستان کے پٹھان حملہ آوروں کے ایک نامور خاندان کی اولاد تھیں۔ وہ چوتھی ایسی خاتون تھیں جنھوں نے ریاست بھوپال پر بڑی شان و شوکت سے حکمرانی کی۔نواب سلطان جہاں ۲۷ ذیقعد ۱۲۷۶ھ بمطابق ۱۹ جولائی ۱۸۵۸ء کو ایوان موتی محل میں پیدا ہوئیں۔[۱۲] آپ کے والد کا نام نواب امراؤ دولہ باقی محمد خان اور والدہ نواب شاہ جہاں بیگم تھیں۔ جس سال آپ پیدا ہوئیں، اسی سال آپ کی نانی نواب سکندر بیگم مختار ریاست اور والدہ شاہ جہاں بیگم کو رئیسہ بھوپال تسلیم کر لیا گیا۔ نواب سکندر بیگم کو حکومت برطانیہ نے ۱۸۵۷ء کے غدر میں

انگریزوں کے ساتھ تعاون کے صلے میں ۱۸۷۱ء میں ایک پورا پرگنہ بیرسیہ ان کو دی اور اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد ان کو "اسٹار آف انڈیا" کا تمغہ اور خلعت عطا کی تھی۔[۱۳] نواب سکندر بیگم اپنی کامیابیوں اور تمام اعزازات کو سلطان جہاں کی نیک بختی سمجھتی تھیں۔انھوں نے آپ کی پیدائش پر خوب دل کے ارمان پورے کیے اور چھ ماہ تک ریاست میں جشن ہوتا رہا اور غربا و مستحقین میں خیرات و انعامات تقسیم کیے گئے۔ وہ آپ کی پیدائش کو سات بیٹوں کی پیدائش سے زیادہ عزیز سمجھتی تھیں۔ نواب سکندر نے بڑی فیاضی سے عقیقہ کی رسم ادا کی اور سلطان جہاں نام رکھا۔ نواب سلطان جہاں کی عمر جب پانچ سال کی ہوئی تو بڑی دھوم دھام سے ان کی بسم اللہ کی رسم ادا کرنے کے بعد باقاعدہ تعلیم کا آغاز کر دیا گیا۔ نواب سکندر بیگم نے ولادت کے چند ماہ بعد ہی ان کی پرورش کی تمام تر ذمہ داری خودلی اور ان کے سونے، اٹھنے، کھانے، پینے، سواری اور سیر کرنے کا ایک ضابطہ تحریر کیا۔ اسی طرح ان کی تعلیم کے لیے وقت اور اساتذہ کا انتخاب کیا۔ ہر مضمون کے لیے الگ الگ اساتذہ مقرر کیے اور ان سے رپورٹ خود طلب کرلیتی تھیں۔ نواب سلطان کی تعلیم کا جو ضابطہ طے کیا گیا وہ ملاحظہ کیجیے۔

ٹائم ٹیبل (قبل ظہر)

"۵ بجے سے صبح ۶ بجے تک	ہوا خوری
۶ بجے سے ۷ بجے تک	ناشتہ
۸ بجے سے ۱۰ بجے تک	کلام مجید
۱۰ بجے سے ۱۱بجے تک	سرکار خلد نشیں (سکندر بیگم) کے ساتھ کھانا کھانا
۱۱ بجے سے ۱۲ بجے تک	چھٹی

بعد ظہر

۱۲ بجے سے ۱بجے تک	خوش نویسی کی مشق
۱بجے سے ۳ بجے تک	انگریزی
۳ بجے سے ۴ بجے تک	فارسی
۴ بجے سے ۵ بجے تک	حساب
۵ بجے سے ۵۔۳۰ بجے تک	بانک یا پشتو (اکثر ایک دن پشتو اور ایک دن بانک کی مشق ہوتی تھی)

۵۔۳۰ بجے سے ۶ بجے تک   سواری اسپ (گھڑ سواری)
۶ بجے سے ۷ بجے تک   کھانا کھانا
۸ بجے   سونے کو خواب گاہ میں چلے جانا۔[۱۴]

سلطان جہاں بیگم کے لیے جن بہترین اساتذہ کا بندوبست کیا گیا تھا ان کے نام اور مضامین درج ذیل ہیں۔

حافظ سید محمد سورتی	کلام مجید
مولوی جمال الدین خان مدار المہام (وزیر اعظم)	ترجمہ قرآن مجید و تفسیر
مولوی رضا علی الملقب بہ شریں رقم	خوش نویسی
منشی حسین خاں ماسٹر	انگریزی
مولوی حسین شاہ بخاری	فارسی
مولوی ایوب صاحب	فارسی
پنڈت لُنپت رائے (گروجی)	حساب
سید امیر علی پھکیت	بانک
حقداد خاں استاد	شہ سواری
آخوند صاحب	پشتو[۱۵]

نواب سلطان کو قرآن مجید، تفسیر، حدیث، خوش خطی، فارسی، عربی، انگریزی اور پشتو کی تعلیم کے علاوہ آبائی فنون سپہ گری بھی سیکھائے جانے لگے۔ آپ مصوری سے خاص دلچسپی تھی جو بعد میں بھی قائم رہی۔ انہوں نے اس فن میں مہارت حاصل کرنے کے لیے اپنی ریاست میں پارسی مصور خواتین کو بلایا اور ان سے اس فن کی مشق سیکھی اور اس کے بعد آپ بڑی مہارت سے تصاویر بنا لیتی تھیں۔ غرض کے ان کے لیے اس تمام تعلیم کا اہتمام کیا گیا جو ایک کامیاب حکمران کے لیے ضروری تھی۔ ۱۳۰۴ھ میں آپ کے والد کا انتقال ہوا اور اس کے تھوڑے عرصے بعد جب آپ کی عمر دس سال تھی تو آپ کو اپنی نانی نواب سکندر بیگم کی جدائی برداشت کرنا پڑی اور تمام تر ذمہ داری آپ کی والدہ نواب شاہ جہاں کے سر

آگئی اور انھیں فرماں روائے ریاست اور سلطان جہاں کو باقاعدہ ولی عہد ریاست تسلیم کر لیا گیا۔ اگرچہ آپ کی عمر کم تھی مگر اس تقریب میں بھرے دربار میں شکریے کی ایک تقریر کی جس کو سن کر ان کی جرأت اور قابلیت پر تمام لوگوں نے حیرت کا اظہار کیا۔ نواب سلطان جہاں اپنی نانی کی وفات کے بعد اپنی تعلیم کے سلسلے میں یوں رقم طراز ہیں:

> تعلیم کا جو نظام معین تھا اس میں درہمی و برہمی ہو گئی۔ خوشخطی کی مشق بالکل جاتی رہی۔ اگرچہ قرآن مجید گیارہ(۱۱) سال ہی کی عمر میں ختم ہوچکا تھا مگر دَور کرتی تھی اور مولوی جمال الدین خاں صاحب بہادر مدار المہام ایک گھنٹہ ترجمہ اور تفسیر پڑھاتے تھے۔ مولوی محمد ایوب صاحب بھی ایک گھنٹہ تعلیم فارسی دیتے تھے۔ دو گھنٹے انگریزی تعلیم ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ میری روبکاری میں صدود احکام کے لیے دو کاغذات بھی پیش ہوتے تھے جن کی نسبت سرکار خلد مکان کا خاص حکم ہوتا تھا۔ [۱۶]

نواب سکندر جہاں نے اپنی نواسی کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی تھی۔ وہ ان کی انگریزی تعلیم کو بہت ضروری جانتے ہوئے یورپین اساتذہ سے ان کا امتحان دلواتی اور انگریزوں سے گفتگو بھی کرواتی تاکہ ان کی زبان دانی میں مہارت پیدا ہو۔ ڈاکٹر رضیہ حامد نواب سلطان جہاں کی تعلیم و تربیت کے بارے میں لکھتی ہیں:

> سلطان جہاں بیگم کی ذکاوت اور ذہانت کو سکندر جہاں بیگم کی تربیت نے جلا بخشی۔ انھوں نے جلد ہی اردو، فارسی، پشتو اور انگریزی میں مہارت حاصل کر لی۔ نشانہ بازی، گھڑسواری میں باکمال استادوں کی زیرِ نگرانی مشتاق ہوگئیں۔ فنون سپہ گری اور تیر اندازی سے سلطان جہاں پوری طرح واقف ہو گئیں تھیں۔[۱۷]

نواب سکندر جہاں نے اپنی نواسی کی تربیت کرتے ہوئے ایک حکمران کے اوصاف کے ساتھ ایک خاتون کے اوصاف اور ذمہ

داریوں کو بھی ملحوظِ خاطر رکھا اور انھیں امورِ خانہ داری، دستکاری، کشیدہ کاری کی تعلیم بھی دی تھی۔سلطان جہاں کی شادی کے لیے نواب سکندر بیگم نے نہایت دور اندیشی کے ساتھ اپنی زندگی میں ہی جلال آباد کے ایک فاطمہ خیل کے قبیلے کے ایک لڑکے احمد علی خان ولد باقی محمد خان کا انتخاب کر لیا۔ وہ انھیں نواب سکندر بیگم اپنے ہمراہ بھوپال لے کر آئیں اور اپنی زیرِ نگرانی اس کی تعلیم و تربیت شروع کر دی۔ اس وقت احمد علی خان کی عمر آٹھ سال تھی اور وہ خوش رو، خوش وضع اور خوش اخلاق تھے۔ نواب سکندر نے ابھی سلطان جہاں کی نسبت طے کر کے باقاعدہ کوئی رسم نہیں کی تھی کہ ۳۰ اکتوبر ۱۸۶۸ء کو ان کا انتقال ہو گیا اور بعد میں بہت سے لوگوں کا سلطان جہاں سے پیغام عقد آیا مگر باہم صلاح مشورہ سے سلطان جہاں کا عقد احمد علی خان سے ہو گیا۔ اس وقت سلطان جہان ۱۶ سال اور احمد علی خان ۱۸ سال کے تھے۔[۱۸] اس شادی میں دو کروڑ روپے حق مہر اور چالیس ہزارروپے سالانہ کی جاگیر دولہا کو دی گئی۔ اس تقریب پر ساڑھے چھ لاکھ روپے کا خرچ آیا تھا۔

نواب سلطان جہان کے پانچ بچے پیدا ہوئے جن میں دو لڑکیاں اور تین لڑکے تھے۔ نواب شاہ جہاں کی وفات (۱۹۰۱ء) کے بعد باقاعدہ طور پر جب امور سلطنت آپ کو حاصل ہوا تو آپ نے ریاست کا انتظام سنبھالتے ہی دیکھا کہ قحط اور سابقہ بدنظمی کی وجہ سے ریاست کی حالت نہایت ابتر ہے۔ خزانہ تقریباً خالی تھا۔ یہ دیکھ کر آپ نے اپنے شوہر کے مشورے سے نہایت قابلیت کے ساتھ انتظام کرنا شروع کیا لیکن ابھی ریاست ملے، پورے سات ماہ بھی نہ گذرے تھے کہ نواب احمد علی خان کا انتقال ہو گیا۔ آپ کے لیے یہ صدمہ نہایت سخت اور یہ وقت بڑی آزمائش کا تھا۔ آپ کو ابھی تنہا ہی ریاست کی ذمہ داری اٹھانا تھی۔

جو لوگ آپ کی قابلیت سے ناواقف تھے اور سمجھتے تھے کہ انتظام ریاست نواب احمد علی سنبھال رہے ہیں۔ انھیں نواب کی وفات سے ریاست کی اصلاح سے مایوسی ہونا شروع ہو گئی مگر کچھ ہی عرصہ بعد نواب سلطان جہاں نے ریاست کو ترقی دے کر یہ ثابت کر دیا کہ اصل محنت اور

صلاحیت انھی کی تھی۔ نواب سلطان جہاں بے حد بیدار مغز اور معاملہ فہم حکمران تھیں۔ اگرچہ صدمہ بہت بڑا تھا اور اس کے علاوہ وزیر ریاست نے بھی اپنی بزرگی کی وجہ سے استعفیٰ دے دیا تھا لیکن پھر بھی آپ کا حوصلہ پست نہ ہوا اور آپ نے تن تنہا ریاست کے کام نہایت سرگرم ا ور مستعدی سے سرانجام دیے۔ متعدد اضلاع کے دورے کیے، رعایا کی اصل حالت اپنی آنکھوں سے دیکھی اور ان کی مشکلات کو فوری طور پر دور کیا۔ اس سلسلہ میں نواب سلطان بیگم لکھتی ہیں:

> میں نے اپنے دوروں میں یہ بھی التزام رکھا تھا کہ مشاجر اور کاشت کاروں کی عورتوں سے بے تکلفانہ ملاقات کروں کیونکہ علاوہ اس کے مجھے صحیح صحیح حالات کا علم حاصل ہو ان کو مجھ سے باتیں کرنے اور ملنے میں ایک خاص خوشی ہو گی جس گاؤں سے میری سواری کا گذر ہوتا تھا جوق درجوق عورتیں اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو گود میں لئے ہوئے راہگذر پر اپنے رواج کے مطابق پانی کا برتین لے کر کھڑی ہو جاتیں۔ [۱۹]

نواب سلطان بیگم نے ریاست کے تمام شعبوں کی طرف توجہ دی۔ سب سے پہلے اس کی مالی حالت کو جدید طریقے کے مطابق چلایا جس کی بدولت پہلے ہی سال میں تقریباً تین لاکھ اور دوسرے سال ساڑھے چھ لاکھ آمدنی میں اضافہ ہوا اور اخراجات کی زیادتی کو دیکھتے ہوئے بعض فضول دفاتر بند کر دیے۔ قوانین، پولیس، عدالتیں اور وکیلوں کی تہذیب و اصلاح پر بھی توجہ دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست بھوپال کی عدالتوں کے وقار میں اضافہ ہوا۔ انھوں نے ریاست میں ذرائع آب پاشی پر توجہ دی اور ڈھائی کروڑ کی لاگت سے اس کا محکمہ قائم کیا۔ ایک چیز جس کی طرف نواب بیگم نے سب سے زیادہ توجہ دی وہ تعلیمی نظام ہے۔ کیوں کہ آپ خود بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں اور تعلیم کی افادیت سے بہت اچھی طرح آگاہی رکھنے کے ساتھ ساتھ اس کی پُرزور حامی بھی تھیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ تعلیم نسواں کے لیے وقف کیا۔ انھوں نے اپنی ریاست میں سلطانیہ سکول ، مدرسہ وکٹوریا، مدرسہ بلقیسی، برجیسہ کنیاپاٹ شالہ، مدرسہ سکندری، صنعتی مدرسہ، نرسنگ اسکول، مدرسہ طبّی آصفیہ

ان کے علاوہ پورے ہندوستان میں خواتین کی کوئی ایسی تحریک نہ تھی جہاں ان کی رسائی نہ ہوئی ہو اور ہندوستانی کی کوئی مفید اسلامی انجمن یا درس گاہ ان کے فیض سے محروم ہو۔ ان کی تعلیمی کاوش کے بارے میں وہا صاحبہ یوں رقم طراز ہیں:

> ہرہائینس نے جاگیرداروں اور شاہی خاندان والوں کو تعلیم کا شوق دلانے کے لیے بےانتہا جدوجہد کی۔ ہر موقع پر تعلیم کی نصیحت کے علاوہ عطیات، انعامات اور عطائے وظائف کے ذریعے ان کی تالیف قلب کی اور ایسے طریقے بھی اختیار کئے جن سے ایک حد تک وہ تعلیم حاصل کرنے پر مجبور ہو گئے۔[۲۰]

ریاست کے ان تمام ترقیاتی اور بہبود کے کاموں کے ساتھ ہی آپ اپنا وقت علمی و ادبی مشاغل کے لیے بھی نکالتی رہیں اور انھوں نے چالیس سے زائد کتابیں تصنیف کیں جو بے حد شوق اور دلچسپی سے پڑھی گئیں۔ ان تصانیف میں اپنی اور اپنے خاندان کی سوانح عمریاں کے علاوہ معیشت، معاشرت، حفظان صحت، علوم و فنون، تاریخ و سیر، خانہ داری، تربیت اولاد، دستکاری وغیرہ پر کتابیں لکھیں۔ آپ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کی چانسلر رہیں۔ سیرت نبوی کے لیےعلامہ شبلی کو گراں قدر امداد دی۔ سیرت عائشہؓ، سیر العجابیات اور سیرت الصحابہؓ بھی ان کی مالی امداد سے شائع ہوئیں۔ انجمن ترقی اردو دار العلوم دیوبند اور دوسرے دینی اور علمی مدارس کی کھلے دل سے معاونت کرتیں رہیں۔

نواب سلطان جہاں اپنے اہل و عیال کے ہمراہ یورپ گئیں اور ان کی بہو شاہ بانو نے اس سفر کی روداد کو نواب بیگم کے مشورے اور یادداشتوں سے سیاحت سلطانی کے نام سے شائع کیا۔ اس سفر کے علاوہ انھوں نے فریضہ حج بیت اللہ ادا کیا اور بلادِ اسلامیہ کی بھی سیاحت کی۔ نواب سلطان جہاں کے تخلیقی کارنامے یہ ہیں۔

تزک سلطانی (۱۳۲۸ھ)

بھوپال اور حکمران بھوپال کی تاریخی اور سوانحی حالات پر مشتمل ہے۔

گوہرِ اقبال (۱۹۱۳ء)

اس کتاب میں نواب سلطان جہاں نے اپنے ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۸ء تک کے تاریخی و سوانحی حالات قلم بند کیے ہیں۔

اختر اقبال (۱۹۱۴ء)

یہ کتاب گوہر اقبال کا دوسرا حصّہ ہے۔ اس میں ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۳ء تک کے حالات کا بیان ہے۔

حیات قدسی (۱۳۳۲ھ)

یہ فرمانروا بھوپال نواب قدسیہ بیگم کی سوانح عمری ہے۔

حیات سکندری (۱۹۳۰ء)

نواب سکندر بیگم کی سوانح عمری ہے۔

تذکرہ باقی (۱۹۱۵ء)

نواب باقی محمد خان امراؤ دولہ، والد نواب سلطان کی سوانح عمری۔

افضال الرحمٰن (تاریخ سنِ اشاعت و مطبع درج نہیں)

اس رسالہ میں نواب بیگم نے قرآن مجید، بسم اللہ، سورہ فاتحہ، درود پاک کے فضائل احادیث مبارکہ سے بیان کیے ہیں۔

سیرت مصطفیٰ (۱۹۱۹ء)

اس کتاب میں وہ تمام تقاریر شامل ہیں جو نواب سلطان نے رسول کریم کی سیرت مبارکہ پر کیں تھیں۔

خطبات سلطانی (۱۹۱۳ء)

نواب سلطان جہاں کی تقاریر پر مشتمل ہے۔

سلک شہوار (۱۹۱۹ء)

اس کتاب میں تعلیم و مسائلِ نسواں سے متعلق تقاریر ہیں۔

ہدیہ الزوجین (۱۹۱۵ء)

یہ کتاب امورِ خانہ داری پر مشتمل ہے اور یہ کئی حصوں میں شائع ہوئی۔

حفظِ صحت (۱۹۱۵ء)

صحت و تندرستی کے اصول بیان کیے ہیں ۔ امورِ خانہ داری کا دوسرا حصّہ ہے۔

معیشت (۱۹۱۶ء)

امورِ خانہ داری کا تیسرا حصّہ ہے اور اصول خانہ داری پر مشتمل ہے۔

معاشرت (۱۹۱۱ء)

یہ معاشرت کے اصول و قواعد پر مشتمل ہے۔

تندرسی (۱۹۱۶ء)

یہ اصولِ صحت پر مشتمل ہے اور لڑکیوں کو صحت کی حفاظت کے اصول سکھانے کے لیے لکھی ہے۔

بچوں کی پرورش (۱۹۲۱ء)

خواتین کے لیے بچوں کی تعلیم و تربیت کے اصول بیان کیے ہیں۔

مقصدِ ازدواج (۱۹۲۰ء)

اس میں شادی سے متعلق تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

فرائض النساء (۱۹۲۱ء)

اس میں مختلف عنوانات کے تحت خواتین کے فرائض پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

تربیت اطفال (۱۹۲۸ء)

بچوں کی تربیت کو بیان کیا گیا ہے۔

عفت المسلمات (۱۹۱۸ء)

قرآن و حدیث کی روشنی میں خواتین کے پردے کے متعلق بیان ہیں۔

درس حیات (سن ندارد)

اس کتاب میں اولاد کی تعلیم و تربیت ، اصولِ خانہ داری، اصول معاشرت اور لڑکیوں کی ضروری تعلیم کے بارے میں بیان کیا گیا ہے۔

اخلاق کی پہلی کتاب (۱۹۲۴ء)

بچوں کی اخلاقی تربیت کے لیے لکھی گئی ہے۔

اخلاق کی دوسری کتاب (۱۹۲۵ء)

بچوں کی تربیت کے متعلق لکھی گئی ہے۔

اخلاق کی تیسری کتاب (۱۹۲۵ء)

بچوں کی اخلاقی تربیت کے لیے چھوٹے چھوٹے مضامین پر مبنی ہے۔

باغ عجیب (تاریخ سنِ اشاعت و مطبع درج نہیں)

یہ کتاب دو حصّوں پر مشتمل ہے اور بچوں کے لیے لکھی گئی ہے۔ اس کا موضوع بھی اچھے اخلاق ہیں۔

مطبخ کنگ جارج (۱۹۳۱ء)

یہ خواتین کے لیے ہے اور اس میں مختلف چیزیں بنانے کی تراکیب ہیں۔

ہدایات سلطانی (۱۹۱۳ء)

یہ کتاب نواب سلطان جہاں کے دورِ حکومت میں بنائے گئے قوانین پر ہے۔

ہدایات باغبانی (۱۳۴۱ء)

باغبانی کے متعلق احکام ہیں۔

نٹنگ بننے کا پہلا رسالہ (۱۹۱۶ء)

خواتین کے لیے سلائی کڑھائی پر مبنی ہے۔

مذکورہ بالا تمام تصانیف کے بارے میں معلومات بیگمات بھوپال سے لی گئی ہیں۔[۲۱]

نواب سلطان جہاں کو تصنیف و تالیفات کا بے حد شوق تھا اور اس کے لیے انھوں نے ایک خاص شعبہ قائم کیا ہوا تھا۔ جس میں ملک کے نامور لوگوں کی خدمات حاصل کی گئی تھی۔ نواب بیگم تمام تصنیفات کے مسودّوں پر نظرثانی کرتیں تھیں اور وہ ہندوستانی خواتین میں سب سے بڑی کثیر التصانیف خاتون ہیں۔[۲۲]

ہرہائینس کو اپنی والدہ شاہ جہاں بیگم کی طرح فنِ تعمیر کا بھی شوق تھا۔ اس لیے آپ نے اپنی ریاست میں کئی

عالیشان پبلک اور ذاتی عمارتیں تعمیر کروائیں۔ اس کے علاوہ حرفتی سکول، یتیم خانے بھی قائم کیے۔ یہاں سے بچیوں کی شادیاں بھی سرکاری خرچ سے کی جاتیں تھیں۔

ان تمام حیثیتوں کے علاوہ آپ کی عظمت کا سبب آپ کے محاسن اخلاق تھے۔ آپ طبعاً نہایت رحم دل، فیاض، خلیق، درد مند اور ملنسار تھیں۔ ایک ریاست کی فرماں روا ہونے کے

باوجود آپ کے مزاج میں انکساری پائی جاتی تھی۔ وہ دوسروں کی خطاؤں کو درگزر کر دیتیں اور بسا اوقات محض چشم پوشی ہی اصلاح کے لیے ضروری سمجھتی تھیں۔ نواب سلطان بیگم نے صرف اپنی رعایا کے ہر طبقے کے ساتھ مساوات کا خیال رکھتیں بلکہ دوسرے مذاہب کے لوگوں کے ساتھ نہایت فراخ نظری اور رواداری کا برتاؤ کرتی تھیں۔ ان تمام صفات کے علاوہ وہ نہایت صابر اور مستقل مزاج خاتون تھیں۔ ان کے کارناموں کی فہرست بہت طویل ہے۔ جسے بیان کرنے کے لیے کئی کتابیں تخلیق ہو سکتی ہیں۔ سرزمین بھوپال کا یہ درخشاں ستارہ اپنی روشنی بکھیر کر ۱۲ مئی ۱۹۳۰ء کو اہلِ ہند کو سحرِ جاوداں عطا کر کے دوسرے جہاں کی مسافرت پر روانہ ہو گیا۔ نواب سلطان جہاں کو ان کی وفات کے بعد "فردوس آشیاں" کا لقب دیا گیا۔ [۲۳]

۳۔نواب بیگم سر بلند جنگ بہادر(اختر حمید)

آپ اردو زبان کی ادیبہ اور شاعرہ ہونے کے ساتھ ساتھ تحریکِ نسواں کی ایک متحرک رکن بھی تھیں۔ نواب بیگم کا اصل نام اختر حمید سلطان خانم تھا اور آپ نواب سردار الملک مرحوم کی بڑی بیٹی تھیں۔[۲۴] اختر حمید کی تعلیم و تربیت خانگی طور سے ہوئی اردو، فارسی، عربی کے علاوہ انگریزی میں بھی مہارت حاصل کی۔[۲۵] اور آپ کی شادی نواب حمید اللہ خان سربلند جنگ بہادر سے ہوئی۔ نواب حمید اللہ خان مولوی محمد سمیع اللہ خان کے بڑے بیٹے تھے۔ مولوی سمیع اللہ (۱۸۳۴ء۔۱۹۰۸ء) سرسید تحریک کے سرگرم و فعال رکن ہونے کے ساتھ ساتھ سرسیّد احمد خان کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ سرسیّد احمد خان اور مولوی محمد سمیع اللہ خان میں خاندانی قرابت بھی پائی جاتی تھی۔

نواب حمید اللہ خان (۱۸۶۴ء۔ ۱۹۵۲ء) مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے پہلے طالب علموں میں سے تھے۔ انھوں نے لندن سے سول سروس کے امتحان کے ساتھ بیرسٹری کی ڈگری بھی حاصل کی۔ بعد ازاں وہ ریاست حیدرآباد دکن میں چیف

جسٹس کے عہدے پر فائز ہوئے۔ انھیں حکومتِ برطانیہ کی جانب سے سربلند جنگ بہادر اور افضل العلما کا خطاب ملا۔[۲۶]

بیگم سربلند جنگ نے اپنے عہد کی روایات کے مطابق اپنا نام ہمیشہ مخفی رکھا اور اپنے شوہر کے نام کو قلمی طور پر استعمال کیا۔ اس وجہ سے راقمہ کو ان کے اصل نام کو ڈھونڈنے میں کافی دقت کا سامنا رہا۔ کیوں کہ ہر سفرنامہ کی تاریخ کی کتابوں میں بیگم سربلند جنگ ہی درج تھا۔ اب تک کسی بھی محقق نے یہ کوشش نہیں کی تھی کہ ان کے اصل نام اور کوائف کے متعلق معلومات حاصل کی جائیں۔ جس کی وجہ سے کافی تگ و دو کے بعد اور مختلف رسائل و تذکرہ کھنگالنے کے بعد نہ صرف اس مصنفہ کے سوانحی حالات دریافت ہوئے بلکہ دیگر سفرنامہ نگار خواتین کے سلسلے میں بھی ایسی ہی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔بیگم سر بلند جنگ بہادر کی تاریخ پیدائش کے متعلق معلومات کی عدم دستیابی کی وجہ سے اگر نواب حمید اللہ خان کی تاریخ ولادت سے قیاس کر یں تو نواب بیگم تقریباً ۱۸۶۰ء۔ ۱۸۷۰ء کے دورانیہ میں پیدا ہوئی ہوں گی۔

یورپ کی سیاحت کے دوران آپ نے بہت سے لوگوں سے انگریزی اور عربی زبان میں گفتگو بھی کی ہے۔جس سے اس بات کوتقویت ملتی ہے کہ بیگم صاحبہ ان زبانوں کو بولنے پر قدرت رکھتی تھیں۔ کافی عرصہ سے آپ کے دل میں بیت اللہ شریف کی آرزو تھی جو کہ ۱۹۰۹ء میں پوری ہوئی اور آپ نواب حمید اللہ خان کے ساتھ اس سفرِ حجاز پر وانہ ہوئیں۔ حج کی سعادت حاصل کرنے کے بعد آپ دونوں یورپ کی سیاحت سے بھی لطف اندوز ہوئے اور اس سفر کی یاد داشت آپ محفوظ کرتی رہیں۔ بعد میں اسے کتابی صورت میں دنیا عورت کی نظر میں (۱۹۱۰ء) میں شائع کیا۔

آپ ایک مصنفہ ہونے کے ساتھ اچھی شاعرہ بھی تھیں اور اپنے شوہر کے نام سے لکھتی تھیں۔ آپ کی شاعری کے بارے میں پرنس آف ویلز سے کی گئی گفتگو سے بھی پتہ چلتا ہے۔ جیسا کہ ایک جگہ سفرنامہ میں وہ لکھتی ہیں:

پھر کہا کہ ! مجھ کو تمہاری وہ نظم جو تم نے میرے متعلق
لکھی تھی یاد ہی اسکو تم ترجمہ کر کے دے سکتی ہو؟
میں نے کہا ضرور ضرور یہاں سے ہندوستان جاتے ہی
ترجمہ کرکے بھیجدونگی۔ [۲۷]

بیگم سربلند جنگ برصغیر پاک و ہند کی خواتین کی ناگفتہ بہ تعلیمی حالت پر رنجیدہ رہیں اور خواتین کے جلسوں میں اپنی تقاریر کے ذریعے انھیں تعلیم کی جانب مائل کرتی نظر آتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ تعلیم کا اصل گہوارہ گھر ہے۔ گھر سے ہی تعلیم کا آغاز ہوتا ہے۔ اس لیے لڑکیوں کو تعلیم کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ [۲۸] بیگم سربلند جنگ کی تعلیم سے متعلق شاعری بطور نمونہ ملاحظہ کیجیے۔

جو کرتے نہیں ہیں نگہ بات پر
لگائے خیالوں کو ہیں گھات پر
اثر کس طرح ہووے اونمیں بھلا
ضلالت نے دیں راہیں اونکی بھلا
لڑکپن میں جانچا نہیں ہوش کو
جوانی کو کہو یا فراموش سو
بڑھاپے نے جو سر ہلایا ذرا
لگے تھر تھرانے وہیں خوب سا
کہ آہ حسرتا ہم نے تعلیم میں
نظر کچھ نہ کی گہر کی تفہیم میں
اسی پر کیا مختتم یہ کلام
جو آگے کو باقی رہے والسَّلام [۲۹]

بیگم سربلند جنگ اس عہد کی ایک فعال اور سرگرم خاتون تھیں۔ آپ رسالہ عصمت میں مضامین بھی لکھتی رہیں اور یہاں موقع ملتا تو وہ خواتین سے تقریر کے ذریعے بھی مفید باتیں سمجھنے کی کوشش کرتیں۔ جیسا کہ جنوری ۱۹۳۸ء کے شمارے عصمت میں ایک تقریر کی نقل درج ہے۔ جو انھوں نے خواتین دہلی کے جلسے میں کی تھی۔ اس سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> آپ میں سے بہت سی خواتین نے بچشم خود دیکھا ہو گا کہ غیر قوم کی لیڈیز ہمارے متوسط درجے کی بہنوں کو نمائش کے ذریعے صنعت و حرفت اور دوسری چیزیں خود کر کے دکھاتی ہیں۔ غور کیجئے کیا یہ ہماری بہنوں کے لیے شرمناک نہ تھا۔ ہمارے ملک ہند کی ہر ہر بی بی بجائے خود دل و دماغ بخوبی رکھتی ہے۔ لیکن افسوس تربیت کامل نہ ہونے کی وجہ سے جہالت نے بدنام کر رکھا ہے۔ اب ہم کو ضرور متوجہ ہو کر فسٹ ایڈ کی صفائی رکھنا بچوں کی پرورش ان کو خوش مزاج صحت ور بنانا عمدہ کھانا پکانا، لباس قطع کرنا، شب و روز کا جدا جدا لباس پہننا اور خو دیکھ بھال کرنا سیکھنا اور سیکھانا چاہتے۔ [۳۰]

بیگم سربلند ہندوستان کے ایک روحانی پیشوا جناب حضرت مولانا مولوی محمد قیام الدین عبد الباری صاحب کے حلقہ مریدین میں شامل تھیں اور اُن سے بہت عقیدت رکھتی تھیں۔ اپنے سفرنامہ دنیا عورت کی نظر میں میں وہ اپنے پیرومرشد کے متعلق یوں رقم طراز ہیں۔

> ایک عریضہ اپنے پیرو مرشد جناب مولانا مولوی محمد قیام الدین عبد الباری صاحب قبلہ کی خدمت اقدس میں لکھا۔ یہ حضرت میرے پیرومرشد جناب مولانا الحاج مولوی محمد عبد الوہاب صاحب قبلہ کے چھوٹے صاحبزادے ہیں اور بہت ہی سچے پیر ہیں۔ آج ان کا ثانی دوسرا نہیں۔ ان سے بھی اجازت حج بیت اللہ کی لے لی تھی۔ [۳۱]

انھوں نے سفرِ حجاز اور سفرِ یورپ اپنے شوہر نواب حمید اللہ خان کے ساتھ کیا۔ اس سفر کی یادوں کو نواب سربلند جنگ نے بھی سیرِ قسطنطنیہ کے نام سے ۱۹۱۰ء میں شائع کیا۔

۴۔ نازلی رفیعہ سلطان

نازلی رفیعہ سلطان اردو سفرنامہ نگاری میں نمایاں مقام رکھتیں ہیں۔ وہ ۱۹ فروری ۱۸۷۴ء کو بمبئی میں پیدا ہوئیں۔[۳۲] ان کی والدہ کا نام امیر النساء بیگم جو کہ اُس وقت کی ایک بہت اچھی شاعرہ اور ناول نگار بھی تھیں۔ ان کی یادگار تصانیف میں قصائد و غزلیات پر مشتمل دیوان اور

ایک ضخیم ناول "نادر بیان" ہے۔[۳۳] اس کے علاوہ امیر بیگم کی منظوم دعاؤں کا مجموعہ "آمین" ہے۔ جسے ان کی سب سے بڑی بیٹی زہرا بیگم نے مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ امیر النساء کی شادی فیض حیدر کے بیٹے حسن علی سے ہوئی جو کہ ترکی میں کاروبار کرتے تھے۔

نازلی بیگم نے جس ماحول میں پرورش پائی اس میں عام مسلمان گھرانوں کی نسبت پڑھنے لکھنے کا رواج زیادہ تھا۔ نازلی کے آباؤاجداد میں طیب جی خاندان اپنے عہد کا ایک بڑا ممتاز گھرانہ تھا اور ۱۸۲۵ء میں ان کی فرم "طیب جی اینڈ کو" کے نام سے بمبئی کے کاروباری حلقوں میں پہچانی جاتی تھی۔[۳۴] طیب علی نے بھائی میاں کے سب سے بڑے بیٹے ہونے کی وجہ سے ان کی مالی مشکلات میں ان کا ہاتھ بٹایا اور اسی تگ و دو میں طیب علی واجبی سی تعلیم حاصل کر سکے، مگر وہ تعلیم کی اہمیت سے واقف تھے۔ اسی لیے انہوں نے بعد میں خود محنت کر کے عربی، اردو اور انگریزی زبان سیکھی اور اپنی اولاد کو بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے یورپ بھیجا۔ طیب علی نے ایک مذہبی رسالہ گلبنِ ہدایت تحریر کرنے کے علاوہ اپنے خاندانی حالات و واقعات قلم بند کرنے کے لیے کتاب اخبار قبیلہ طیّبی کی بھی بنیاد رکھی جس میں خاندان کے ہر فرد کو سختی سے اپنے اپنے واقعات و تاثرات لکھنے کی تاکید کی تھی۔ اس طرح انہوں نے خاندانی تاریخ مرتب کرنے کا منفرد انداز اختیار کیا۔[۳۵] ڈاکٹر معین الدین عقیل نے طیب جی کی اس خودنوشت سوانح کو اردو کی اوّلین سوانح مانا ہے اور اسے زبان و اسلوب کے لحاظ سے اردو زبان و ادب کی تاریخ میں شامل کیے جانے کا پوری طرح مستحق بھی قرار دیا ہے۔[۳۶]

نازلی رفیعہ بیگم کے نانا شجاع الدین، طیب جی کے سب سے بڑے بیٹے تھے اور وہ اپنے والد کے وسیع کاروبار کو، جس کی شاخیں ہارو، فرانس اور کراچی میں قائم تھی اور وہ اس کاروبار کو سنبھالتے تھے۔ شجاع الدین کا شمار کراچی کے اہم تاجروں میں کیا جاتا تھا۔ ان کی بیگم درۃ الولی ایک تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔[۳۷] شجاع الدین کی اکلوتی بیٹی امیر النساء جو کہ تعلیم یافتہ اور روشن خیال ہونے کے ساتھ ساتھ

ایک بڑی اچھی شاعرہ اور ادیبہ بھی تھیں ۔ ان کے اشعار ان کے خاندانی اخبار "کتاب اخبار قبیلہ شجاع الدین طیّبی " اور ان کے خطوط میں بھی ملتے ہیں۔

نازلی بیگم امیر النساء کی منجھلی صاحبزادی ہیں۔ ان کی تین بیٹیاں زہرا بیگم فیضی، نازلی بیگم اور عطیہ فیضی ہیں اور یہ تینوں اردو ادب کی نامور ادیبہ ہیں۔ امیر النساء کا ادبی ذوق نازلی بیگم کو بھی ورثہ میں ملا اور انھوں نے بھی ساری زندگی لکھنے لکھانے کا کام جاری رکھا۔ وہ تہذیب نسواں اور دیگر رسائل میں مضمون نگاری کرتی رہیں۔

نازلی رفیعہ بیگم نے ۱۸۸۶ء میں نواب صاحب جنجیرہ سرسیّدی احمد خان سے شادی کی۔ نواب صاحب بھی ایک مہذب اور تعلیم یافتہ انسان تھے۔ [۳۸] انھوں نے اپنی ریاست میں تعلیم کو عام کرنے کے لیے بہت سی کوششیں کیں اور نازلی بیگم سے شادی کے بعد انسانی فلاح وبہبود کی اور پھر اسی جدوجہد میں اور تیزی آگئی۔ نازلی نے یورپ سے واپسی کے بعد ریاست جنجیرہ میں لڑکیوں کے لیے ایک سکول قائم کرنے کے ساتھ اپنے خاندانی احوال لکھنے کے لیے اخبار نامہ احمدی بھی جاری کیا۔

بیگم نازلی باشعور، تعلیم یافتہ اور خواتین کی بڑی ہمدرد تھیں۔ انھوں نے یورپ سے واپسی کے بعد برصغیر کی خواتین کو تعلیم سے آشنا کیا اوران میں بیداری پیدا کرنے کے لیے ایک جلسہ منعقد کیا ۔ اس میں انھوں نے اہلِ یورپ کے طرز معاشرت، فنون، تعلیمی نظام اور رہن سہن سے آگاہ کیا۔ نازلی بیگم عورتوں کی تعلیم اور بیداری کے لیے ہمیشہ کوشاں رہیں۔ وہ عورتوں کے لیے ویسی ہی تعلیم چاہتی تھیں جیسی مردوں کے لیے ضروری ہے۔ تاکہ عورت بھی کسی کی محتاج نہ رہے۔ بلکہ ضرورت پڑنے پر اپنے ہاتھوں سے سب کچھ کر سکے۔ جب وہ یورپ گئیں تو وہاں کی ترقی سے بے حد متاثر ہوئیں خصوصاً عورتوں کو زندگی کے ہر شعبہ میں بڑھا ہوا دیکھ کر برصغیر کی عورت کی تنزلی انھیں دکھ دیتی تھی۔لندن میں قیام کے دوران نازلی بیگم نے ایک شاندار دعوت دی جس میں دیگر معززین کے ساتھ علامہ محمد اقبال نے بھی شرکت کی

اور نازلی بیگم کی دستخطوں کی کتاب پر دستخط کرنے کے ساتھ علامہ اقبال نے یہ شعرفی البدیہہ تحریر کیے۔

اے کہ تیرے آستانے پر جبیں گستر قمر
اور فیض آستاں بوسی سے گل برسر قمر
روشنی لے کر تری موج غبارِ راہ سے
دیتا ہے لیلائے شب کو نور کی چادر قمر
کاروان قوم کی مجھ سے ہے زینت اس طرح
جس طرح گردوں پہ صدر محفلِ اختر قمر

جس عہد اور ماحول میں نازلی بیگم سفرنامہ تحریر کر رہی تھیں ، وہ عہد برصغیر کے مسلمانوں کے زوال و انحطاط کا عہد تھا۔ مغلیہ حکومت کے خاتمے اور برطانوی حکومت کے قیام کے ساتھ ہی مسلمانوں کی پستی کا آغاز ہو گیا تھا۔ ایسےکٹھن وقت میں بہت سے ممتاز لوگ مسلمانوں کو اس زوال سے نکالنے کے لیے اپنے اپنے میدان میں کام کر رہے تھے۔ ایسے حالات میں چند خواتین بھی اس میدان میں اتریں اورانھوں نے طبقۂ نسواں کو معاشرے کا ایک اہم رکن سمجھتے ہوئے، ان کی تعلیم و تربیت ، اخلاق و عادات کو درست کرنے اور ان کے اندر جذبۂ علم و فن اور جذبۂ تحریک و عمل بیدار کرنے کے لیے عملی کوششیں کیں۔ نازلی بیگم بھی ساری زندگی اسی مقصد کی بجاآوری کے لیے کوشاں رہیں۔ انھوں نے عورتوں کو بیدار کرنے کے لیے نہ صرف تقاریر کیں بلکہ مختلف رسالوں میں مضامین بھی لکھے۔ وہ جب یورپ کی سیاحت کے دوران ترکی گئیں تو انھیں ان کی خدمات کے صلے میں سلطان عبد الحمید کی جانب سے "نشانِ شفقت" کے تمغے سے نوازا گیا۔ [۳۹]

نازلی بیگم کواردو سفرنامہ نگار ی کےمیدان میں نمایاں مقام حاصل رہا ہے۔ انھوں نے ۱۸۰۸ء میں نواب سرسیّدی ، اپنے بھائی علی اصغر اور عطیہ فیضی کے ہمراہ یورپ کے مختلف ممالک کاسفر اختیار کیا اور ان کا سفرنامہ سیرِ یورپ ان کے خطوط سے مرتب شدہ ہے۔ جو انھوں نے قیامِ یورپ کے دوران اپنے عزیزوں اور خاص کر اپنی بہن زہرا فیضی کو لکھے تھے ۔ا ن خطوط کو زہرا بیگم نے برصغیر کی خواتین کی معلومات کے لیے سلسلہ وار عصمت میں شائع کیا اور بعد میں اس سفری احوال کو ۱۸۰۸ء میں کتابی صورت میں شائع کروایا۔ اپنے اس سفرنامہ کی اشاعت کے سلسلہ میں بیگم نازلی دیباچہ میں لکھتی ہیں:

> اصل میں یہ خطوط ہیں جو میں نے اپنے بزرگوں کے نام سیرِ یورپ کے حالات لکھے ہیں۔ اس میں نہ عبارت آرائی ہے نہ قافیہ پیمائی، صاف سیدھی عبارت ہے ، وہاں کے حالات، طرزِ معاشرت، تدبیر المنازل، بعض امور سیاسیہ، تجارت، ہنروری، اقسام فنون کی کثرت، تہذیب، طریقہ تعلیم، دربار کے آداب، جو میں جتنا سمجھ سکی اپنی زبان میں اپنے اہلِ وطن کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔[۴۰]

نازلی رفیعہ سلطان کا اردو ادب میں سب سے بڑا کارنامہ ان کا سفرنامہ سیرِ یورپ ہے۔ اس سفرنامہ کی اشاعت کا سب سے بڑا مقصد بیداریٔ نسواں اور تعلیمِ نسواں تھاتاکہ اس کے مطالعہ سے پسماندہ اور کم پڑھی لکھی خواتین حصولِ تعلیم کی کوشش کریں۔ یہ سفرنامہ تقریباً تین سو صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں ۲۴ تصویریں بھی شامل ہیں۔ اس سفرنامہ کا انتساب انھوں نے اپنی والدہ امیر النساء کے نام کیا ہے۔ یورپ کے مختلف ممالک کا سفر نازلی بیگم نے اپنے شوہر نواب سرسیّدی احمد خان کے ساتھ سیاحت کی غرض سے کیا تھا اور وہ کچھ مہینوں کی سیروسیاحت کے بعد وطن واپس آگئے۔

نازلی بیگم کی ازدواجی زندگی زیادہ دیر خوشگوار نہ رہ سکی اور اس میں اختلافات، نواب صاحب کی اولادِ نرینہ کی خواہش کی غرض سے کی جانے والی شادی کی وجہ سے پیدا ہوئے۔ ان اختلافات کو دور کرنے کے لیے بہت سے لوگوں نے

کوششیں کیں اور بعد میں نواب صاحب نے بھی نازلی بیگم کو منانے کی بہت کوشش کی مگر نازلی بیگم نے انکار کرتے ہوئے ۱۹۱۵ء میں نواب صاحب سے الگ رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس ایک اختلاف کی وجہ سے نہ صرف نازلی بیگم کی ازدواجی زندگی کو نقصان پہنچا بلکہ اس وجہ سے بھائیوں اور بہنوں میں بھی دُوری بڑھ گئی۔ اس دکھ کی کیفیت کو نازلی بیگم یوں بیان کرتی ہیں۔

> اگر ہمارے بھائی ہم کو اس عزت اور courtesyسے پیش نہیں آتے ہیں جس کے ہم مستحق ہیں اور خدا کی مہربانی سے دنیا ہم کو دیتی ہے تو بہتر ہے کہ ہم دور رہیں۔۔۔۔ میرے دل پر اس کا نہایت رنج اور صدمہ ہے کہ نواب صاحب نے مجھ سے اس قدر بے اعتنائی کی مگر میرے دو بھائیوں نے بدستور ان سے ملنا جلنا قائم رکھا۔ میرے اس مصیبت کے وقت میں میری دلی اور سچی ہمدردی میری دو بہنیں رہیں اور رحمین رہے۔ باقی کل خاندان کی بے غیرتی کا ایسا نقش میرے دل پر جما ہے کہ عمر بھر نہ بھولوں گی ۔[41]

ان حالات کی وجہ سے نازلی بیگم کی آخری زندگی کراچی میں بڑی تنگ دستی اور کسمپرسی میں گذری اور ان کی دیکھ بھال کیپٹن وحید کیا کرتے تھے جو ان کے رشتے دار نہیں تھے۔[42] اور بالآخر وہ ۱۹۶۸ء میں شدید بیماری سے لڑتے ہوئے انتقال کر گئیں اور انھیں کراچی میں سپردِ خاک کیا گیا۔

۵۔ بیگم عطیہ فیضی

بیگم عطیہ فیضی کو اردو زبان و ادب میں اہم مقام حاصل ہے۔ وہ برصغیر پاک و ہند میں مسلمان خواتین کے تشخص کے تحفظ، حقوق و بیداری نسواں اور تعلیم نسواں کی جدوجہد کرنے والی خواتین میں شمار ہوتی تھیں۔ وہ ایک شعلہ بیان مقرر، حصولِ علم کے لیے کوشاں، بے دار مغز رکن تحریک نسواں اور سب سے بڑھ کر وسیع النظر اور بااصول خاتون تھیں۔ ان کے ادبی کارہائے نمایاں کی جرات مندیوں کی داستان متاثر کن ہے کہ ان کی بے باکی، خوداعتمادی اور

ذہانت سے اردو ادب کی دو بڑی شخصیت مولانا شبلی نعمانی اور ڈاکٹر محمد اقبال بہت متاثر رہے۔

اگرچہ اردو ادب میں تخلیقی کام کے حوالے سے عطیہ فیضی کا کام کچھ زیادہ نہیں مگر اس وجہ سے نہایت اہمیت کا حامل ہے کہ ان کے ہاں انیسویں صدی کے جدید اور انقلابی سوچ کے مضبوط حوالے ملتے ہیں۔ بیگم عطیہ بیک وقت کئی محاذوں پر لڑنے والی شخصیت تھیں۔ وہ ایک وقت میں اصلاحِ معاشرہ ، ادب، حصولِ علم، حقوق و تعلیمِ نسواں کے میدان میں سرگرم عمل رہیں۔ ان کی زندگی مختلف زاویوں میں بٹی ہونے کی وجہ سے وہ اپنی مکمل توجہ تخلیقی ادب کی جانب نہ دے سکیں اور اردو ادب ان کی تخلیقات سے محروم رہ گیا مگر انگریزی زبان میں ان کی تصانیف ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی اہمیت ابتدائی دور کی خواتین سفرنامہ نگاروں اور مضمون نگاروں کی فہرست میں اہم ہے۔

عطیہ فیضی ۱۸۷۷ء کو استنبول کے قریب ایک مقام آطہ میں پیدا ہوئیں۔[۴۳] ان کے والد حسن علی فیضی کاروبار کے سلسلے میں استنبول میں مقیم تھے۔ عطیہ بیگم نے باقاعدہ کسی مدرسے یا کالج سے تعلیم نہیں پائی مگر ان کو انگریزی زبان پر اتنا عبور ہے کہ گویا ان کی مادری زبان ہو۔ ان کی قابلیت کا سہرا ان کی والدہ امیر النساء بیگم کے سر ہے جو اپنے عہد کی ایک پڑھی لکھی اور روشن خیال خاتون تھیں۔ وہ کئی کتابوں کی مصنفہ تھیں جن میں نادر بیان ایک ناول ہے جو کہ ایک انگریزی ناول سے ماخوذ ہے۔[۴۴] امیر النساء کو شاعری کا ملکہ بھی حاصل تھا اور ان کی شاعری کے نمونے خطوط کے علاوہ اخبار قبیلہ طیبی میں ملتے ہیں۔ ان کی منظوم دعاؤں کا مجموعہ آمین اور قصائد و غزلیات پر مشتمل ایک دیوان ان کی بڑی بیٹی زہرا بیگم نے شائع کیا۔[۴۵]

عطیہ فیضی کے آباؤاجداد کا تعلق کاٹھیاواڑ اور سورت کی ریاستوں کے درمیان خلیج کیمبے (Combay) کے ایک سرے پر واقع ساحلی ریاست کیمبے سے تھا اور یہ خاندان مذہبی لحاظ سے سلیمانی بوہرہ کی جماعت سے تھا۔ بیگم عطیہ کے جدِ امجد طیب علی ۱۸۰۳ء میں بھائی میاں کے گھر پیدا ہوئے۔[۴۶]

جو کہ پیشے کے لحاظ سے تاجر تھے اور بمبئی میں ان کا وسیع کاروبار تھا مگر اچانک لگنے والی آگ نے ان کے تمام اثاثے کو جلا کر راکھ کر دیا۔ یہ دور بھائی میاں پر بڑا کٹھن اور صبر آزما تھا ۔ اس وقت طیب علی کی عمر تقریباً آٹھ سال تھی اور وہ اپنے باپ بھائی میاں کے ساتھ مل کر بمبئی میں پھیری لگا کر اشیا فروخت کرتے تھے تاکہ خاندان کی ضروریات کو پورا کیا جا سکے۔ طیب علی بچپن سے ہی بڑے ذہین اور محنتی تھے مگر معاشی تنگ دستی کی وجہ سے وہ تعلیمی سلسلہ برقرار نہ رکھ سکے۔

طیب جی نے اپنی مستقل مزاجی، ذہانت اور کاروباری سوجھ بوجھ سے کچھ ہی عرصے میں "طیب جی اینڈ کمپنی" کے نام سے ایک فرم قائم کر لی۔[۴۷] طیب علی کو خود تو تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہ ملا مگر تعلیم کے زبردست حامی اور روشن خیال تھے اسی وجہ سے انھوں نے اپنی اولاد کو تعلیم کی بہترین سہولیات فراہم کیں اور اپنے بیٹوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ بھیجا۔ طیب جی کی علم پروری کی بنا پر ڈاکٹر میمونہ دلوی نے بمبئی میں طیب خاندان کو اردو کے سرپرست خاندانوں میں شامل کیا ہے۔[۴۸]

طیب جی چوں کہ تعلیم سے خصوصی لگاؤ رکھتے اور تعلیم کی اہمیت سے بھی آگاہ تھے اس لیے انھوں نے اپنے مذہبی فرقے کی ترقی میں بھی بڑا اہم کردار ادا کیا اور سلیمانی فرقے کے حق میں ایک رسالہ گلبن ہدایت کا بھی تحریر کیا۔[۴۹] اس کے علاوہ انھوں نے اپنے خاندان کی تاریخ اور حالات لکھنے کے لیے "کتاب اخبار قبیلہ طیبی" جاری کیا جس میں تمام افراد کو اپنے روزانہ کے معمولات لکھنے کی تاکید کی تھی۔ اس طرح طیب جی نے اپنی اس کتاب میں اپنی خودنوشت سوانح لکھنی شروع کی اور ان کو اردو ادب کی پہلی خود نوشت سوانح لکھنے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل اس خودنوشت کو اردو ادب کی اولین خودنوشت سوانح عمری قرار دیتے ہیں۔[۵۰]

عطیہ فیضی کے نانا شجاع الدین طیب علی کے سب سے بڑے بیٹے تھے جو اپنے والد کا کاروبار سنبھالتے تھے۔ ان کی

اکلوتی بیٹی امیر النساء کی شادی حسن علی بن فیض حیدر سے ہوئی۔ حسن علی کے والد فیض حیدر بھائی میاں کے چھوٹے بیٹے اور طیب جی کے بھائی تھے۔ حسن علی فیضی ترکی میں کاروبار کرتے تھے اور ان کا کاروبار بہت سے ممالک میں پھیلا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ وہ سلطان عبد العزیز اور سلطان عبد الحمید کے مشیر کے منصب پر بھی فائز تھے اور ترک دربار میں انھیں حسن آفندی فیضی کے نام سے جانا جاتا تھا۔[۵۱]

عطیہ فیضی علم موسیقی کی ماہر تھیں اور ان کی علم موسیقی کے علاوہ دیگر تصانیف درج ذیل ہیں۔

۱۔ Indian Music (1914)
۲۔ The music of India (1925)
۳۔ Sangeet of India (1942)
۴۔ Iqbal (1947)

عطیہ بیگم نے ہندوستان کی موسیقی کی خصوصیت کو یورپ سے متعارف کرایا اور وہ ایشیا کی پہلی عورت ہیں جنھوں نے دنیا کی سب سے پرانی یونی ورسٹی (ساربونی یونی ورسٹی) میں ہندوستانی موسیقی پر لیکچر دیئے اور غیر معمولی شہرت حاصل کی۔[۵۲] ۱۹۲۶ء میں عطیہ فیضی نے آرٹ سرکل کے نام سے ایک ادارۂ قائم کیا ۔ اس ادارے نے زندگی اور آرٹ کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں جو خدمات انجام دیں انھیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ۱۹۲۶ء میں جب بمبئی آرٹ کی نمائش ہوئی جہاں ریاست حیدرآباد کی مصوری کے اعلی نمونوں کے علاوۂ عطیہ فیضی کی مصوری کے نمونے بھی دکھائے گئے تھے ۔اس کے علاوۂ ۱۹۳۷ء میں "اکیڈمی آف اسلام" کی بنیاد بھی رکھی۔ عطیہ فیضی کے قائم کردہ ان دو اداروں نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی اور ان اداروں کو برنارڈ شا، کلارابٹ، کیلی کرسی وغیرہ جیسی شخصیتوں کی شرکت کا فخر حاصل ہے۔[۵۳]

انھوں نے یورپ کے بہت سے شہروں میں مختلف موضوعات پر بھی لیکچر دیے اور جرمنی کے شہر برلن میں

انہیں ان کی خدمات کے صلے میں سفیر افغانستان نے "تمغۂ امانیہ" عطا کیا۔ اس کے علاوہ جب وہ ۱۹۰۸ء میں اپنی بہن نازلی بیگم کے ساتھ یورپ کی سیاحت پر گئیں تو دورے ترکی میں سلطان عبد الحمید خان نے "تمغۂ شفقت نشان" دیا جو صرف عورتوں کے لیے مخصوص ہے۔ اور انہیں ان کی خدمات کے صلے میں دیا جاتا ہے۔ بقول عطیہ بیگم: ہم دونوں بہنوں کو اوّل اور دوسرے درجوں کے شفقت نشان ملے۔ سب ہیرے، زمرد اور یعقوت (یاقوت) جڑے ہوئے۔[۵۴] عطیہ فیضی کے بارے میں بیگم برلاس اپنی رائے کا یوں اظہار کرتی ہیں۔

> عطیہ فیضی مشہور و معروف ہستی ہیں اور اس وقت کی بیدار مغز خواتین میں سے ہیں جو مشکل سے انگلیوں پر گنی جا سکتی ہیں۔ یہ وہ نازک وقت تھا جب عورت نے ترقی نہیں کی تھی وہ محض گھر کی چار دیواری میں جہالت کی چادر اوڑھے بقید حیات تھیں۔ موصوفہ نے بڑی ہمت اور حوصلے سے ان سنگ لاخ چٹانوں کو ہموار کر کے ترقی کے میدان میں دوڑ لگائی اور کامیابی حاصل کی۔ آپ مصنفہ ہیں اور آرٹ و موسیقی آپ کا محبوب مشغلہ ہے۔ خواتین کی تعلیم کی زبردست حامی، سوشل ورک سے بڑی حد تک دل چسپی رکھتی ہیں۔ سیاحت میں بھی دو قدم آگے رہی ہیں۔ کہتی تھیں دنیا کا کوئی کونہ نہیں چھوڑا ملک در ملک ہر قسم کی معاشرت کا عمیق مطالعہ کیا اور بے تعداد لیکچر بھی دیئے۔[۵۵]

عطیہ بیگم کی ۵ دسمبر ۱۹۱۳ء میں رحمین سے شادی ہوئی[۵۶] جو ایک مشہور آرٹسٹ تھے۔ ان کی مصوری کے شاہکار نمونے نیشنل گیلری کراچی کے علاوہ پیرس، فرانس کی آرٹ گیلری کے لیے حاصل کیے گئے تھے۔[۵۷] ان دونوں کی پہلی ملاقات ریاست جنجیرہ میں نازلی بیگم کی رہائش گاہ پر ہوئی۔ رحمین وہاں محل کی آرائش و زیبائش کرنے کی غرض سے آتے تھے اور عطیہ بیگم رحمین کی شخصیت کے ساتھ ساتھ ان کے فن سے بھی بہت متاثر ہوئیں۔ دونوں کی قربت رفتہ رفتہ بڑھی اور رحمین نے بالآخر رشتہ بھیجا جو کہ قبول کر لیا گیا۔ شادی کے بعد رحمین فیضی نے زندگی کے ہر موڑ پر عطیہ فیضی کا ساتھ دیا اور وہ سماجی کاموں میں بھرپور

طریقے سے حصّہ لینے لگیں۔ ضیا الدین برنی ان دونوں کے تعلقات کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ان کے (رحمین) تعلقات اپنی بیوی عطیہ بیگم کے ساتھ انتہائی محبت کے اور شریفانہ تھے۔ وہ گھر میں عورت کی بالا دستی کے قائل تھے اور کہتے تھے کہ سکون کی زندگی اسی طرح حاصل ہو سکتی ہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ عورت مرد سے افضل ہے۔ اس لیے کہ اس کے بغیر آدم کی زندگی نامکمل تھی۔ [۵۸]

عطیہ بیگم پہلی مرتبہ ۱۹۰۶ء میں انگلستان گئیں اور وہ یورپ جا کر تعلیم حاصل کرنے والی پہلی مسلمان خاتون تھیں۔ انھیں انگریز حکومت نے وظیفہ دے کر یورپ کے سفر پر روانہ کیا اور اس سفر کی روداد کو عطیہ بیگم نےاپنی خود نوشت زمانہ تحصیل میں بیان کیا۔اس سفر کے علاوہ انھوں نے اپنی بڑی بہن نازلی بیگم کے ہمراہ ۱۹۰۸ء میں یورپ کا سفر کیا ۔ یہ سفر بھی بڑا خوشگوار تھا۔ اس سیاحت میں انھوں نے مختلف لوگوں سے ملاقاتیں بھی کیں۔ اس سفر کی روداد کو ان کی سب سے بڑی بہن زہرا بیگم فیضی نے سیرِ یورپ کے نام سے شائع کیا۔

عطیہ فیضی کو لڑکیوں کی تعلیم سے خصوصی دل چسپی تھی اور وہ انگریزی طرز کی تعلیم اور تعلیمی ادارے قائم کرنا چاہتی تھی جس میں اسلامی تعلیم کا بھی خیال رکھا جائے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے ۱۹۲۸ء میں بمبئی میں مسلمان لڑکیوں کے لیے ایک پرائمری ماڈل سکول قائم کیا جس میں اردو، قرآن مجید اور انگریزی کو لازمی مضمون کے طور پر متعارف کروایا۔ جس کے نتائج سے متاثر ہو کر انھوں نے ایسے سکولوں کی مزید شاخیں قائم کرنا چاہیں۔ عطیہ فیضی نے انجمن نسواں کی بنیاد بھی ڈالی جس کے مقاصد میں سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ہندوستان کے ہر شہر اور قصبے میں لڑکیوں کے سکول قائم کیے جائیں۔ [۵۹] عطیہ فیضی جس کام میں ہاتھ ڈالتی اس کو کامیاب بنا کر چھوڑتی تھیں۔ وہ اپنی پوری زندگی میں مصروف کار نظر آتی ہیں۔ کبھی وہ عورتوں کی تعلیم کی اسکیموں کی جانب متوجہ ہوئیں، کبھی موسیقی کو پھیلانے کے لیے کوشاں رہیں، کبھی وہ باغبانی کی

اہمیت پر تقریریں کر رہی ہیں تو کبھی سیاست ان کا پسندیدہ موضوع بنتی ہے۔ وہ ایک دلیر اور بے باک خاتون تھیں۔ انھوں نے اپنی جوانی بڑے شاہانہ اندا ز میں بسر کی اور قیامِ پاکستان کے بعد کراچی آگئیں۔ آخری عمر میں حالات اور بیماری نے تنگ دست کر دیا اور اسی حالت میں ۴ جنوری ۱۹۶۷ء کو کراچی میں وفات پائی۔

۶۔ بیگم صغرا ہمایوں

جن خواتین نے ہندوستان میں تعلیم نسواں کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا ان میں صغرا ہمایوں کا نام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ نہ صرف تعلیم نسواں کی حامی تھیں بلکہ حقوق نسواں اور آزادیٔ نسواں کے لیے بھی انہوں نے آواز بلند کی۔ انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ عورتوں کی تعلیمی اور معاشرتی اصلاح کے لیے بہت سی کوششیں کیں۔ وہ تحریک نسواں کی سرگرم رکن تھی۔ انہوں نے ہندوستانی خواتین کو بیدار کرنے اور ان کی حالت کو بہتربنانے کے لیے بہت سے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ اسی بنا پر شاد عظیم آبادی نے اپنے بعض مکتوبات میں انھیں ’’سرتاج خاتون ہند‘‘ کہا ہے۔ [۶۰]

صغرا ہمایوں کا اصل نام صغرا [۶۱] اور تخلص حیا [۶۲] تھا۔ وہ ۱۸۸۴ء میں صفدر علی مرزا کے ہاں پیدا ہوئیں ۔ [۶۳] ان کا تعلق حیدر آباد کے ایک اعلیٰ خاندان سے تھا ان کے دادا ترکی النسل تھے جو آصف جاہ ثانی کے عہد میں حیدر آباد آکر سکونت پذیر ہو گئے تھے اور وہاں انہوں نے شمشیر سازی کا ایک کارخانہ بھی قائم کیا تھا۔ [۶۴] صغرا ہمایوں ایک کھاتے پیتے اور تعلیم یافتہ گھرانے میں پید اہوئی اس گھرانے کا مغل دورِ حکومت میں ایک خاص مقام و مرتبہ تھا۔ اس خاندان میں تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔صغرا ہمایوں کے والد صفدر علی مرزا بھی حیدر آباد کے ایک مشہور و معروف ڈاکٹر تھے۔ [۶۵] وہ ایک ماہرطبیب ہونے کے ساتھ ساتھ بہت سی تصانیف کے مصنف تھے جن کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

شہزادہ یوسف و حکیم بلوھر

یہ کتاب فلسفہ پر مشتمل ہے اور یہ فلسفہ الہیات وحکمت کا خزانہ ہے۔

نعمت عشق

یہ نثری رسالہ تصوف و عرفان پر ہے۔

رسالہ علاج ہیضہ اور رسالہ حفظانِ صحت

یہ دونوں کتابیں طب پر مشتمل ہیں۔

بیگم صغرا جس زمانے میں پیدا ہوئیں اس وقت ہندوستانی عورتیں گھر کی چار دیواری تک محدود تھیں اور انھیں رسمی تعلیم حاصل کرنے کی آزادی نہ تھی۔ہندو گھرانوں میں لڑکیوں کو مدرسوں میں بھیجنے کا رواج تھا مگرمسلمان گھرانوں میں عورتوں کی تعلیم صرف گھر پرہی قرآن اور فارسی کی چند کتب تک تھی۔باقاعدہ مشنری سکولوں میں جانے کی ممانعت تھی۔ ان کی تعلیم اور آزادی پر ہندوستانی تہذیب و معاشرت نے پہرے لگائے ہوئے تھے اور مسلمان گھرانوں میں عورتوں کی تعلیم کی سختی سے ممانعت تھی۔ لڑکیوں کے لیے صرف سلائی و کڑھائی کو کافی سمجھتے ہوئے ان کے لیے سکولوں کا انتظام نہ تھا اور شرفا اپنی بیٹیوں کو سکولوں میں بھیجنا بے حیائی تصور کرتے تھے۔ ایسے حالات میں صغرا ہمایوں کی تعلیم وتربیت گھر پر ہی ہونے لگی ان کے لیے گھر پر ہی استاد کا انتظام کر دیا گیا۔ صغرا ہمایوں چونکہ بچپن سے ہی بڑی چست و چالاک اور پڑھنے کی شوقین تھی انھوں نے تعلیمی سلسلے کو بڑے ذوق و شوق سے جاری رکھا اور اپنے علم میں برابر اضافہ کرتی رہیں۔ ان کی شادی پٹنہ کے ایک معزز نواب گھرانے میں ہوئی۔[۶۶] ان کے شوہر سیّد ہمایوں مرزا پیشہ کے لحاظ سے بیرسٹر تھے۔ مرزا ہمایوں خود بھی صاحب ذوق تھے اور ادب سے گہری دلچسپی رکھتے تھے انہوں نے بہت سی تصانیف تخلیق کیں جن کی تفصیل یہ ہے۔

کرشمہ و تقدیر

یہ کتاب تین سو صفحات پر مشتمل ہے اور دہریہ اس کے مطالعہ سے واجب الوجود کا قائل ہو جاتا ہے۔

آثار صنادید دکن

قدیم عمارات کے تاریخی حالات دلچسپ پیرائے میں بیان کیے ہیں۔

مختصر تاریخ جاپان

اس میں جاپان کے تاریخی احوال کے ساتھ ساتھ جغرافیہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

حالات ابن رشد

اس کتاب میں ابن رشد کے حالاتِ زندگی بیان کیے ہیں۔

(مذکورہ بالا تصانیف کی تفصیل صغرا ہمایوں کے سفرنامے کے آخری صفحات سے لی گئی ہیں) [۶۷]

سیّد ہمایوں مرزا اپنے عہد کی بہت بڑی شخصیت تھے ۔ ان کا پیشہ تو قانون تھا مگر وہ علمی و ادبی سرگرمیوں میں خود بھی سرگرم تھے اور بیگم صغرا کا بھی ان کے علمی و ادبی کاموں میں ساتھ دیتے تھے۔ وہ خود بھی سیاحت کے شوقین تھے اور بیگم صغرا کے ساتھ بہت سے ملکوں کی سیر کی۔ا س سیاحت کے دوران صغرا ہمایوں نے دوسرے ملکوں کی تہذیب ومعاشرت، سیاست، ثقافت اور تعلیم نسواں کا بغور مشاہدہ کیا اور انھوں نے اس بات کا شدت سے احساس کیا کہ ہندوستانی عورت زندگی کے میدان میں باقی قوموں سے بہت پیچھے ہیں۔ وہ عورتوں کی فلاح اور انھیں ان کے حقوق کا احساس دلانے کے لیے تعلیم نسواں اور انجمن خواتین دکن کی روح رواں بنی۔ انھوں نے بہت سی تحریکوں میں شمولیت بھی اختیار کی۔ عورتوں کی فلاح و بہبود او رترقی کے لیے کئی جگہوں پر سکول قائم کیے۔ نصیر الدین ہاشمی صغرا کی خدمات کو سراہتے ہوئے کہتے ہیں۔

> صغرا ہمایوں کا سب سے بڑا کارنامہ ہندوستان کی مسلمان عورتوں کو جدید تعلیم کی طرف راغب کرنا اور انھیں اپنے حقوق کے لیے منظم کرنا، اس مقصد کے لیے انھوں نے نہ صرف ایک تحریک شروع کی بلکہ ان تمام تحریکوں کی حمایت بھی کی جو اس مقصد کے لیے چلائی جا رہی تھیں۔ انھوں نے ہمایوں نگر میں ایک زنانہ اسکول قائم کیا۔ [۶۸]

بیگم صغرا ہمایوں درد مند دل رکھنے والی ایک سماجی کارکن تھی انھوں نے ساری زندگی حقوق نسواں کی جنگ لڑی۔ انھیں مسلم خواتین کی ترقی اور بہبود سے بڑی دلچسپی تھی۔ انھوں نے پورے ہندوستان کی خواتین کو بیدار کرنے کے لیے بہت سے مضامین لکھے اور بہت سے رسائل کی ایڈیٹر رہیں۔صغرا کی سرپرستی میں لاہور سے مجلہ ''تہذیب النسواں'' کا اجرأ ۱۸۹۸ء میں ہوا تھا۔ آزادی نسواں، تعلیم نسواں کی حامی خاتون تھی۔[۶۹]

انھوں نے عورتوں کی زبوں حالی کو دور کرنے اور انھیں تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کی کوششیں کیں۔ ان کا خیال تھا کہ عورتوں اور مردوں کے درمیان کچھ زیادہ فرق نہیں لیکن بدقسمتی سے ہمارے معاشرے نے عورتوں کو جاہل اور مجبور بنا رکھا ہے۔ اگر عورت کو بہتر تعلیم و تربیت دی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ بھی مردوں کی طرح زندگی کے ہر میدان میں اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کا مظاہرہ نہ کر سکیں۔ انھوں نے مسلمان عورتوں میں ایک ذہنی انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی اس مقصد کے لیے انھوں نے بہت سے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ انھوں نے بہت سے سفرنامے، ناول اور مضامین شائع کیے۔ ان کے مضامین کا مجموعہ مقالاتِ صغرا بھی شائع ہو چکا ہے۔ انھوں نے صحافت کے میدان میں قدم رکھا اور ایک عرصے تک حید آباد سے رسالہ النساء کی ادارت سنبھالی اور زیب النساء (لاہور) کی بھی آپ ایڈیٹر رہیں۔[۷۰] بیگم ہمایوں اپنے عہد کی ایک مشہور مصنفہ، سماجی اور تعلیمی تحریک کی سرگرم رکن تھیں انھوں نے تعلیم نسواں کی ترقی میں نہ صرف عملی اقدام کیے بلکہ خواتین میں شعور بیدار کرنے کے لیے کثرت سے مضامین بھی لکھے جن کی تفصیل کچھ یوں ہیں۔

خوشی، خوشامد، بی بی کا خط ، سنگھار، کشمیر کی سلک فیکٹری ، خط و کتابت ، ٹیکسلا اور اس کا نواح ،حور کی نظر، دستر خواں پر ،ایرانی مہمان داری، پرانے کا غذوں کی دیکھ بھال ، ہمایوں نگر کا حجام ، مرد کے فرائض ، گردے کی پتھری کا علاج ، میاں بیوی کے خطوط ،ایک نیک بی بی کی وفات ، کفایت شعاری ، بننا بگڑنا ، بسم اللہ کی رسم ، لندن کا

طریقہ خیرات ، عورت اور اسلام ، یوگنڈہایم ، لندن کا چڑیا گھر، بیت المعذورین جرمنی، زبان اردو، گورستان لندن ، جرمنی کا ورزش خانہ، سوچ، تیر کے شکار پر انعام، قطب شاہی عمارات،،آپ امیر ہیں میں غریب ، بی بی کا خط ، دشمنی ، میرا سنگ مزار، مصیبت زدگان ، خواتین ہند کا کلام ، جرمنی میں شادی۔(یہ تمام مضامین بالا تہذیب نسواں اور عصمت سے لیے گئے ہیں) [71]

صغرا بیگم نے اپنی ان تمام تحریروں کے ذریعے عورتوں کی تعلیمی و معاشرتی اصلاح کی کوشش کی۔ ایک طرف تو انھیں تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دی تو دودسری طرف اپنے مضامین اور تقاریر کے ذریعے ان کے اندر پیوستہ سماجی و معاشرتی خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے ہندوستانی مسلمان عورتوں کو یہ باور کرایا کہ تعلیم ہی وہ واحد حربہ ہے جس سے انسان تمام برائیوں کا خاتمہ کر سکتا ہے۔ اسلام میں تعلیم کی اہمیت سے آگاہ کیا اور سمجھانے کی کوشش کی کہ تعلیم کسی مخصوص طبقہ اور مخصوص جنس کے لیے نہیں ہے بلکہ سب کے لیے یکساں ہے، عورتوں کو اس کی زیادہ ضرورت ہے کیونکہ عورت نسلوں کو پروان چڑھاتی ہے۔ بیگم صغرا ہمایوں کی خدمات کے متعلق طیبہ خسرو کہتی ہیں کہ صغرا بیگم کی اولو العزمی اور عورتوں کے مسائل سے گہری دلچسپی اور لگاؤ نے لاکھوں پردہ نشین خواتین کے اندھیرے راستے میں اُجالے پیدا کر دیئے۔ ان میں عام بیداری پیدا کر دی کہ وہ خود اپنی منزل پہچان سکیں۔ [72]

صغرا ہمایوں نے ہندوستانی معاشرے کے فرسودہ رسم و رواج کے خلاف قلمی اور عملی جہاد کیا۔ انھوں نے مسلمان عورتوں کو تعلیم کی اہمیت سے روشناس کرانے کے لیے بہت سی اصناف میں طبع آزمائی کی۔ ناول اور سفر نامہ نگاری میں بھی ان کا ایک خاص مقام و مرتبہ ہے۔ انھیں سیر و سیاحت کا بے حد شوق تھا اور واپسی پر انھوں نے بہت سے سفرنامے تخلیق کیے مثلاً سفرنامہ یورپ، سفرنامہ عراق، سفرنامہ پونا و مدراس ، سیر بہار و بنگالہ ،روزنامچہ سفربھوپال، آگرہ ،دہلی ،کے حالات ، ہمارا کاٹھیاوار کا سفر ،

سیاحت جنوبی ہند، سفرنامہ مدراس و والیٹراور رہبر کشمیر وغیرہ۔

یہ تمام سفر نامے بیگم صغراکے اسفار کی یاد گار ہیں، ان سفرناموں میں حقوق نسواں کے لیے کوشاں نظر آتی ہیں۔ سفر ہندانهوں نے مختلف کانفرنسوں میں شرکت کے لیے اختیارکیۓ کیونکہ وہ انجمنِ خواتین دکن کی سر گرم رکن تهیں۔ان مقامی سفرناموں میں انهوں نے ہندکی تہذیب و معاشرت ، تاریخ ،اور جغفرافیۓ کو بڑے سہل انداز میں بیان کیا ہے ۔ بیگم صغرا کو چونکہ سیاحت سے بے حد دلچسپی تهی اور یہ شوق انهیں یورپ کی سیاحت پر لے گیا۔اس سفر سے واپسی پر انهوں نےسفرنامۂ یورپ شائع کیا۔یہ سفرنامہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں انهوں نے ہالینڈ ، جرمنی، اٹلی، فرانس اور لندن کا احوا ل بڑی تفصیل کے ساته قلم بند کیا۔ اس سفرنامے میں وہ مغربی چکا چوند سے متاثر نظر آتی ہیں۔ان سفرناموں کے علاوہ ان کی حسب ذیل تصانیف ہیں۔

مشیر نسواں

اسم بامسمیٰ، علم وہنر کا خزانہ ہے۔ اس ناول پر انهیں طلائی تمغہ عطا ہوا اور یہ ناول ہندوستانی معاشرت کو اجاگر کرنے میں اہمیت کا حامل ہے۔

سرگزشت ہاجرہ

یہ خواتین کے لیے لکها گیا اصلاحی ناول ہے۔اس میں انهوں نے عورتوں کی تعلیم و تربیت اور ازواجی زندگی کے کامیابی کے اصولوں کو بیان کیا ہے۔بیگم صغرا نے اپنے تمام ناول اصلاحی مقصد کے تحت لکهے۔وہ اپنے ناولوں میں عورتوں کے گهریلو مسائل آشکار کرکے ان کا حل بهی بتاتی ہیں۔

موہنی

اس ناول میں ایرانی تہذیب و معاشرت میں مافوق الفطرت عناصر کو شامل کر کے بیان کیا گیا ہے اس پر داستانوی رنگ غالب ہے۔

تحریر النساء

صغرا ہمایوں کی یہ تصنیف انشائیہ نگاری و انشا پردازی پر مبنی ہے۔ یہ اس فن پر سب سے پہلی تصنیف ہے۔

سفینہ نجات

یہ تصنیف نوحہ جات پر مشتمل ہے۔

مجموعہ نصائح

آوازِ غیب۔ گلشن ترنم۔ نصیحت کے موتی۔ بی بی طوریٰ کا خواب۔

سالانہ رپورٹ انجمن خواتین دکن

یہ کتاب انجمن کے عملی کارناموں اور بیگمات کی تقریروں پر مشتمل ہے۔

(مذکورہ بالا تمام تصانیف کی تفصیل صغرا ہمایوں کے سفرنامہ یورپ کے آخری صفحات سے لی گئی ہیں) [۷۳]

صغرا ہمایوں نہ صرف اپنے عہد کی ایک ممتاز سفرنامہ نگار اور ناول نگار تھی بلکہ خدا نے انہیں بے شمار صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ وہ ایک وقت میں صحافی، مضمون نگار، اچھی مقرر ، سماجی کارکن، ناول نگار ، سفرنامہ نگار اور شاعرہ بھی تھیں۔ انھوں نے الگ الگ اصناف میں طبع آزمائی کی اور اپنے آپ کو منوایا۔ وہ بڑی عمدہ شاعری کرتی تھیں۔ مختلف رسائل میں ان کی غزلیں اور نظمیں شائع ہوتی رہی ہیں اور وہ حیاؔ تخلص کر تی تھیں۔ ان کی مختلف اصناف میں مہارت کے بارے میں نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں کہ صغرا ہمایوں کی شخصیت بڑی پر کشش تھی۔ انھیں بیک وقت کئی ادب میں دخل تھا انھوں نے ناول اور افسانے لکھے، سوانح اور سفرنامے مرتب کیے، مضامین لکھے اور شاعری بھی کی۔ ڈاکٹر علامہ اقبال نے ان کی ایک نظم پر اصلاح دی تھی۔[۷۴]

صغرا ہمایوں نے غزلوں، نظموں، رباعی کے علاوہ نوحے بھی لکھے۔ ان کے نوحے جات کی تصنیف ''سفینۂ نجات'' ہے۔ یہاں بطور نمونہ ان کی ایک فارسی غزل پیش کی جاتی ہے، یہ اُن کی پہلی فارسی غزل ہے اس سے پہلے انہوں نے کبھی کچھ فارسی میں نہیں لکھا۔ وہ اپنی اس غزل کے بارے میں تہذیب النسواں کے ۱۷اگست ۱۹۴۳ء کے شمارے میں لکھتی ہیں:

'میں قندیل کے بیٹھ کر فارسی میں اشعار لکھنا چاہ رہی ہے اور بآواز بلند پڑھتی بھی جاتی ہے۔ بیرسٹر صاحب یہ اشعار سن کر مجھے کہتے ''کیوں کفر کہہ رہی ہو ایسے اشعار نہ لکھو'' میں کہتی، ''تھوڑی دیر مجھے کہہ لینے دو'' مگر وہ مجھے منع کرتے ہی گئے۔ لیکن میرا قلم نہیں رکا۔ تھوڑے سے اشعار جو لکھے وہ پیش کرتی ہوں۔ یہ مری پہلی فارسی غزل ہے۔ میں نے اس سے قبل فارسی میں کبھی کچھ نہیں لکھا۔'[75]

یہاں یہ طویل اقتباس دینے کا مطلب یہ ہے کہ میری مندرجہ بالا بات کی شہادت اُن کے اپنے قول سے ثابت ہو جائے۔ صغرا ہمایوں کی فارسی غزل ملاحظہ کریں۔

گہے باراں گہے گرما گہے
باد صبا ہستم
گہے سجدہ گہے کعبہ گہے
بدر الدجیٰ ہستم
گہے تیرہ گہے روشن گہے
آتش فشاں ہستم
گہے زندہ گہے مردہ گہے
خاک شفا ہستم
منم ساقی۔ منم ساغر۔
منم بادہ۔ منم آدم
منم گریاں ۔ متم خداں و
من باد فنا ہستم
منم خاکی۔ منم بادی۔منم
آبی۔ منم خارا
منم قائم منم دائمن من
اسرار بقا ہستم

منم رحمتے منم زحمتے
منم جادو منم افسوں
منم دوزخے منم جنتے منم
ارض و سما ہستم
زمیں دارم زماں دارم فلک
دارم ملک ارم
نہ من دانم کہ کہ ہستم
کجا بودم کجا ہستم
حیاتے گر تو بقا خوای بیا
آنجا کہ من گویم
گہے یاد خدا باشی کہ من
یاد خدا ہستم [۷۶]

ترجمہ:

کبھی بارش،کبھی گرمی،کبھی صبح کی ہوا ہوں
کبھی سجدہ،کبھی کعبہ، کبھی چمکتا ہوا چاند ہوں
کبھی تاریکی، کبھی روشنی،کبھی آتش فشاں ہوں
کبھی زندہ ،کبھی مردہ،کبھی شفاکی مٹی ہوں
میں ساقی ،میں ساگر ، میں شراب ،میں آدم ہوں
میں روتی، میں ہستی، میں فنا ہونے والی ہوا ہوں
میں مٹی ہوں ،میں صحراہوں، میں پانی ہوں ، میں کانٹا ہوں
میں قائم ہوں ،میں ہمیشہ ہوں، میں زندگی کا راز ہوں
میں رحمت ہوں ، میں زحمت ہوں،
میں جادو ہوں،میں منتر ہوں
میں دوزخ ہوں ،میں جنت ہوں، میں

زمین و آسماں ہوں
زمیں ، زمانہ ،آسمان رکھتی ہوں،
سلطنت رکھتی ہوں
میں نہیں جانتی میں کون ہوں، کہاں تھی، کہاں ہوں
حیاؔ اگرتم بقاء چاہتی ہو،یہاں آؤ،تاکہ میں بولو
کبھی خدا کو یاد کرو،کہ میں خدا کی یاد ہوں

بیگم صغرا نے جس طرح اصناف نثر کی مختلف صنف میں اپنی خداداد صلاحیتوں کو منوایا اسی طرح شعری اصناف میں بھی کامیابی سے ہمکنار ہوئیں۔ انھوں نے نہ صرف غزل اور نوحہ لکھے بلکہ رباعی جیسے مشکل میدان میں بھی قدم رکھا۔ رباعی شعری اصناف میں سے ایک مشکل میدان ہے۔ اس میں بہت کم لوگ کامیابی سے پار اترنے میں کامیاب ہوتے ہیں مگر صغرا ہمایوں اردو ادب کا ایک ایسا درخشاں ستارہ ہے۔ جو ہر افق پر خوبصورتی سے چمکا ہے۔ ان کی یہ چکا چوند رباعی کے میدان میں بھی نظر آتی ہے۔ بطور نمونہ رباعی پیش کی جاتی ہے۔

رباعی

خیمہ زد ابر بہاراں درمیان کوہسار
غنچہ خنداں لالہ حیراں بام ودرچوں سبزہ زار
برکنارہ رود کوخر دیدنی است اے حیا
جام گلگوں ساقی گلرو و شب ماہ لالہ زار[۷۷]

ترجمہ:

ابر بہار نے پہاڑوں پہ ڈیرے ڈال لیا
غنچے مسکرانے لگے لالے حیران اوربام

ودرسبزۂ زار ہو گئے
اے حیا رود کوثر کے کنارے قابل دید ہے
گل رنگ پیالے ، گلرو ساقی اور چاندنی
رات

(اردو ترجمہ بشکریہ ڈاکٹر جواد ہمدانی صاحب)

بیگم صغرا ہمایوں غیر معمولی صلاحیتوں کی مالک تھیں۔ انھوں نے ادب و صحافت ، شاعری اور سیاست و معاشرت کے میدانوں میں شاندار کارنامے انجام دیئے۔ متعدد سفرناموں کے علاوہ ناول اور سینکڑوں مضامین بھی لکھے۔ انھوں نے چھوٹی عمر میں لکھنا شروع کیا اور تادمِ آخر ان کا قلم رواں رہا۔ اس زمانے کا شاید ہی کوئی ایسا رسالہ ہو گا جس میں ان کی تحریر شائع نہ ہوئی ہو اور بیداریِ نسواں کا کوئی ایسا پلیٹ فارم نہیں یہاں اُن کی آواز کی گونج نہ ہو۔ وہ ساری زندگی حریت نسواں کے لیے کوشاں رہیں۔

۷۔ بیگم حسرت موہانی (سیّدہ نشاط النساء)

بیگم حسرت موہانی ۱۸۸۵ء کو بھارت کے صوبہ اترپردیش کے ایک ضلع اناؤ کے قصبہ موہان میں پیدا ہوئیں۔[۷۸] ان کی پیدائش کے بارے میں مولانا حسرت کی صاحبزادی نعیمہ بیگم لکھتی ہیں کہ تاریخ پیدائش شاید ان کو (مولانا کو) خود بھی معلوم نہ تھی لیکن اس سلسلے میں اگر کبھی والدہ ماجدہ اپنا ذکر کرنے لگتیں تو مولانا ان سے فرمایا کرتے تھے کہ تم اپنا ذکر نہ کرو۔ تم چودھویں صدی کی ہو اور میں تیرھویں صدی کا۔[۷۹]

ان کے والد سید شبیر حسین موہانی جو کہ ریاست حیدرآباد کے ایک شہر رانچور میں منتقل ہو گئے تھے اور وہاں

وکالت کرنے لگے مگر ان کا موہان سے تعلق ہمیشہ قائم رہا کیونکہ وہ اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت اپنے بزرگوں کے زیرِ

سایے چاہتے تھے اور وہ موہان آتے رہتے تھے۔ اس طرح بیگم حسرت کے بچپن کا بڑا حصہ وہیں گزرا۔

بیگم حسرت کا اصل نام سیدہ نشاط النساء بیگم تھا اور ان کا تعلق سادات گھرانے سے تھا۔ وہ سید شاہ وجیہ الدین کی پانچویں پشت میں سے تھیں۔[80] سید شاہ وجیہ الدین کا سلسلہ نسب حضرت امام موسیٰ سے ملتا ہے۔ اس طرح یہ خاندان علم و فضل میں برکت رکھتا تھا۔

بیگم نشاط النساء کی والدہ سیدہ منصور النساء مولانا حسرت کی پھوپھی تھیں اور اسی طرح والدہ حسرت سیدہ شہر بانو نشاط النساء کی پھوپھی تھیں۔ قریبی رشتہ داریاں ہونے کی وجہ سے خاندان میں ہی باہم شادی کرنے کا رواج تھا۔ نشاط النساء کا چونکہ بچپن قصبہ موہان میں ہی گذرا جو کہ مولانا حسرت کا ننھیال اور نشاط بیگم کا ددھیال تھا۔ یہ خاندان مذہب کا سختی سے پابند تھا اور بچوں کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دیتا تھا۔ بیگم نشاط کی تربیت ان کی دادی کے زیرِ سایہ ہوئی جو کہ خود بھی زیورِ تعلیم سے آراستہ تھیں۔ وہ نہایت وسیع القلب اور وسیع النظر تھیں۔ ان کا معمول تھا کہ وہ خاندان کے ہر فرد پر نظر رکھتیں بلکہ اہلِ قصبہ کی فلاح و بہبود کو بھی عزیز رکھتی تھیں۔ نشاط بیگم نے تعلیم کے معاملے میں اپنی دادی کے رجحان کو اپنایا اور ان کی زندگی کے مقصد کو آگے بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا اور ۱۹۲۴ء میں اس قصبہ میں ایک ہائی سکول بھی قائم ہو گیا تھا۔[81] نشاط بیگم کے والد سید شبیر حسین تعلیم یافتہ اور روشن خیال انسان تھے۔ انہوں نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر مکمل توجہ دی اور اس سلسلے میں بیٹی اور بیٹوں میں کوئی تخصیص نہیں رکھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لڑکیوں کی تعلیم کا رواج نہ تھا صرف قرآن، فارسی کی چند کتب اور دینی تعلیم کو کافی سمجھا جاتا تھا مگر سید شبیر حسین نے اپنی بیٹی کے لیے اردو، فارسی اور عربی کی ممکنہ تعلیم فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ رسمی تعلیم پر بھی وجہ دی۔ نشاط بیگم نے چھوٹی سی عمر سے باقاعدہ تعلیم کا آغاز کیا اور وہ صوم و صلوٰۃ کی پابند تھیں۔ پرنسپل عبد الشکور ان کی تعلیم کے متعلق لکھتے ہیں:

> چونکہ سادات موہان میں علم و کمال کا چرچا شروع سے ہی تھا۔ اس لیے محترمہ نشاط النساء بیگم اودھ کی عام لڑکیوں کی طرح زیور علم سے محروم نہ رہیں۔ آپ کو مذہبی تعلیم کے علاوہ اردو، فارسی اور عربی زبانوں کی معقول تعلیم دلائی گئی۔ زمانہ دوشیزگی میں آپ کا مشغلہ یہ تھا کہ پس ماندہ قصبہ کی لڑکیوں کو لکھنا پڑھنا سکھاتی تھیں اور اگر آج موہانی میں تعلیم نسواں کی جھلک نظر آتی ہے تو محترمہ نشاط النساء کی کوشش اور مالی ایثار کا ثمرہ ہے۔ [۸۲]

نشاط بیگم جو کہ چار دیواری میں پلی بڑھیں تھیں مگر انھوں نے فکر و شعور کا سفر کم عمری میں ہی طے کر لیا۔ انھیں نہ صرف اپنی تعلیم بلکہ قصبہ کی دوسری لڑکیوں کی تعلیم اور ترقی کی فکر تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ دینی فرائض میں بھی غفلت نہ کی۔ انھوں نے اپنے خاندان کے دیگر افراد کی مانند چھوٹی سی عمر میں حضرت شاہ عبد الوہاب کے ہاتھ بیعت کی اور ان کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئیں۔ ان سے عقیدت کا یہ رشتہ زندگی بھر قائم رکھا۔

سیدہ نشاط النساء کے خاندان میں ایک تو کم عمری اور دوسرا خاندان میں ہی شادی کرنے کا رواج تھا۔ مولانا حسرت اور نشاط بیگم کا بچپن اکھٹے گذرا اسی وجہ سے وہ نہ صرف ایک دوسرے کے مزاج شناس تھے بلکہ پسندیدگی کا عنصر بھی پایا جاتا تھا۔ خاندان کے بزرگوں کے فیصلے کے مطابق ان کی شادی ۱۸۹۸ء میں ہوئی۔[۸۳] اس وقت نشاط النساء کی عمر تقریباً ۱۵ سال اور مولانا حسرت ۱۹ سال کے تھے اور علی گڑھ کالج کے طالب علم تھے۔ شادی کے بعد ۱۹۰۳ء میں مولانا حسرت اپنے ساتھ علی گڑھ لے گئے۔ اسی سال مولانا نے سیاست اور صحافت میں حصہ لیا اور نشاط بیگم اپنی زندگی کے آخری سانس تک اپنے شوہر کی رفیق اور غمخوار رہیں۔ وہ آزادی کی جدوجہد اور مزدوروں کے حقوق کے لیے مولانا حسرت کے ساتھ مل کر لڑتی رہیں۔ مولانا حسرت کی شخصیت کو مکمل کرنے میں بیگم نشاط کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ بیگم حسرت کی وفاشعاری کے متعلق ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> سیدہ نشاط النساء نے ایک باوفا بیوی ہونے کا پورا ثبوت اس طرح دیا کہ ہر موقعے اور ہر جگہ اپنے شوہر کے ساتھ شریک کار رہیں خواہ علمی زندگی ہو یا ادبی یا سیاسی سرگرمیاں ہاتھ بٹاتی رہیں۔ [۸۴]

بیگم حسرت اور مولانا حسرت کا اڑتالیس سال کا ساتھ تھا۔ انھوں نے عملی اور قلمی میدان میں ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ مولانا نے جب عہد کیا کہ وہ ہمیشہ دیسی چیزیں استعمال کریں گے تو بیگم حسرت نے اس معاملے میں بھی ان کا ساتھ دیا۔ وہ اپنے ہاتھ کے بنے سوت کے کپڑے پہنتی رہیں۔ انھوں نے چہرے کا پردہ کبھی نہیں کیا مگر اپنا سر اور جسم ہمیشہ ڈھانپ کر رکھا۔ مولانا حسرت نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ قید و بند میں گزارا۔ وہ جب جیل جاتے تو ان کی غیر موجودگی میں رسالے، کتابوں، پریس اور سٹور کا کام وہ خود سنبھالتی تھیں۔ کئی دفعہ ان کے گھر کے حالات اس قدر خراب ہوئے کہ وہ اجرت پر لوگوں کے کپڑے سی کر اور کاغذ کے لفافے بنا کر روزی کماتیں مگر کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاتیں اور اگر کسی نے ان کی مدد کرنا چاہی تو انھوں اس پیش کش کو بڑے پیار سے ٹھکرا دیا۔ نشاط النساء بیگم کے یہاں ۱۷ فروری ۱۹۰۷ء میں ایک بیٹی پیدا ہوئی جس کا نام انھوں نے نعیمہ بیگم رکھا۔ نعیمہ ابھی ایک برس کی تھی کہ مولانا کے رسالے اردوئے معلیٰ میں برطانوی پالیسی کے خلاف کسی طالب علم کا مضمون چھپا جس کے جرم میں مولانا کو پہلی بار دو سال کی سزا ہوئی مگر ان حالات میں بیگم حسرت نے چھوٹی سی بچی کی ذمہ داری کے ساتھ اس مقدمے کی بھی پیروی کی۔

بیگم حسرت صرف قید میں ہی مولانا کی حوصلہ افزائی نہیں کرتی تھیں بلکہ سیاست کے میدان میں بھی مولانا کے قدم بہ قدم ہم سفر رہیں۔ مولانا حسرت نے جس طرح کی کٹھن زندگی گذاری اور جس طرح کی مشکلیں جیل میں برداشت کیں وہ اپنی جگہ مسلم ہیں مگر اس سے زیادہ مشکلات حالات سے نبردآزما بیگم حسرت ہوتی رہی ہیں۔ اگر حالات، وقت اور قدیم پسماندہ ہندوستان میں ایک معمولی تعلیم یافتہ عورت کی جدوجہد اور مصائب سے بھری زندگی دیکھی جائے تو

بیگم حسرت اپنے صبر و ہمت، بے مثال جان نثاری اور وفا شعاری میں مولانا سے بہت آگے ہیں۔

بیگم حسرت کے لیے جس طرح سے ان کی اکلوتی بیٹی نعیمہ بیگم کی پیدائش ایک آزمائش تهی اسی طرح ان کی شادی بهی انهی حالات میں انجام پائی۔ اپریل ۱۹۲۲ءمیں ہندوستان میں تحریک عدم تعاون چل رہی تهی۔ ادهر گهر میں شادی کی تیاریاں عروج پر تهیں۔ ادهر پولیس نے مولانا سودیسی سٹور پر چهاپا مارا اور انهیں گرفتار کر لیا مگر بیگم نشاط نے مولانا کی ہدایت کے مطابق شادی کی تاریخ میں کوئی ردوبدل نہ کیا۔[85] بیگم نشاط ایک پختہ عقیدہ مسلمان خاتون تهیں۔ آپ حضرت شاہ عبد الوہاب فرنگی کی مرید تهیں اور حضرت شاہ عبد القادر جیلانی سے بهی بے حد عقیدت رکهتی تهیں۔ ان کی طبیعت ۱۹۲۵ء میں خراب رہنا شروع ہو گئی اور ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۶ء تک انهوں نے مولانا کے ساته حج کی سعادت حاصل کی۔ آخری حج کے سفر کے دوران اپنی بیٹی نعیمہ کو اپنے سفری واقعات و مشاہدات خطوط کی صورت میں روانہ کرتی رہیں۔ جو بعد میں سفرنامہ عراق کے نام سے شائع ہوا۔ اس سفر حج کے بعد ان کو ریڑه کی ہڈی کا کینسر ہو گیا جو جان لیوا ثابت ہوا اور انهوں نے ۸ اپریل ۱۹۳۷ء کو اس دارِ فانی سے کوچ کیا۔

۸۔شاہ بانو بیگم(میمونہ سلطان)

آپ کا اصل نام میمونہ سلطان اور سسرالی خطاب شاہ بانو بیگم ہے۔ آ پ کا تعلق افغانستان کے قبیلہ شہزادہ خیل سے تها۔آپ وائی کابل کے خاندان میں سے ایک شخص شہزادہ جہانگیر کی پوتی اور شہزادہ ہمایوں کی بیٹی تهیں۔[86] میمونہ سلطان کی تاریخ پیدائش کے بارے میں معلومات دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے اس کی پیدائش کا اندازہ اُن کے عقد کے سال سے لگائیں تو میمونہ سلطان کی عمر تب نو سال اور نواب حمید سلطان گیارہ سال کے تهے۔ ان کے عقد کے متعلق ڈاکٹر رضیہ حامد لکهتی ہیں:

> نواب سلطان جہاں بیگم نے حمید اللہ کا کم سنی میں
> عقد کر دیاتھا۔ افغانستان کے شہزادہ خیل کے ہمایوں
> جہانگیر کی بیٹی میمونہ سلطان سے، جن کی عمر
> عقد کے وقت نو سال اور حمید اللہ کی عمر گیارہ
> سال تھی۔[۸۷]

اس سے قیاس ہوتا ہے کہ میمونہ سلطان کی پیدائش تقریباً ۱۸۹۶ء کو پشاور میں ہوئی۔ نواب سلطان جہاں بیگم کی خواہش تھی کہ اپنے چھوٹے بیٹے حمید اللہ کے لیے ایک ایسی دلہن کا انتخاب کرے جو جدید تعلیم سے آراستہ اور دیگر اعلیٰ خصوصیات کی حامل ہو۔ اس عہد میں ایسی مثالی بہو کا ملنا ناممکن تھا۔ اس لیے بیگم نواب نے یہ صورت نکالی کہ اُس لڑکی کو اپنے محل میں رکھ کر تمام تر تربیت کی ذمہ داری وہ خود لیں ۔اس مقصد کے لیے انھوں نے اپنے ایک خاص وزیر قنداہادی خان کو شمالی مغربی سرحدی علاقے سے قدیم افغان نسل سے تعلق رکھنے والی لڑکی کی تلاش میں روانہ کیا۔ وزیرِ خاص نے بعد میں بتایا کہ انھوں نے چار سالہ میمونہ سلطان کو اپنے گھر کے باہر نلکے کے پاس کھڑا دیکھا اور فیصلہ کر لیا کہ یہی لڑکی نواب حمیداللہ کی بیوی بنے گی۔وزیرِ خاص جب والدہ میمونہ سے رشتے کی بات کرنے گیا تو میمونہ کی تصویر مانگنے پر گھر سے باہر نکال دیا اور کہا کہ اگر اس بچی کے والد زندہ نہیں تو کیا میں اس کی تصویر آپ کو اس لیے دوں کہ آپ کسی بگڑے نواب سے اس لڑکی کا رشتہ طے کریں کہ جس لڑکی کے اباؤ اجداد نے ماضی میں اس نواب کی سرزمین کو کئی دفعہ فتح تو کیا مگر وہاں رہنا خود گوارہ نہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی وزیر کو اپنے گھر سے چلے جانے کا حکم دیا مگر وزیرِ خاص نے ہمت نہ ہاری اور کسی اور ذرائع سے تصویر لے کر بھوپال واپس آگئے اور نواب بیگم کو لڑکی کی تصویر دکھانے کے ساتھ سارا قصّہ بھی بیان کیا۔[۸۸]

نواب سلطان جہاں کے لیے یہ بات ہی کافی تھی کہ انھیں دلہن پسند آگئی۔ اور ان کے نزدیک میمونہ کی والدہ کا رویّہ بھی اُن کی باوقار نسل کی سند تھا۔ نواب سلطان جہاں بیگم چھوٹی عمر کی شادی کے خلاف تھیں مگر اپنی بہو کو اپنے زیرِتربیت پروان چڑھانے کے خیال سے انھوں نے وزیرِ خاص

کے ذریعے انگریز افسران کو مطلع کرنے کے بعد رشتہ طے کر لیا اور ۱۹ اگست ۱۹۰۵ء بروز جمعرات ایک پارٹی کو بھوپال سے پشاور روانہ کیا تاکہ وہاں بارات کا انتظام کریں اور تاریخ طے کریں۔ ان دونوں کے نکاح کی تاریخ ۶ ستمبر ۱۹۰۵ء کو طے ہوئی۔[۸۹]

اس شادی میں جہاں شاہی شان و شوکت کا پورا اہتمام کیا گیا وہاں اس بات کا بھی خاص خیال رکھا گیا کہ کوئی فضول اور غیر شرعی رسم ادا نہ ہونے پائے۔ البتہ مستحقین اور خاندانِ ریاست کو بیش بہا جوڑے اور گراں قدر انعامات عطا کیے گئے اور اس کے ساتھ صدقے و خیرات اور غرباء میں پیسے تقسیم کیے گئے تھے۔ اس کم سنی کی شادی کے متعلق بیگم سلطان جہاں شادی کی تقریب میں اپنی تقریر میں یوں اظہار کرتی ہیں۔

> میں گمان کرتی ہوں کہ اس چھوٹے دولہا کو دیکھ کر آپ خیال کرتے ہوں گے کہ اس صغر سنی میں دلہن بیاہ لانے کی کیا ضرورت تھی۔ شاید آپ کو یہ بھی خیال ہو گا کہ ہندوستان کے رسم و رواج کا اثر مجھ پر بھی ہے اور صغر سنی کی شادی کو جو عموماً معیوب سمجھی جاتی ہے میں بھی مستحسن سمجھتی ہوں۔ میرا اصل مقصد شادی میں اس قدر عجلت کرنے کا یہ تھا کہ اپنی ننھی سی بہو کو اپنا نورِ نظر بنا کر اپنی نگرانی میں تعلیم و تربیت دے سکوں کیونکہ عمدہ تعلیم و تربیت کو مستورات کے لئے سب سے بہتر اور سب سے زیادہ خوشنما زیور سمجھتی ہوں۔[۹۰]

میمونہ سلطان کی تربیت نہایت عمدہ طور پر بیگم نواب سلطان کی زیرِ نگرانی ہوئی۔ میمونہ سلطان کے بالغ اور تعلیم یافتہ ہونے تک رخصتی نہیں کی گئی ،اس دوران انہوں نے شہزادیوں کی سی تعلیم حاصل کی۔ انہیں پردے کی پاسداری کراتے ہوئے قرآن، حدیث، عربی، فارسی، انگریزی، خوشخطی اور اسلامی تاریخ کی مکمل تعلیم دی گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ انگریز اساتذہ کی زیرِ تربیت انہیں مغربی ثقافت جس میں انگریزی، فرانسیسی ، پیانو اور وائلن، آلاتِ موسیقی

بھی سکھائے گئے تھے۔ ان تمام علوم کے علاوہ گھڑسواری، بندوق چلانا اور ٹینس کھیلنا بھی سکھایا گیا۔ نواب سلطان بیگم کی کوشش تھی کہ وہ میمونہ کو ایسے تیار کریں کہ انھیں علاقائی رسم و رواج اور مغربی ثقافت کے امتزاج میں کوئی دشواری نہ ہو۔ اسلامی اور جدید تعلیم کے ساتھ میمونہ سلطان نے دستکاری اور امورِ خانہ داری میں بھی دسترس حاصل کی۔میمونہ سلطان کی تعلیم کے بارے میں زہرہ بیگم فیضی ایک مضمون میں لکھتی ہیں:

> شاہ بانو بیگم کی تعلیم و تربیت اور ہی طریقہ پر ہوتی ہے۔ ان میں ایک ایسی خاص بات ہے کہ بے اختیار ان کی طرف دل راغب ہوتا ہے۔ سرکار عالیہ نے انہیں زیورِ علم سے اچھی طرح آراستہ و پیراستہ کیا ہے۔ ہنوز اُن کی تعلیم ہورہی ہے۔ ابھی ان کا سن و سال ہی کیا ہے پندرہ یا سولہ برس کا سن ہے ان کی ذات سے خواتین اسلام کی بہت کچھ امیدیں وابستہ ہیں۔ میں ان سے جہاں کہیں ملتی ہوں بہت خوش ہوتی ہوں۔ [۹۱]

شاہ بانو کا بچپن نواب سلطان جہاں کے زیرِ سایہ گزرا۔ انھوں نے فہم و فراست، علم و دانائی اور گھر گرہستی کے تمام گُر بھی نواب بیگم سے سیکھے۔ شاہ بانو ہر لمحہ بیگم نواب کی شریکِ کار رہیں اور تمام فلاحی اور ادبی کاموں میں ان کے ساتھ بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتی رہیں۔

میمونہ بیگم نے نواب بیگم اور نواب حمید اللہ کے ہمراہ ہندوستان کے مختلف صوبوں اور شہروں دہلی، بمبئی ، کلکتہ، بنگلور، میسور، لکھنؤ، کانپور، اجمیر اور آگرہ کا سفر کیا اور اہلِ ہندوستان سے ملاقاتیں بھی کیں۔ ان اسفار کے علاوہ ۱۹۱۱ء میں یورپ کا سفر بھی کیا۔ اس سفر کے دوران وہ روزنامچہ تحریر کرتی رہیں اور واپسی پر نواب بیگم کی یادداشتوں کی مدد سے مرتب کر کے سیاحت سلطانی شائع کیا۔ اس سفرنامہ کے علاوہ ان کی دیگر تصانیف یہ ہیں۔

۱۔ عمل و ریحان

بچوں کی اصلاح و تربیت کے لیے کہانیوں پر مشتمل ہے۔ اور یہ بھوپال، حیدرآباد، علی گڑھ کے مدارس میں شامل رہی۔

۲۔ **سلک مروارید**

یہ چار حصّوں پر مشتمل مذہبی نثری کتاب ہے۔

۳۔ **ذکر مبارک**

آنحضور ﷺ کی سوانح عمری ہے اور یہ مدرسوں میں شاملِ نصاب رہی ہے۔

۴۔ **آغاز اسلام (ترجمہ بدوۂ اسلام)**

یہ تصنیف مولانا شبلی نعمانی کی فارسی کتاب بدؤ الاسلام کا اردو ترجمہ ہے۔

۵۔ **اخلاقی حکایات فرائض مادری (مرتبہ و ترجمہ)**

یہ کتاب ماں کے فرائض پر مبنی اخلاقی اور سبق آموز حکایات پر مبنی ہے۔

میمونہ سلطان ایک چاق و چوبند او رسرگرم خاتون تھیں۔ انھوں نے تحریکِ نسواں میں فعال کردار ادا کیا اور جلسے جلوسوں میں مختلف موضوعات پر تقاریر کیں۔ اس کے ساتھ وہ لیڈیز کلب کے جلسوں، نمائشِ مصنوعات خواتین ہند اور آل انڈیا لیڈیز کانفرنس میں بھی شریک رہیں۔بیگم شاہ بانو نمائش مصنوعات خواتینِ ہند کی منتظمہ کمیٹی کی پریزیڈنٹ بھی منتخب ہوئیں۔[۹۲] انھوں نے خواتین کے لیے بڑی دل چسپی اور محنت کے ساتھ کام کیا۔ غرض اس قسم کے جلسے ہوتے رہتے تھے۔ خاندان شاہی کی بیگمات اور دیگر ممتاز خواتین کی طرف سے یہاں زنانہ پارٹیاں بھی دی جاتی تھیں۔ وقتاً فوقتاً مختلف مضامین پر تقریریں ہوتی تھیں جن میں میمونہ سلطان شاہ بانو کی بھی متعدد تقریریں ہوتی تھیں جو ہر لحاظ سے طبقۂ اناث کے لیے مفید و موزوں تھیں۔[۹۳]

میمونہ سلطان بیگم نہایت شائستہ اور نفیس خاتون تھیں۔ نواب حمید اللہ (۱۹۲۸ء) میں سائمن کمیشن اور بٹلر کمیٹی کا حصّہ بنے تو اس سلسلے میں نواب حمیداللہ کے ہمراہ میمونہ بیگم بھی برطانیہ گئیں ۔ اس وقت نواب صاحب نے ان کا باقاعدہ پردہ ختم کرایا۔ وہ جدید تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامی شعائر کے مطابق زندگی بسر کرنا پسند کرتی تھیں۔ انھیں نواب حمید اللہ کی طرف سے کچھ مسائل

سے بھی دوچار ہونا پڑا مگر انھوں نے بڑی ثابت قدمی سے سب مشکلات کا مقابلہ کیا اور آخرکار یہ باہمت خاتون ۱۴ مئی ۱۹۸۲ء کواس دنیائے فانی سے کوچ کر گئیں۔

۹۔ محمودہ عثمان حیدر

بیگم محمودہ ۱۹۰۸ء [۹۴] میں ہندوستان کے ضلع بجنور کے ایک قصبہ نہوڑ میں پیدا ہوئیں۔ یہ وہ مشہور جگہ بجنور ہے جس کی تاریخ لکھنے کے لیے سرسید احمد خان وہاں گئے اور سالوں کی عرق ریزی کے بعد تاریخ بجنورتحریر کی۔بیگم محمودہ نے ایک علمی و ادبی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ان کے والد حکیم سید غلام حیدر کا خاندان بیگم محمودہ ۱۹۲۶ء میں سید عثمان حیدر سے بیاہی گئیں جو کہ سید سجاد حیدر یلدرم کے بھانجے تھے ۔ وہ اینگلو پرشین آئل کمپنی میں ملازم ہونے کی وجہ سے مشرقِ وسطیٰ میں مقیم تھے۔ اس لیے بیگم محمودہ نے ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۳ء کا عرصہ اپنے شوہر عثمان حیدر کے ساتھ گذارا اورایک سفرنامہ "مشاہدات بلادِ اسلامیہ" تحریر کیا۔

بیگم محمودہ سید سجاد حیدر یلدرم کی حقیقی چچا زاد بہن اور ان کے بھانجے کی بیوی تھیں۔ اس حوالے سے بھی وہ ایک الگ پہچان رکھتیں تھیں۔ مصنفہ کو اپنے مقام و مرتبے کا احساس تھا جس کا اظہار وہ اپنے سفرنامے میں بھی جابجا کرتیں نظر آتی ہیں۔ ایک جگہ وہ لکھتی ہیں:

> کارخاص کے علاوہ اب عثمان صاحب دنیا کی بہترین قسم کی کاروں کے بھی مالک تھے جو حکومت ایران اور کمپنی کے اعلیٰ افسروں اور برطانوی سفیر کے لیے مخصوص تھیں۔ ان کے علاوہ تین ہزار موٹریں، سواسو بحری جہاز، چھو ہوائی جہاز، کئی سو موٹر لانچ اور موٹر لاریاں علیحدہ ٹرانسپورٹ کے محکمہ کی نگرانی میں تھیں۔ اسی سلسلے سے عثما ن صاحب کو ایک مرتبہ شاہی دورے میں شرف ہم رکابی اعلیٰ حضرت اقدس ہمایونی ہوا۔ [۹۵]

بیگم محمودہ نے زندگی کا بہت سا حصہ بیرونِ ممالک گزارا اور پھر ہندوستان سے ہجرت کر کے کراچی میں مقیم ہو گئی تھیں۔ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔

اگلے ابواب میں ان خواتین ادیبوں کے سفرناموں کا مطالعہ و تجزیہ پیش کیا جائے گا۔

حوالہ جات

۱۔ محمدامین زبیری مارہروی، حیات سلطانی ،(آگرہ : عزیزی پریس، ۱۹۳۹ء)، ص۲۔

۲۔ رضیہ حامد، نواب سلطان جہاں بیگم ،(بھوپال: باب العلم پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء)، ص ۳۶۔
۳۔ وہا صاحبہ، تذکرہ بیگمات بھوپال،(لاہور: دار الاشاعت پنجاب، ۱۹۳۳ء)، ص۱۱۔
۴۔ سلطان جہاں بیگم، حیات قدسی،(بھوپال: مطبع ریاست، ۱۹۱۷ء)، ص ۱۲۴۔
۵۔ ایضاً، ص ۱۰۔
۶۔ محمد امین زبیری مارہروی، حیات سلطانی، ص ۲۔
۷۔ محمد امین زبیری، بیگمات بھوپال،(بھوپال: مطبع ریاست، ۱۹۱۸ء)، ص ۴۶۔
۸۔ ایضاً، ص ۴۷۔
۹۔ طیبہ بی، تاریخ فرمارو ایان بھوپال،(بھوپال: بھوپال پریس، ۱۹۷۷ء)، ص ۷۸۔
۱۰۔ رضیہ حامد، ص ۵۱۔
۱۱۔ محمد امین زبیری، بیگمات بھوپال ، ص ۱۲۸۔
۱۲۔ محمد امین زبیری، ایضاً، ص ۱۔
۱۳۔ محمد امین زبیری، ایضاً، ص ۴۹۔
۱۴۔ نواب سلطان جہاں، تزک سلطانی (حصّہ اول)،)بھوپال: مطبع سلطانی ، ۱۳۲۸ھ(، ص ۳۹۔
۱۵۔ ایضاً، ص ۴۰۔
۱۶۔ ایضاً، ص ۴۵۔
۱۷۔ رضیہ حامد، نواب سلطان جہان بیگم، ص ۸۲۔
۱۸۔ سلطان جہاں بیگم، تزک سلطانی، ص ۹۔
۱۹۔ محمد امین زبیری، حیات سلطانی، ص۱۸۔

۲۰۔ وہاصاحبہ، تذکرہ بیگمات بھوپال،) لاہور: دار الاشاعت پنجاب، ۱۹۳۲ء(، ص۴۰۔
۲۱۔ رضیہ حامد، نواب سلطان جہاں بیگم ، ص ۳۱۴۔ ۳۱۵۔
۲۲۔ محمد حسین صدیقی، ہندوستان کی بیس بڑی خواتین ، (کراچی: زمزمہ پبلشرز، ۲۰۰۳ء)، ص ۱۷۹۔
۲۳۔ طیبہ بی، تاریخ فرمانروایان، بھوپال، ص۱۵۰۔
۲۴۔ فصیح الدین ملخی (مرتبہ)،تذکرہ نسوانِ ہند،(پٹنہ: مطبوعہ شمسی پریس، س۔ن۔)، ص ۸۲،

۲۵۔ ایضاً، ص ۵۴

۲۶۔ اصغرعباس (مرتبہ)، مسافرانِ لندن، (کراچی: ادارۂ یادگارِ غالب، ۲۰۱۶ء)، ص۱۵۰۔

۲۷۔ بیگم سربلند جنگ بہادر، دنیا عورت کی نظر میں،(دہلی: خواجہ برقی پریس، ۱۹۱۰ء)، ص۱۷۷۔

۲۸۔ اختر حمیدیہ بیگم سر بلند جنگ، تقریر، مشمولہ: عصمت، (رازق الخیری، جلد ۲۶، فروری ۱۹۲۶ء)، ص۷۷۔

۲۹۔ ایضاً، ص۷۸۔

۳۰۔ اختر حمید ، بیگم نواب سربلند جنگ بہادر، (دہلی: مشمولہ عصمت، جلد ۳۶، فروری ۱۹۳۸ء)۔

۳۱۔ بیگم سربلند، دنیا عورت کی نظر میں، ص ۸۔

۳۲۔ رفعت جہاں، بیسویں صدی میں خواتین کی غیر افسانوی نثر:ایک مطالعہ، (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۱۵)، ص ۱۳۳۔

۳۳۔ محمد یامین(مرتبہ)، زمانۂ تحصیل، (کراچی: ادارۂ یادگارِ غالب، ۲۰۱۰ء)، ص ۱۴۔

۳۴۔ میمونہ دلوی، بمبئی میں اردو ،(دہلی: مکتبہ جامعہ، ۱۹۷۰ء)، ص ۶۸۔

۳۵۔ محمد یامین عثمان، عطیہ فیضی کا خاندان، مشمولہ: تحقیق، شمارہ ۲۹ (جنوری تا جون ۲۰۱۵)، ص ۲۴۴۔

۳۶۔ معین الدین عقیل، اردو کی اولین خود نوشت سوانح عمریاں، مشمولہ: خدا بخش لائبریری جنرل (۲۰۰۴ء)، ص ۶۳۔

۳۷۔ محمد یامین عثمان، عطیہ فیضی کا خاندان، ص ۲۴۷، ۲۴۸۔

۳۸۔ رئیس احمد جعفری، عطیہ بیگم فیضی، مشمولہ: نگار، جلد نمبر ۵۸ (نومبر ۱۹۷۹ء)، ص ۲۸۔

۳۹۔ نازلی رفیعہ سلطان، سیرِ یورپ، (لاہور: یونین اسٹیم پریس، ۱۸۰۸ء)، ص ۲۴۶۔

۴۰۔ ایضاً، ص ۱۔

۴۱۔ اخبار نامہ قبیلہ فیضی طیبی، جلد دہم، ص ۲۳۷۔۲۳۸۔

۴۲۔ روزنامہ جنگ، کراچی، ۷ جنوری ۱۹۶۷ء۔

۴۳ محمد عبد الرزاق بسمل، تذکر جمیل، (حیدرآباد: دکن: بیرون دبیر پور، ۱۹۲۹ء)، ص۱۷
۴۵ علام راشد الخیری، محترم عطی بیگم صاحب، مشمول: عصمت، جلد ۳۶(فروری ۱۹۲۶ء)، ص۱۳۱
۴۶ محمد یامین عثمان(مرتب)، زمانۂ تحصیلؑ (کراچی: ادارۂ یادگار غالب، ۲۰۱۰ء)، ص۱۴
۴۷ محمد یامین عثمان، عطی فیضی کا خاندان،ص۲۴۳
۴۸ ایضاً، ص ۲۴۴
۴۹ میمون دلوی، بمبئی میں اردو،(دلی: مکتب جامع، ۱۹۷۰ء)، ص ۶۸
۵۰ محمد یامین،عطی فیضی کا خاندان، ص ۲۴۴
۵۱ معین الدین عقیل، اردو کی اولین خود نوشت سوانح عمریاں،ص۶۳
۵۲ ڈاکٹر محمد یامین، ص ۲۵۰۲۵۱
۵۳ سید تنویر شیرازی، اجنار بلدی، جلد نمبر ۸۹، دسمبر جنوری ۱۹۰۰ء
۵۴ ایم شفیق، دخترانِ حرم ،(کراچی: مسلم اکیڈ می، سن ندارد)، ص ۱۲۴
۵۵ ڈاکٹر محمد یامین، زمانۂ تحصیلؑ ص ۱۴۷
۵۶ محمد عبد الرزاق بسمل، تذکر جمیل، ص ۲۰
۵۷ ایم شفیق، دخترانِ حرم، (کراچی: مسلم اکیڈ می، سن ندارد)، ص ۱۲۱
۵۸ ضیا الدین برنی، اقبال دیگر مشایر اور عطی، مشمول: ما نو)کراچی، اپریل ۱۹۶۷ء(
۵۹ رازق الخیری، محترم عطی فیضی صاحب، مشمول:عصمت، رازق الخیری، (جلد ۳۶، فروریۃ ۱۹۲۶ء)، ص۱۲۳
۶۰ واب اشرفیۃ ، شاد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری مشمول سیمیں، ثمر فضل، ندوستانی مسلم خواتین کی جدیدتعلیمی ترقی میں ابتدائی ناولوں کا حص،

)دہلی :اہ ون آفیسٹ ، ۱۹۹۱ (،ص۲۵۵۔

۶۱۔ سلطانہ بخش، ایم،پاکستانی ادبیات میں خواتین کا کردار،)اسلا م آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی ، ۲۰۰۷ء(، ص ۱۸۹

۶۲۔ صغرا ہمایوں ، سفرنامہ یورپ، ص۷۸۶

۶۳۔ حمیرہ سعید، اردو ناولوں میں نسائی حسیت،)دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۹ء(، ص۵۷

۶۴۔ سیمیں، ثمر فضل، ہندوستانی مسلم خواتین کی جدید تعلیمی ترقی میں ابتدائی ناولوں کا حصّہ، ص۲۵۵

۶۵۔ ایضاً، ص۲۵۶

۶۶۔ ایضاً، ص۲۵۶

۶۷۔ صغرا ہمایوں، ، سفرنامہ یورپ، ص۷۸۶

۶۸۔ نصیر الدین ہاشمی، حیدر آباد کی نسوانی دنیا،مشمولہ، سیمیں، ثمر فضل، ڈاکٹر، ہندوستانی مسلم خواتین کی جدید تعلیمی ترقی میں ابتدائی ناولوں کا حصّہ، ص۲۵۷

(حیدرآباد: ادارۂ ادب جدید، ۱۹۶۶ء)، ص۵۰

۶۹۔ سلطانہ بخش، ایم، پاکستانی ادبیات میں خواتین کا کردار،(اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۲۰۰۷ء)، ص ۱۸۹

۷۰۔ نصیر الدین ہاشمی، ایضاً، ص۲۵۶

۷۱۔ علامہ راشد الخیری، محترمہ عطیہ بیگم صاحبہ، مشمولہ: عصمت، جلد ۳۶(فروری ۱۹۲۶ء)، ص۱۳۱۔

۷۲۔ صغرا بیگم اور نسوانی دنیا، طیبہ خسرو، یاد صغرا ہمایوں ، ۱۹۷۶ء، ص۲۳، مرتب مرزا سرفرازؔ علی مشمولہ اردو ناولوں میں نسائی حسیت، ص۵۸

۷۳۔ صغرا ہمایوں، سفرنامہ یورپ، ص۷۸۶۔

۷۴۔ نصیر الدین ہاشمی، ایضاً، ص۲۵۶۔

۷۵۔ محمدی بیگم،تہذیب نسواں ، جلد ۴۶، (۷اگست ۱۹۴۳ء)، ص۵۱۴ ۔

۷۶۔ ایضاً، ص ۵۱۵۔

۷۷۔ ایضاً، ص ۵۱۶۔

۷۸۔ سید شفقت رضوی، بیگم حسرت موہانی حیات و سیرت، (کراچی: نشاط النساء میموریل سوسائٹی، ۱۹۹۶ء)، ص ۱۳۔
۷۹۔ نعیمہ بیگم، حسرت کی کہانی: نعیمہ کی زبانی، (کراچی: المخزن پرنٹرز پاکستان چوک، ۱۹۶۹ء)، ص ۶۔
۸۰۔ سید شفقت رضوی، ص ۱۱۔
۸۱۔ ایضاً، ص ۱۴۔
۸۲۔ عبد الشکور، پرنسپل، حسرت موہانی، (آگرہ: عزیزی پریس، ۱۹۴۶ء)، ص ۱۰۰۔۱۰۱۔
۸۳۔ محمد حسین صدیقی(مرتبہ)، ہندوستان کی بیس بڑی خواتین، ص ۱۸۴۔
۸۴۔ ایضاً، ص ۱۸۵۔
۸۵۔ علیم شہاب، ۱۰۰ نامور خواتین، (لاہور: روہی پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء)، ص ۱۲۵۔
۸۶۔ محمد امین زبیری، بیگمات بھوپال، ص ۱۲۸۔
۸۷۔ رضیہ حامد،نواب سلطان جہاں بیگم،ص ۱۲۶۔
۸۸۔ صاحبزادہ یعقوب خان، *Memories of a Rebel Princess*: عابدہ سلطان (کراچی: آکسفورڈ پریس،۲۰۱۳ء)، ص ۲۸۔
۸۹۔ محمد امین زبیری، بیگمات بھوپال،ص ۱۳۵۔
۹۰۔ محمد امین زبیری، بیگمات بھوپال، ص ۱۲۷۔
۹۱۔ زہرہ بیگم فیضی، نمائش کے چشم دید حالات مشمولہ: بیگمات بھوپال، محمد امین زبیری، ص۸۸۔
۹۲۔ محمد امین زبیری، بیگمات بھوپال،ص ۹۱۔
۹۳۔ ایضاً،ص۷۴۔
۹۴۔ محمود عثمان حیدر، مشاہدات بلادِ اسلامیہ، بیک کور۔
۹۵۔ ایضاً، ص ۱۳۔

باب چہارم

نوآبادیاتی عہد میں خواتین کے سفرنامے:
سماجی و ثقافتی مطالعہ

نوآبادیاتی عہد اردو نثر کے لیے بڑا اہم دورہے۔ اس دور میں دیگر اصناف کے علاوہ سفرنامے کی صنف کو بھی بڑی پذیرائی ملی اور بہت سے سفرنامے تخلیق ہوئے۔ اردو ادب میں خواتین کے ادب کی تاریخ کچھ زیادہ پرانی نہیں ہے۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں خواتین کے لکھنے کا آغاز اصلاحی مضامین سے ہوتا ہے۔ ان مضامین میں سماجی مسائل پر اظہارِ خیال کرنے کے علاوہ عورتوں میں شعور بیدار کرنے کی بھی سعی کی گئی تھی۔ شروع شروع میں معاشرے کے مخصوص رویّے کے پیش نظر کئی خواتین نے فرضی ناموں سے لکھا مگر جب نوآبادکاروں نے زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا اور معاشرے میں تبدیلی کی لہر چلی تو تحریکِ آزادیٔ نسواں

کے تحت خواتین میں بیداری آئی ۔انھوں نے اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کی جس کے لیے وہ براہِ راست معاشرے سے مخاطب ہونے لگیں۔

بیسویں صدی میں سفرنامے کے علاوہ دیگر نثری اصناف میں بھی خواتین نے طبع آزمائی کی اور اس طرح اردو نثری ادب میں اضافہ ہوا ۔ اس صدی کے عشرے اوّل میں اصلاحی مضامین کے ساتھ ساتھ سفرنامہ ہی ایک ایسی صنف ہے جس کو خواتین نے اپنے اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا اور اپنے اسفار کے تجربات، مشاہدات اور حالات و واقعات میں دوسروں کو شریک کیا۔ ان خواتین نے مختلف مقاصد کے تحت سفر کیے جیسا کہ سیر کی غرض سے اندرونِ ملک اور بیرونِ ممالک کا سفر، دیارِ مقدسہ کا سفر، سیاسی سفر، تعلیمی سفر وغیرہ۔

اس عہد میں حالات کی تبدیلی کی وجہ سے خواتین کو اپنے محدود دائرے سے نکل کر باہر کی دنیا کو بھی دیکھنے کے مواقع میسر آئے۔ اب وہ کہیں بھی جاتیں تو وہاں کے سماج اور ثقافت کا بغور جائزہ لیتیں اور ہر ایک بات کا مشاہدہ کرتے ہوئے سفر سے واپسی پر ان کو کتابی صورت میں پیش کرتیں۔ اس طرح خواتین نے بہت سے مقامی سفرنامے، مغربی ممالک اور بلادِ اسلامیہ کے سفرنامے اور دیارِ مقدسہ کے سفرنامے تخلیق کیے۔ اب ہم ان سفرناموں کا سماجی و ثقافتی جائزہ لیں گے۔

۱۔ دیارِ مقدسہ کے سفرنامے:

حج دینِ اسلام کا اہم رکن ہے اور اس مقدس رکن کی ادائیگی کا خواب ہر مسلمان دل میں رکھتا ہے ۔ جب اس فرض کی تکمیل کے لیے وہ بڑی عقیدت سے حجازِ مقدسہ کا سفر مکمل کر کے وطن واپس آتا ہے تو بڑا سکون محسوس کرتا ہے۔ حجازِ مقدسہ کے سفر کے علاوہ زیارت گاہوں (ایران و عراق اور شام) کی زیارتوں کے لیے اختیار کیے گئے سفر بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

ان مذہبی فرائض کی عقیدت میں لوگوں نے دور دراز کے دشوار سفر کیے۔ جن میں انہیں قدم قدم پر زندگی کا خطرہ تھا مگر پھر بھی ان کی عقیدت میں فرق نہ آیا۔ ان اسفار سے واپس آنے والوں نے دوسروں کی رہنمائی کے لیے انہیں تحریری صورت میں قلم بند کیا ،جو آہستہ آہستہ سفرنامے کی صورت اختیار کر گیا۔ اب ان مذہبی سفرناموں سے ہمیں نہ صرف مناسک حج اور فرائض کی ادائیگی کے طریقوں کا پتہ چلتا ہے بلکہ ان ملکوں اور شہروں کی سماجی، ثقافتی ، تاریخی، جغرافیائی بلکہ ہر طرح کی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

بیسویں صدی میں خواتین نے کثرت سے سفرنامے لکھے جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ خواتین کو سفر کرنے کے مواقع زیادہ ملے اور ذرائع آمدورفت بھی آسان ہو گئے تھے ۔ خواتین نے سفر کرنے کے ساتھ ساتھ سفرنامے لکھنے پر بھی خصوصی توجہ دی۔ نوآبادیاتی عہد میں خواتین نے دیارِ مقدسہ کے درج ذیل سفرنامے لکھے ہیں جن کا مفصل تعارف و تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ یادداشت تاریخ و قائع حج نواب سکندر بیگم ۱۸۶۵ء
۲۔ روضۃ الریاحین نواب سلطان جہاں بیگم ۱۳۲۷ھ/ ۱۹۰۹ء
۳۔ دنیا عورت کی نظر میں بیگم سر بلند جنگ بہادر ۱۹۱۰ء
۴۔ سفرنامہ عراق بیگم ہمایوں مرزا ۱۹۱۵ء
۵۔ مشاہدات بلاد اسلامیہ محمودہ عثمان حیدر ۱۹۳۲ء
۶۔ سفرنامہ عراق بیگم حسرت موہانی ۱۹۳۷ء

۱۔۱ یادداشت تاریخ وقائع حجاز نواب سکندر بیگم:

نواب سکندر بیگم اردو ادب کی اولین سفرنامہ نگار خاتون ہیں۔یہ ریاست بھوپال کی حکمران تھی۔ یادداشت

تاریخِ وقائع حج ان کا سفرنامہ ہے۔جو انھوں نے ۱۸۶۵ء میں حج کے سفر سے واپسی کے بعد تحریر کیا تھا۔ انھوں نے اس مقدس سفر کے حالات و واقعات کو یادداشت تاریخ وقائع حج میں بیان کیا ہے[۱] اس سفرنامے کی صرف دو کاپیاں اردو زبان میں لکھی گئیں۔ ایک مسز رورانڈ(Mrs. Rorand) کے لیے اور دوسری کاپی لیفٹیننٹ کرنل دپلوسے آسرن (Diplosy Asran)کے لیے تھی۔ انھیں دو نسخوں میں سے ایک نسخہ رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے۔[۲] اس رام پور والے نسخے پر سنہ تحریر درج نہیں ہے۔لیکن غالب امکان یہی ہے کہ اسے واپسی کے بعد ۱۸۶۴ء یا ۱۸۶۵ء میں مرتب کیا گیا ہو گا۔[۳] نواب سکندر بیگم کا یہ سفرنامہ اردو میں تو ابھی تک شائع نہیں ہوا مگر انگریزی زبان میں اس کا ترجمہ کرنل ڈیورنڈولم ولکنسن (Davorondolam Wilicson)نے کیا۔[۴] اور ۲۰۰۷ء میں *A Princesses Pilgrimage* کے نام سے سیوبھان لیمپرٹ ہرلے (Siobhan Lampert Hurley)نے اس کی تدوین کر کے انڈیانا یونی ورسٹی پریس سے شائع کیا۔[۵] اس سفرنامے کو ۲۰۰۸ء میں دوبارہ اس مصنف نے اوکسفرڈ پریس (Oxford Press) کراچی (پاکستان) سے شائع کیا ہے۔[۶] اور یہی ایڈیشن راقمہ کے زیر مطالعہ رہا ہے۔

بیگم نواب سکندر کے سفر کے حالات روزانہ انگریزی اخباروں میں شائع ہوتے رہتے تھے اور دہلی گزٹ میں بھی باقاعدہ اشاعت ہوتی تھی۔ ان تمام اخبارات کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر جگہ اُن کا جانا باضابطہ ہوتا تھا۔ برطانوی افواج اور مقامی لوگ ان کا استقبال کرتے تھے۔ سفر نامے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ سکندر بیگم ۱۲۸۰ھ بمطابق ۱۸۶۳ء میں ایک بڑے قافلے کے ساتھ سفرِ حج پر روانہ ہوئیں۔ان کا قافلہ دو بحری جہازوں اور مکے میں سات سو اونٹوں پر داخل ہوا تھا۔ سفرِ حج کے دوران سکندر بیگم نے ایک روزنامچہ لکھا، ہر چیز کا بغورمطالعہ کیااور بعد میں ان

یادداشتوں کی مدد سے سفرنامہ ترتیب دیا۔[7] انہوں نے یہ حج نامہ فارن سیکرٹری شملہ مسٹر رورانڈ کی اہلیہ اور خود مسٹر رورانڈ کی فرمائش پر تحریر کیا تھا، جو ملک عرب اور وہاں کے باشندوں کے حالات جاننے کے مشتاق تھے۔ اس سفرنامے کا انگریزی ترجمہ بھی کیا گیا جیسے ۱۸۷۰ء میں ولیم اچ السن و کمپنی الٹریو (برطانیہ) نے شائع کیا ۔ اشاعت کے بعد ملکہ برطانیہ وکٹوریا کی خدمت میں پیش کیا۔[8]

یہ سفرنامہ نہ صرف بھوپال کی ایک مسلم خاتون کا پہلا سفرنامہ ہے بلکہ اسے اردو سفرنامہ نگاری کی تاریخ میں بھی پہلی خاتون کا سفرنامہ تسلیم کرنا چاہیے کیوں کہ اس سفرنامے کا انگریزی ترجمہ ۱۸۷۰ء میں شائع ہو چکا تھا۔ اس سفرکے متعلق محمد امین زبیری لکھتے ہیں۔

> ۱۲۸۰ھ میں سعادت حج حاصل کی اور باوجود راستے کی سخت مشکلات کے پندرہ سو آدمی ہمراہ لے کر مکہ معظمہ گئیں، حج ادا کیا اور خدا کی نعمتوں کا شکر بجا لائیں جس طرح کہ ہندوستان میں بہ لحاظ اپنے نظامِ حکومت اور بااعتبار وفاداری و خیر خواہی تاج برطانیہ سب سے ممتاز تھیں اسی طرح تمام والیان ملک میں حرم محترم میں بھی حاضر ہونے کا شرف امتیاز و اولیت انہیں کو حاصل ہوا۔[9]

نواب سکندر کی حج کی سعادت حاصل کرنےکے بعد واپسی کےمتعلق حیات سکندر ی میں لکھا ہے کہ وہ فریضہ حج کی ادائیگی کے بعد پونا، بمبئی سے ہوتی ہوئی بروز بدھ ۳ جمادی الاول ۱۲۸۱ھ بمطابق ۵ اکتوبر ۱۸۶۴ء کو بھوپال واپس پہنچیں۔[10]

یہ سفرنامہ اردوسفرنامہ نگاری کی تاریخ میں خواتین کے اولین حج ناموں میں بھی شمار ہوتا ہے۔ اس میں سفر حج کی تفصیل عقیدت سے بیان کی گئی ہے۔ انہوں نے اس سفر

نامے میں چھوٹی سے چھوٹی چیزوں کو بھی پیش کیا ہے۔ اس سفر نامے میں ان لوگوں کا بھی ذکر ملتا ہے جن کے ہمراہ بیگم سکندر نے سفرِ حج کیا ہے ان میں ان کی والدہ نواب قدسیہ بیگم بھی شامل تھیں۔ اس سفرنامے میں عرب کی تہذیب و معاشرت ،رہن سہن وہاں کے لوگوں کے عادات و اطوار کا ذکر بھی ملتا ہے۔مکے کے بدوؤں کا ان کے ساتھ سلوک اور ان کا لوگوں کے لیے تحفے تحائف لے کر جانا بھی درج ہے۔ نواب سکندر بیگم کا مکے میں قرآن مجید کا ترکی زبان میں ترجمہ کرنے کا حکم بھی اس سفرنامے میں موجود ہے۔

اس سفرنامے میں مکے و حجاز کی تہذیبی و سماجی ، جغرافیائی اور سیاسی صورت حال بھی نظر آتی ہے۔ اس میں مکے کے لوگوں کا کھانا پینا، لباس، وہاں کے مویشیوں کے بارے میں اور بدوؤں کے برے سلوک کا تذکرہ کثرت سے ملتا ہے۔ اس سفرنامے کی ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ ایک خاتون ہونے کے ناطے بیگم سکندر نے وہاں کی عورتوں کا ایک معاشرتی پہلو کثرت طلاق کے بعد دس دس شادیوں کو نمایاں طور پر بیان کیا ہے۔ سفرنامے یادداشت تاریخ وقائع حجمیں حج کے متعلق معلومات برائے نام ہیں اور اس کے بجائے دیگر معاملات مثلاً سیاسی رہنماؤں ، شریف و پاشا سے ملاقات کا طویل بیان، سلطنت برطانیہ سے حج پر جانے سے متعلق ضروری امور کا تبادلہ خیال اور بحری جہاز کے انتظامات پر زیادہ تفصیلی بیان ہے۔ ان تمام طویل بیانات نے اگرچہ اس سفرنامے کو گنجلک بنا دیا ہے مگر اس کے باوجود یہ سفرنامے اپنے عہد کی زبان ، اندازِ تحریر کا عمدہ نمونہ ہے۔

اس سفرنامہ میں زیادہ تر معلومات امورِ حج، معاملات سلطنت برطانیہ، اقامت، بحری جہاز کا احوال وغیرہ بیان کیا گیا ہے۔ اس میں عربوں کا لباس، مویشی، کھانا پینا اور اس قافلے حج کو درپیش مسائل کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ اس کے علاوہ نامور شخصیات سے ملاقاتوں کا احوال بھی درج ہے۔ یہ

سفرنامہ اپنے اندازِ تحریر کی وجہ سے زیادہ اہمیت کا حامل ہو یا نہ ہو مگر اس کی سماجی وتہذیبی اہمیت ضرور ہے۔ اس کے علاوہ یہ سفرنامہ اپنی تاریخی اہمیت بھی رکھتا ہے۔ اس کا آج بھی تہذیبی تاریخ اور تاریخی حقائق کے حوالے سے مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کی اہمیت کے باوجود اردو سفرناموں کے ناقدین اور مفسرین کی اس عہد آفریں سفرنامہ سے عدم توجہ حیرت انگیز ہے۔حالاں کہ ریاست بھوپال کی تمام تاریخی کتب میں اس سفرنامہ کا حوالہ ملتا ہے۔

۲۔۱۔روضۃ الرّیاحین، سفرنامہ سفر کشور حجازاز نواب سلطان جہاں بیگم

نواب سلطان جہاں بیگم کا شمار بھی ریاست بھوپال کی حکمران خواتین میں ہوتا ہے۔ نواب سلطان جہان بیگم ریاست بھوپال کی چوتھی خاتون حکمران تھیں۔ روضۃ الریاحین ہزہائی نس نواب سلطان جہاں بیگم والی بھوپال کا حج کا سفرنامہ ہے۔ یہ سفرِ حج ۳۰ اکتوبر ۱۹۰۳ء سے شروع ہو کر ۴ اپریل ۱۹۰۴ء کو اختتام پذیر ہوتا ہے۔ یہ سفر تقریباً چھ ماہ کی مدت پر مشتمل ہے اور اس سفرنامہ کو مطبع سلطانی ریاست بھوپال نے ۱۳۲۷ ھ / میں حافظ کرامت اللہ کے زیرِ اہتمام شائع کیا مگر اس سفرنامہ کے اختتام پر سنہ تاریخ ۸ جمادی الثانی ۱۳۲۲ھ /۱۹۰۴ءدرج ہے۔[11] اس ۱۳۲۷ھ / ۱۹۰۹ءکی اشاعت سے پہلے بھی یہ سفرنامہ روضۃ الریاحین مرحلہ طباعت سے گزر ا ہے اور اس کی دوسری اشاعت کے سلسلہ میں ڈاکٹر محمد شہاب الدین لکھتے ہیں کہ ۱۳۲۴ھ/ ۱۹۰۶ء میں نواب سلطان جہاں بیگم کا سفرنامہ حج روضۃ الریاحین المعروف بہ سفرنامہ سفر کشورِ حجاز شائع ہو چکا تھا۔[12]انہوں نے ۸شعبان ۱۳۲۱ ھ بمطابق ۳۰ اکتوبر ۱۹۰۳ء عیسوی ایک بڑے قافلہ کے ساتھ سفر اختیار کیا۔ نواب سلطان بیگم کے ہمراہ ان کے دو بیٹے حافظ محمد عبید اللہ ، نواب حمید اللہ اور ان کی بہو شہریار دلہن صاحبہ بھی تھیں۔انہوں نے نہ صرف یورپ اور ہندوستان کے مختلف شہروں کی

سیاحت کی ہے بلکہ یہ سفرنامہ روضہ الریاحینان کے حج کے سفر کے حالاتِ پر مشتمل ہے۔ جس میں اس زمانے کی سیاست اور حکومتی ارکان انگلشیہ کے متعلق بھی اہم معلومات ملتی ہیں۔ یہ سفرنامہ اس لیے بھی اہمیت رکھتا ہے کہ اردو ادب میں اولین حج نامہ نگار خواتین حکمران بھوپال ہیں ۔بیگمات بھوپال میں نواب سکندر بیگم کے بعد یہ سعادت نواب سلطان جہاں کو حاصل ہوئی اور سفرنامہ روضہ الریاحین ریاست بھوپال کی دوسری خاتون حکمران کا حج نامہ ہے ۔

اس سفرنامہ کے دو حصے اور ۳۸۹ صفحات ہیں۔ پہلے حصہ میں حج کی اہمیت کو اسلام کی رو سے اور آیات قرآنی سے بیان کرنے کے بعد بیت اللہ اور مسجد نبوی کی تعمیر کے متعلق بڑی تاریخی معلومات پرروشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد پہلے حصہ کے تتمۂ میں انھوں نے عرب کے قدیم و جدید سکے جات کو تفصیلاً بیان کرنے کے علاوہ مکہ وحجاز کی مقدس زیارات کو جس دل چسپی اور عقیدت سے بیان کیا ہے جو بیگم سلطان جہاں کی علم دوستی اور علمی بصیرت کا پتہ دیتی ہے۔ دوسرے حصہ میں حکومت برطانیہ سے حج کی سعادت حاصل کرنے اور اجازت طلب کرنے کے لیے قانونی کاروائیاں درج ہیں ، پھر سفرِ حج کی داستان ہے۔ اس سفرِ حج کی روانگی کے بارے میں محمد امین زبیری لکھتے ہیں۔

> سرکار عالیہ نے اپنے ارادہ حج بیت اللہ کے متعلق جمیع رعایائے ملکِ محروسہ کے نام ایک اعدان کی اشاعت فرمائی جس کا ہر ایک فقرہ شفقت و عطوفت شاہانہ سے بھرا ہوا ہے اور عبدیت و فرائض حکومت کی اہمیت کے احساس کو نمایاں کر رہا ہے اور اپنی رعایا سے درخواست کی تھی کہ اگر لاعلمی یا بطریق دیگر کسی کے حقوق ادا کرنے میں قصور ہوا ہو تو معاف کر دے اور مقبولیت حج اور مع الخیر پر واپسی کی دُعا کرے۔[۱۴]

اس سفرنامہ کے سرِورق سے لے کر اس کی کچھ عبارتیں عربی زبان میں ہیں لیکن نواب بیگم کے اسلوب کی اہم بات یہ ہے کہ انھوں نے ہر عربی عبارت کا مفہوم حواشی میں

درج کیا ہے۔ اس عہد کے دیگر سفرناموں کے مطابق اس سفرنامے کا آغاز بسم اللہ سے ہوتا ہے۔اس کے بعد فارسی کا یہ قطعہ درج ہے:

مقصدو جہان زمہر و ماہ است یکے　　رہبر و بودو لیک راہ است یکے

درمدح محمد و خدا فرقۓ نیست　　گر چشم دو تابود نگاہ است یکے

اور پھر اس کے بعد ایک آیت سے سفر کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے جس کا ترجمہ کچھ یوں ہے۔

> ہم نے دکھائی امانت آسمان کو اور زمین کو اور پہاڑوں کو پھر سب نے قبول نہ کیا کہ اس کو اٹھا دیں اور اس سے ڈر گئے اور اٹھا لیا اس کو انسان نے۔[۱۳]

اس سفرنامے میں نواب سلطان جہان نے اپنے سفر کی تیاری کے حکومتی معاملات، سفر کے فائدے، عرب کا جغرافیہ، بیت اللہ کی بنیاد، ارکانِ حج اور مناسکِ حج کو بڑی تفصیل سے بیان کیا مگر عرب تہذیب و معاشرت پر سرسری نگاہ ڈالی ہے۔ اس میں صرف حج اور حکومتی معاملات کی کاروائیاں وضاحت سے بیان کی گئی ہیں۔ انھوں نے اپنے سفرنامے حج میں سفر کی کاروائی سے متعلق معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی ہے جس کی وجہ سے ان کا سفرنامہ معلومات کا گنجینہ بن گیا ہے۔

مصنفہ نے اپنے سفرنامے کے ذریعے اہلِ ہندوستان کو راہنمائی پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ یہ سفرنامہ روزنامچے کی ہیئت میں ہے جس میں روانگی سے لے کر ہر مرحلے بندرگاہ و جہاز کے حالات، راہِ حجاز میں اونٹوں کے سفر، منزلوں کے نام، شتربان بدوؤں کا پریشان کرنے کا ذکر، حاجیوں کے قافلوں پر بدوؤں کے حملے، لوٹ مار جیسے واقعات سے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ اس سفرنامے میں مصنفہ نے روزمرہ بول چال کے عربی الفاظ اور جملوں کی شمولیت کا التزام بھی کیا ہے۔ طرزِ املاکے نقطہ نظر کودیکھیں تو مصنفہ نے قدیم

طرز املا کا رویہ اپنا کر یائے معروف اور مجہول میں کوئی فرق نہیں کیا۔ اس کے علاوہ دو چشمی ھ کے بجائے ہائے ہوز کا استعمال بھی کیا ہے۔ مثلاً کبی (کبھی)، کچہہ (کچھ)، کہانا (کھانا) اور مجہہ (مجھ) وغیرہ اور ساتھ ہی دو الفاظ کو ملا کر لکھنے اور قدیم طرز پر زائد الفاظ کے استعمال کا رجحان بھی بہت ہے۔ مثلاً جنپر (جن پر)، اسمیں (اس میں)، اُونکی (اُن کی) ، اُوسکے (اُس کے)۔ اس کے علاوہ نون غنہ والے لفظوں میں نون استعمال کیا ہے جیسے مین (میں)، ہین (ہیں)، کرین (کریں)، وہان (وہاں)، یہان (یہاں) وغیرہ۔

یہ سفرنامہ چوں کہ نوآبادیاتی عہد میں تحریر کیا گیا ہے۔ اس لیے یہ اپنے عہد کی ایک اہم تاریخی دستاویز بھی ہے۔ جس سے حکمران بھوپال کے سلطنت برطانیہ کے ساتھ تعلقات کی نوعیت کا پتہ چلتا ہے۔ اس لیے یہ سفرنامہ اہم سفرناموں میں شمار کیا جاتا ہے۔

۳۔۱۔دنیا عورت کی نظر میں از بیگم سر بلند جنگ بہادر

دنیا عورت کی نظر میں نواب بیگم سر بلند جنگ بہادر کا سفرنامہ ہے۔جو خواجہ برقی پریس دہلی سے ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا۔ بیگم نواب ۲۷ شوال بمطابق ۱۶ نومبر ۱۹۰۹ء میں نواب حمید اللہ خان کے ساتھ حج بیت اللہ کے سفر پر روانہ ہوئیں۔ اُن کا یہ سفر ۱۸ مارچ ۱۹۱۰ء کو حیدرآباد دکن پر ختم ہوا اور اس طرح اُن کا یہ سفر تقریباً چار ماہ کی مدت میں مکمل ہوا۔ اس سفر میں ان لوگوں کے ہمراہ دو ملازمین بھی تھے اور انہوں نے حیدرآباد سے عدن، سویز، پورٹ سعید، حافہ، شہر ندرت، طبریہ، مدینہ و مکہ منورہ، دمشق، بیروت قسطنطنیہ، اسکندریہ، ایتھنیز، پیرس، روم، لندن کا سفر کیا۔ انہوں نے جس بحری جہاز پر سفر شروع کیا اس کا نام "سال سٹ" (Salsette)تھا اور یہ جہاز پی۔اینڈ۔ او۔کمپنی کا تھا۔ بیگم سربلند صاحبہ کا یہ بحری جہاز کا پہلا سفر تھا۔اس سے پہلے انہوں نے کبھی کشتی یا جہاز نہیں دیکھاتھا تو کشتی کےمتعلق لکھتی ہیں کہ جب کشتی چلی تو میں نے گھبرا کر پوچھا کہ یہ کیسی جگہ ہے۔ جو ہلتی ہے۔ تو نواب صاحب نے

بتایا کہ یہ کشتی ہے جو ہمیں جہاز تک لے کر جائے گی۔[15] مصنفہ نے دورانِ سفر ہی اس سیاحت نامے کو لکھنا شروع کر دیا تھا اور وہ روزانہ ڈائری میں روز کی مصروفیت درج کرنا نہیں بھولتی تھیں اور پھر اختتام سفر پر انھوں نے روزنامچے کی صورت میں سفرنامہ دنیا عورت کی نظر میمیں ۱۹۱۰ء میں خواجہ برقی پریس نے دہلی سے شائع کیا۔ اس سفرنامہ کا نام ہی اس سفرنامہ کی اندر کی داستان کا خلاصہ ہے۔

اوائل بیسویں صدی کے ہندوستان کی اس باسی نے بیرونی دنیا کو جیسا دیکھا اس کو ہو بہو اہلِ ہندوستان کو دکھانے کی سعی کی ہے۔ وہ وہاں کی تہذیب و معاشرت اور نئی نئی ایجادات کو دیکھ کر خود بھی متاثر ہوتی ہیں اور اپنی سب کیفیات ، تجربات اور مشاہدات میں دوسروں کو بھی شریک کرتی ہیں۔ بحری جہاز میں انھوں نے برتنوں کو مشین کے ذریعے دھلتےدیکھا تو حیرت کا اظہار کرتی ہیں کہ برتن عجیب طرح سے دھوئے جاتے ہیں۔ بیسن میں برتن ڈال دیے اور نل موڑ دی برتن اوپر نیچے ہو گئے اور گرم پانی سب برتنوں میں پھر گیا، بس دھل گئے۔[16] مصنفہ نے ہر شہر اور ممالک کے لوگوں کے رہن سہن کو تفصیلی بیان کرنے کے ساتھ ساتھ لندن، فرانس اور جرمنی کے عجائب خانے ، نیشنل گیلری، تھیٹرز اور مصر کے عجائب خانوں میں ممیز دیکھ کر اپنی حیرت کا اظہار یوں کیا ہے۔

> ایک چیز ایسی دیکھی کہ جس سے افسوس بھی ہوا اور حیرت بھی ہوئی۔ وہ یہ کہ اگلے بادشاہوں کی نعش کو ایک بکس بنوا کر اس میں کچھ روپیہ جواہرات رکھ کر بند کر دیا کرتے تھے اور اوپر بادشاہ متوفی کی تصویر لگادیتے تھے۔ ان لوگوں نے اس بکس کو تو کھڑا کر دیا بعض کو بند بعض کو کھول کر آئینہ کی الماری مثل تحت کے بنا کر اُسی میں رکھ دیا ہے۔[17]

اس سفرنامہ میں بیت اللہ کے روح افزا سفر کے ساتھ یورپی ممالک کے لوگوں کے رہن سہن اور وہاں کے بازاروں، عمارتوں کی تصویر کشی بھی ہے۔ سفرنامہ کے ابتدائی حصہ میں حج بیت اللہ اور مناسک حج کا بیان ہے اور بعد کا سفر

یورپی دنیا کے دل کش مناظر کی عکاسی ہے۔ مگر اس کی ہیئت روزنامچے کی سی ہے جس میں روزانہ کے معمول، کھانا، سونا اور دیگر ضروریاتِ زندگی کی تفاصیل ضرورت سے زیادہ ہیں۔ اس سفرنامے کے بارے میں ڈاکٹر مرزا حامد بیگ یوں رقم طراز ہیں:

> اس سفرنامے کے عنوان سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں مشرقی عورت یورپ کے تہذیبی مطالعے کو کس قدر اہمیت دے رہی تھی۔ یوں بیسویں صدی عیسوی کے نصف اول کی ابتدا خواتین کے سفرناموں میں یورپ کی جانب نظر اٹھا کر دیکھنے سے ہوئی۔ [۱۸]

اس نوآبادیاتی عہد میں ہر طبقے کی خواتین پردے کا خصوصی اہتمام کرتی تھیں۔ بیگم سربلند جنگ بھی ان روایات کی پاسدار تھیں اور انھوں نے یہ سفر پردے کے ساتھ کیا۔ سفرنامے میں جا بجا انھوں نے پردے کے بارے میں تحریر کیا ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتی ہیں کہ نواب سربلند جنگ بہادر نے آکر کہا کہ چلو میز تیار ہے، مصنفہ نے کہا سب کے ساتھ کھانا کھاؤں؟ تو نواب صاحب نے جواب دیا چلو یہاں کون دیکھتا ہے۔ اس نے ایک کلوک پہنا جو خاص اس سفر کے لیے سلوایا تھا اور ترکی نقاب منہ پر ڈال کر ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔مگر اسے جاتے ہوئے بہت شرم محسوس ہوئی۔ اتفاق سے جس میز پر آکر بیٹھی یہ بالکل علیحدہ تھی اوراس کا منہ صرف نواب صاحب کی طرف تھا اور منہ سے نقاب اٹھا دی۔[۱۹] ان تمام عبارات سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ طبقۂ اشرافیہ کے مرد و زن دو رخی رویہ اختیار کیے ہوئے تھے۔ اندرونِ ہندوستان وہ سختی سے پردے کا اہتمام کرواتے اور بیرونِ ممالک میں اس قید سے آزاد ہو کر سیر و سیاحت اور اپنے دیگر امور انجام دیتے تھے۔ اس عہد کی تمام سفرنامہ نگارخواتین جیسے عطیہ فیضی، نازلی بیگم، صغرا ہمایوں اور محمودہ عثمان حیدر نے اپنے وطن سے باہر پردہ ترک کرنے میں ہی عافیت جانی ہے۔

مصنفہ کو دورانِ سیاحت اپنا ملک برابر یاد آرہا تھا۔ وہ جس جگہ سے گذرتیں اس میں اپنے ملک کے کسی شہر اور مقام سے مناسبت تلاش کرنے کی کوشش کرتیں۔ اپنی اس

کوشش میں ان کو کئی جگہ کامیابی ملی اور انھوں نے اس کو بیان بھی کیا ہے۔ جیسے ترکی کا اپنے ملک سے موازنہ یوں کرتی ہیں۔

> قسطنطنیہ کا آدھا حصہ یورپ میں ہے آدھا ایشیا میں۔ بیچ میں سمندر ہے درمیان میں پل ہے۔ یورپ کا حصہ بھی سلطان ہی کی حکومت میں داخل ہے مگر یہ پیرا جہاں ہم اُترے ہیں اس کی حالت ایسی ا جیسے ہمارے ہاں کا سکندرآباد۔ [۲۰]

حج کا سفر ایک اہم عبادت اور فریضہ سمجھ کر کیا جاتا ہے۔ اس سفر میں ایک مسلمان کو ان مقامات کی زیارت کرنے کا موقع ملتا ہے جن کا ذکر وہ ہمیشہ سنتا چلا آیا ہے۔ اس لیے جب وہ اس مقدس شہر میں داخل ہوتا ہے تو اس پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے، جس میں عقیدت و احترام کے جذبات ہوتے ہیں۔ قرب خداوندی کے شوق کے ساتھ ان راستوں سے گذرنے کی آرزو بھی ہوتی ہے۔ جن پر کبھی رسول رحمت اور ان کے اصحاب گذرتے تھے۔ اس لیے اس سفر کے مسافر کی اندرونی کیفیت بدل جاتی ہے۔ اسی کیفیت کا ایک خوبصورت اظہار وہ اس طرح بیان کرتی ہیں:

> جلدی سے ایک عجب شوق میں حرم پاک کی طرف روانہ ہوئے۔ میں اپنے قلب کی حالت بیان نہیں کر سکتی۔ لبیک برابر زبان پر جاری ہے اور آنسو آنکھوں سے بہہ رہے ہیں۔ سامنے سے باب حرم پاک نظر آیا۔ کیاشان جبروت میں بیان کروں بہت جلدی بصد شوق قدم بڑھایا اور درِ حرم کو چوما، سامنے حرم پاک نظر آگیا۔ باب السلام سے سرسجدہ کی خاطر جھکنے لگا کیسا دلربا میرے اللہ کا گھر ہے۔ [۲۱]

مصنفہ نے ارضِ مقدس میں اپنی داخلی کیفیات کا اظہار بڑی تاثیر اور عقیدت سے کیا ہے ۔ ان کے دل میں اس پاک زمین کا تقدس، اس کی عظمت اور محبت سمائی ہوئی ہے۔ کیوں کہ یہاں خدا کا گھر اور رسول پاک کی آرام گاہ ہے۔ اس سفرنامہ میں اختصار و سادگی اور سلاست کے ساتھ ذاتی مشاہدات ِقلبی اور واقعات ظاہری کو پیش کیا گیا ہے۔

بیگم سربلند جنگ حرم نبوی کی زیارت کے لیے بہت بے قراری سے لکھتی ہیں اب ہم دونوں مشتاقانِ دیدار بے اختیار کھڑے ہو گئے اور نہایت بے تابی کے ساتھ دیکھنے لگے تاکہ وہ روضۂ انور نظر آجائے ۔ خوشی اور شوق دیدار روضۂ نبی سے آنسو جاری ہو گئے۔ کھجوروں کے درخت بھی نظر آنے لگے ۔ جوں جوں سٹیشن اور اہلِ مدینہ نظر آتے جاتے ہیں ویسے ویسے دل کی بے تابی بڑھتی جاتی ہے۔اس طرح کی جذباتی اور دلوں کو گرمانے والی عبارتوں سے سفرنامہ بھرا ہوا ہے۔ بیگم سربلند جنگ نے سفرنامے کی ابتدا ہی دلگیر مناظر کو پیش کر کے کی ہے کہ جب وقتِ رخصت اپنوں نے پھولوں کے ہار آنسوؤں کے ساتھ پہنائے اور امام ضامن دعاؤں سے باندھے تھے اور انھوں نے صرف اپنے امام ضامنوں کی تعداد ۶۰۰ بتائی ہے۔ [22] سربلند جنگ بہادر کے امام ضامنوں کی تعداد ان کے علاوہ ہے۔ تو ان تمام اقتباس سے ان کی مذہب سے گہری وابستگی کا اظہار ہوتا ہے۔

سفرنامے دنیا عورت کی نظر میں مستشرقین کا ہندوستانیوں کے بارے میں شرق شناسی (Orientalism) کے رویے کا اظہار بھی کئی جگہ پایا جاتا ہے جیسے ایک جگہ مصنفہ لکھتی ہیں کہ اثنائے گفتگو میں ڈاکٹرنے مجھ کو دیکھا اور ہنس کر کہا کہ ہند میں تو بی بی لوگ کو بند کر کے مثل قیدی کے رکھتے ہیں۔ یہ سن کر مجھ کو بھی ہنسی آئی ۔ [23] اس سفرنامے میں نہ صرف دیارِ مقدسہ کے روح پرور مناظر کی جھلک نظر آتی ہے بلکہ مشرقیت کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ یہ سفرنامہ اس دور کی ایک تاریخ ہے دوسری بات یہ کہ سفرنامہ شستہ اردو میں تحریر کیا گیا ہے جس کی نثر میں سپاٹ پن نہیں ہے بلکہ دل چسپی سے بھرپور ہے۔

اس سفرنامے میں مصنفہ نے معجزاتی پہلو کو بھی بیان کیا ہے اور وہ اسے غیبی فرشتے کا نام دیتی ہیں۔ ہر مسلمان کی طرح مصنفہ کو بھی حجرِ اسود کو بوسہ دینے کی دلی آرزو تھی لیکن ایک جم غفیر کو دیکھ کر وہ مایوس و رنجیدہ ہو کر اپنے پروردگار سے اس خواہش کو پورا کرنے کی دعا کرتیں تھیں کہ:

> ایک روز دریائے رحمت جوش میں آگیا ۔ یکایک ایک
> سدی حبشی قوم کا آدمی عمامے باندھے میرے پاس آیا
> اور کیا خوب سوال کیا کہ "یاستی انت بغیت بوسہ"
> یک دم میری زبان سے نکلا کہ "نعم یاسیدی" اتنا کہتے
> ہی اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور اس کثیر اژدہام میں بچا
> کر لے چلا اس آسانی سے کہ گویا میں سیدھی گھسی
> چلی جا رہی ہوں ایک دم میرا سر پکڑ کر حجرِ اسود
> پر جھکا دیا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے مجھ کو گھیرے
> کھڑا رہا کہ میں دَب نہ جاؤں۔ میں نے متواتر کئی
> بوسے لیے۔ بعد کو اس نے مجھ کو گھسیٹ لیا اور باہر
> نکال لایا اور کہا کہ میرے پیچھے پیچھے چلی آؤ۔ زبان
> اس کی عربی ہے۔ مگر میں سمجھ رہی ہوں۔ ایک
> مقام پر قریب خطیب کے لیجا کر مجھ سے کہا کہ
> "ہاتھ اٹھاؤ " اور خوب دعا میرے اور میرے والدین کے
> لیے مانگی۔ بعد اس کے ایک سیاہ کپڑا خانہ کعبہ کا اور
> عقیق البحر کی تسبیح عنایت کی۔ میں نے دو روپے نذر
> کیے تو نہ لیے اور بہت خوشی سے میری پشت پر ہاتھ
> پھیرا اور کہا "سخن روح منا نہا ں" ۔ اب جاؤ یہاں
> سے بس میں پھر بہت خوش خوش باہر حرم شریف
> کے آئی۔ ۲۴

اس سفرنامے سے اہلِ یورپ اور اہلِ ارضِ مقدس کی سماجی زندگی کے ساتھ ساتھ ان کی مذہبی اور ثقافتی زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اس سفرنامے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں وارداتِ قلبی کے ساتھ واقعات سیاحت کو بھی قلم بند کیا گیا ہے کیونکہ مصنفہ نے حج بیت اللہ کی سعادت کے بعد یورپی ممالک کی سیاحت بھی کی تھی اور یہ سفرنامہ بیسویں صدی کے اوائل کے سفرناموں میں اہم سفرنامہ ہے۔

۴۔۱۔ سفرنامہ عراق از بیگم صغرا ہمایوں

اب تک دیارِ مقدسہ کے جو سفرنامے ملے ہیں ان میں ایک اہم مذہبی سفرنامہ سفرنامہ عراق ہے۔ یہ سفرنامہ اُس عہد کی مشہور ادیبہ اور خواتین کے حقوق کی جنگ لڑنے والی بیگم صغرا ہمایوں کا ہے۔ اس سفرنامے کو مطبع نظام دکن نے ۱۹۱۵ء میں شائع کیا۔ مصنفہ نے یہ سفر اپنے خاندان کے افراد اور ملازموں کے ساتھ عراق کے مقدس مقامات کی

زیارت کی غرض سے اختیار کیا تھا۔ ان کا چھوٹا سا قافلہ ۱۱ مارچ ۱۹۱۵ء کو حیدرآباد دکن سے بذریعہ ٹرین روانہ ہوا۔ مصنفہ نے اپنے سفرنامے روزنامچے کی ہیئت میں تحریر کیے ہیں اور اس اندازِ تحریر سے انھوں نے یہ فائدہ اٹھایا ہے کہ وہ اپنے قاری کو بھرپور سماجی و ثقافتی، تاریخی و معاشی معلومات فراہم کرتی ہیں اور جزئیات کو باہم مربوط کرتی ہیں۔ ان کا مطالعہ اور مشاہدہ بہت گہرا ہے۔ وہ ایک ایک نظارہ، مقامات، موسموں ، رہن سہن، معیشت اور رسم و رواج کی تفصیلات سمیٹتی جاتی ہیں اور پھر اپنے قار ی کو اس میں شریک کرتی ہیں۔ وہ اپنے سفرناموں کے ذریعے دوسرے ملکوں، شہروں کی سیاسی، سماجی، ثقافتی اور معاشی صورت حال پر روشنی ڈالتی ہیں۔ وہ کسی بھی ملک یا شہر کی تاریخی معلومات دیے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھتیں۔ جس کا فائدہ آج سے بڑھ کراوائل بیسویں صدی کی خواتین کو پہنچا ہو گا کہ جن کو اپنے گھر کی چار دیواری سے باہر قدم رکھنے کی آزادی نہ تھی۔ اس دور میں سفرنامے لکھنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ان لوگوں کو اپنی تحریروں سے ان جگہوں سے متعارف کروایا جائے جہاں تک کہ ان کی رسائی ممکن نہیں اور وہ بیرونی ممالک کی ترقیوں سے آگاہ ہوں۔

مصنفہ نے اس سفرنامے میں عراق کے معاشرے اور ثقافت کا تفصیلی حال لکھا ہے۔ انھوں نے ۱۹۱۵ء میں عراق کا یہ سفر کیا۔ ان کا یہ سفر کچھ مہینوں پر مشتمل ہے۔ وہ بمبئی ، کراچی سے ہوتے ہوئے بصرہ، بغداد، کاظمین، سامرہ، کربلا معلّی، نجف اشرف گئیں اور زیارت گاہوں پر حاضری دی۔

بیگم صغرا کے اس سفرنامے کی اہمیت اس کے گراں قدر دیباچے کی وجہ سے بھی بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ انھوں نے اپنے اس سفرنامہ عراق میں اپنے خاندانی حالات آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کر دیے ہیں۔ یہ ان کا ایک ایسا کارنامہ ہے۔ جو کسی دوسری تصنیف میں نہیں ملتا اور آج کی اکیسویں صدی میں اس عہد کی ادیبہ کے خاندانی حالات جاننے کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی مواد نہیں ہو سکتا۔ دوسری اس سفرنامے کی خاصیت یہ ہے کہ اس کے سرِورق پر بیگم صغرا کا لقب "حجلہ نشین و عصمت و عزلت بیگم صاحبہ" درج ہے۔لیکن اس القاب

عزلت بیگم صاحبہ کو کسی دوسری خاتون سفرنامہ نگار کا نام سمجھ کر اس سفرنامہ عراق از صغرا ہمایوں (۱۹۱۵ء) کو اس سے منسوب کیا جاتا رہا ہے اور اکثر کتب میں یہ سفرنامہ عراق از عزلت بیگم تحریر چلا آرہا ہے جو ایک تحقیقی خامی ہے۔ راقمہ نے سفرنامہ کی تاریخی کتب میں اس کی جانچ پڑتال شروع کی اور تذکروں میں بھی اس نام کی خاتون کو تلاش کیا مگر ناکامی ہوئی لیکن ایک دن اچانک یہ سفرنامہ ملنے پر سرورق پر درج اس القاب نے راقمہ کی تحقیق کو مکمل کیا اور ثابت ہوا کہ سفرنامہ عراق از حجلہ نشین و عصمت و عزلت بیگم صاحبہ صغرا ہمایوں مرزا کی تصنیف ہے۔ [۲۵]

چونکہ یہ مصنفہ ایک اچھی شاعرہ بھی تھیں تو اس حوالے سے انھوں نے اپنا دیباچہ ان حمدیہ شعروں سے شروع کیا ہے۔

تو ہے خالق انس و جاں یا الٰہی — تو ہے رازق این و آں یا الٰہی
توہی رازق نیک و بد ہے — تو ہے وارث بندگاں یا الٰہی
بٹھائے اُسے اک جہاں اپنے سر پر — تو جس پر کہ ہو مہرباں یا الٰہی
ترا باغ جنت ہے تیرا ہی دوزخ — زمیں تیری اور آسماں یا الہٰی [۲۶]

اس کے بعد نعتیہ شعر کچھ یوں ہیں۔

محمدؐ سے صفت پوچھو خدا کی — خدا سے پوچھیے شان محمد
علی کا مرتبہ اللہ اکبر — خدا نے تیغ دی احمد نے دختر [۲۷]

بیگم صغرا سیاحت کی شوقین تھیں انھوں نے نہ صرف اپنی سیاحت میں دوسروں کو شریک رکھا بلکہ ان کی ایک شعوری کوشش یہ بھی تھی کہ وہ برصغیر کے لوگوں کو اور خصوصاً عورتوں کو دوسرے ملکوں کی بودوباش، طرزِ تعمیر،

نظام معیشت، رسم و رواج، زبان اور موسموں کا احوال زیادہ سے زیادہ بیان کریں۔ وہ جن مقامات پر بھی زیارت کے لیے گئیں وہاں کے حالات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ جیسا کہ وہ بتاتی ہیں۔

> جب تک کاظمین رہی اس کی صحت بہت اچھی رہی۔ بھوک خوب لگتی تھی۔ وہاں کی کھجوریں انھیں بہت پسند آئیں۔ وہاں کی روٹی بہت اچھی ہوتی تھی جس کو نان آبی کہتے ہیں۔ آدمی کے قد سے بھی بڑی بڑی روٹی ہوتی تھی۔ جس کو کاٹ کر ، تول کر فروخت کرتے تھے ۔ بازاری کباب بھی ان کوبہت پسند آئے ، وہاں ترکاری بھی تول کر بیچتے ہیں۔ ۲۸؎

اس سفرنامہ کے متعلق ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں۔

> اس میں مقدس بارگاہوں پر حاضری کے نقوش اور ان حاضریوں سے پیدا ہونے والے تاثر کو پیش کرنے کی کاوش کی گئی ہے۔ بیگم ہمایوں کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے زیاراتِ مقدسہ کی فضیلت کے نقوش بھی جابجا نکھارے ہیں اور اس میں اپنے جذبہ عقیدت کو بھی بے نقاب کیا ہے۔ دوسری خوبی یہ ہے کہ اس سفرنامہ میں سماجی اور تہذیبی نقوش کو بھی مناسب انداز میں اجاگر کیا گیا ہے۔[۲۹]

سفرنامہ عراق ایک دلچسپ اور معلوماتی سفرنامہ ہے۔ یہ سفرنامہ مختصر ہوتے ہوئے بھی عراق کی سماجی، تہذیبی و تمدنی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ مقدس زیارت گاہوں کا نقشہ کھینچتا ہے۔ مصنفہ شاعرہ بھی ہے اس لیے انھوں نے سفرنامہ میں اپنے اشعار کا استعمال کیا ہے جس سے سفرنامہ اور بھی دلکش بن گیا ہے۔ بطور نمونہ ایک نوحہ:

لاش شہ دیں پر یہی زینب کا بیاں تھا — صدقے ہوئی زینب
کیا جلد جہاں سے گئے ہے ہے مرے بابا — صدقے ہوئی زینب

اماں کا اٹھا سایہ تھا سر پر سے ہمارے
زینب
بابا بھی سدھارے

ہم کس سے کریں ہائے یہ تقدیر کا شکوا
صدقے ہوئی زینب

کلثوم بھی چلاتی ہے اور کرتی ہے فریاد
میں ہو گئی ناشاد

اب کوئی نہیں آن کے سینے سے لگاتا
صدقے ہوئی زینب

حسنین بُکا کرتے ہیں دیکھا نہیں جاتا
شق ہوتا ہے سینا[۳۰]

مصنفہ مختلف زیارت گاہوں پر گئیں اور اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے ان بزرگانِ دین میں حضرت عبد القادر جیلانی، حضرت امام ابو حنیفہ، امام حضرت موسیٰ کاظم، حضرت امام علی تقی، حضرت امام حسن عسکری، حضرت نرگِس خاتون والدہ معظمہ حضرت امام مہدی، حضرت عون محمد، حضرت علی اکبر، حضرت اصغر، حضرت ابوالفضل عبا س شامل ہیں۔ سفرنامہ چونکہ زیارت گاہوں پر مشتمل ہے اس لیے جذبات فطرتاً مذہبی ہو جاتے ہیں۔ ہر جگہ کی زیارت کرتے ہوئے وہ اشکبار ہو جاتی ہیں اور سوچتی ہیں کہ کس کس طرح اہلِ بیت نے کربلا میں حق و سچ کے لیے قربانیاں دیں۔ ایک جگہ ان کی جذباتی کیفیت ملاحظہ کیجیے۔"ایک تو یہ لوگ عرب دوسرا قرأت سے واقف اس قدر بلند آواز سے پڑھتے ہیں کہ تمام گنبد گرج جاتا ہے۔ میرے بدن میں سنسنی ہونے لگتی تھی اور رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔"[۳۱]

سفرنامہ عراق کی تاریخی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس میں مختلف شہروں کے تاریخی حالات بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ راستے کی مشکلات اور موسموں

کا حال بھی ملتا ہے۔ وہ موسم کا حال بھی لکھتی ہیں۔موسم کافی ابرآلود تھا۔ کافی جگہوں پہ طوفان کا سماں تھا۔ آندھی اس قدر شدید تھی کہ آگے کچھ نظر نہ آتا تھا اور ٹھنڈ کا یہ عالم تھا کہ دانت بجنے لگے۔ [۳۲]

مصنفہ نے مقدس مقامات کی زیارتوں کی عقیدتوں کے ساتھ ساتھ اہلِ ہندوستان کے متعلق اہلِ عراق کے رویے کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ اس کااظہار دکھ کے ساتھ کیا ہے۔

> جوں ہی حمام میں داخل ہوئی دروازے کے قریب ایک عورت وحشت ناک شکل کی میرے پاس ناک بھوں چڑھائے ہوئے آئی۔ افسوس کا مقام ہے کہ ہندی لوگوں کو عرب و عجم حقارت سے دیکھتے ہیں۔ میرے قریب فیس داخلے مانگنے کے لیے آئی۔ میرے آدمیوں کو دیکھ کر آپس میں یہ وحشی عورت ایک دوسری عربن سے جو اس کے برابر کھڑی تھی کہنے لگی "کسے ہندی آمدہ" جب میں نے چہرے سے نقاب اٹھایا تو سب کے سب یعنی وہ عورتیں بھی جو حمام کے لیے وہاں آئی ہوئی تھیں، نہایت تعجب سے مجھے گھورنے لگیں۔ ان کی ٹکٹکی جو بندھ گئی تھی کسی طرح موقوف ہی نہیں ہوتی تھی اور ایک دوسرے سے کہنے لگیں "ہندی نیست نسل عجم است" میں چپ سن رہی تھی۔ ۳۳۔

بیگم صغرا ہر چیز کا گہرا مشاہدہ کرتی تھیں اور پھر ایک جز کو دوسرے سے یوں ملاتیں کہ ایک تسلسل قائم ہو جاتا تھا۔ ان کے باریک مشاہدے کی کیفیت اس اقتباس سے عیاں ہوتی ہے۔

> بیچ کے الحاق جس میں فریح مبارک حضرت سیّد الشہدا کی ہے ۔ ایک جانب ایک چاندی کی ایک اور ضریح ہے جس میں حضرت قاسم وغیرہ ہیں اس میں حبیب ابنِ مظاہر کی تربت ہے۔ ایوان مبارک کے چاروں طرف صحن بہت وسیع ہے۔ میوہ فروشوں ، کتب فروشوں کی متعدد دکانیں جا بجا صحن کے اطراف میں چائے خانے، قہوہ خانے بکثرت ہیں۔ سقّے قدم قدم پر کٹورے بجاتے پھرتے ہیں۔ [۳۴]

اس سفرنامے میں مصنفہ نے جگہ جگہ قافلہ کربلا اور خاندان نواسہ رسولؐ کے صبر اور ایمان افروز قربانیوں کے ساتھ ساتھ ان کے بہت سے واقعات بھی قلم بند کیے ہیں۔ مصنفہ کو اہلِ بیت کے کارنامے اور ان کے تاریخی واقعات سے بہت عقیدت ہے۔ اور وہ ہر ایک کو تفصیل سےبیان کرتی ہیں۔ حضرت عباس ؑ کا نہر سے پانی لانا اور شہادت، حضرت زین العابدین کی علالت اور معصوم اصغر کی شہادت کے واقعات ہیں۔ا یک واقعہ ملاحظہ ہو۔

> یہ وہی نہر ہے۔ جس پریزید پلید نے پہرے لگائے تھے تاکہ اہلِ بیت کو پانی نہ ملے اور شدت، تشنگی کی تاب نہ لاَ کر امام حسین ؑ بیعت قبول کر لیں حضرت عباسؑ علمدار جب مشکیزہ بھر کر واپس چلے تو ایک تیر کسی شقی کا حضرت کے شانہ مبارک میں ایسا کاری لگا کہ دست مبارک علیحدہ ہو کر وہیں شہید ہو گیا۔[۳۵]

بیگم صغرا نے اس میں عراق کا نظامِ حکومت، فصلیں اور عورتوں کا لباس اور ان کے کام کاج پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ اور وہاں کے لوگوں کی خوراک کے متعلق لکھتی ہیں کہ

> عراق کے چند اقسام کے کھانوں، مٹھائیوں اور حلوے جات کا تذکرہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اب
>
> گوشت سادہ گوشت کا شوربا جس میں تھوڑے سے سالم چنے بھی ڈالتے ہیں۔ واضح ہے۔ کہ عراق کے چنے اس قدر بڑے ہوتے ہیں کہ شاید ہی دنیا کے کسی حصے میں اس قدر بڑے ہوتے ہیں۔ کباب سیخ بازار میں ہمہ وقت ملتا ہے۔ قورمہ، آلو بخارا، قورمہ سیب، قورمہ بادنجان، قنجان مرغ، مسلم مرغ کا کباب اندراس کے مغزاخروٹ پیس کر آب انار میخوش مغز بادام کے ٹکڑے اور زعفران ڈالتے ہیں۔ شیراز سے جو زعفران عراق میں لا کر بیچتے ہیں ۔ کشمیری زعفران سے زیادہ تر بویا خوش رنگ ہوتی ہے۔ اسی طرح عرق بید مشک بھی شیراز کا بہت مفرح ہو معطر ہوتا ہے۔ قیمہ نخود نمکین و شیریں، دنبہ کے گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے ، کچا کچا مٹی کے ظرف میں

> رکھ کر بھونتے ہیں۔ مرک چند ترکاریوں کو ملا کر پکاتے ہیں۔[۳۶]

مصنفہ ایک عورت ہونے کے ناطے اُس ایک چھوٹی سے چھوٹی بات پر بھی نظر رکھتی ہیں جو کسی مرد سفرنامہ نگار کی نظروں سے اوجھل رہتے۔ انھوں نے نہ صرف اندرونِ ہندوستان خواتین کا بغور مشاہدہ کیا بلکہ بیرونِ ملک کی عورتوں کے بھی رہن سہن کو دیکھا اور اپنی عورتوں سے موازنہ بھی کیا۔

> اکثر خواتین اپنی مادری زبان عربی لکھ پڑھ سکتی ہیں۔ بعض فارسی اور ترکی بھی جانتی ہیں۔ سینا، پرونا، کشیدہ نکالنا اچھی طرح جانتی ہیں۔ بعض نقدہ یعنی کا مدانی کا کام بھی جانتی ہیں۔ لباس عموماً اس قسم کا ہوتا ہے۔ چھوٹے پائچوں کا پائجامہ اس پر سے لانبی آستینوں کا کرتہ۔[۳۷]

یہ سفرنامہ مختلف شہروں اور عراق کے رسم و رواج ، ان کے مذہبی اعتقادات، رہن سہن اور طرزِ معاشرت کا آئینہ دار ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سفرنامہ نگار نے عراق کے تاریخی، سیاسی اور سماجی حالات کو تفصیل سے درج کیا ہے۔ یہ سفرنامہ پڑھ کر مقاماتِ مقدسہ اور زیارت کے طریقوں سے بھی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔

۵۔۱۔مشاہدات بلادِ اسلامیہ از محمودہ عثمان حیدر

دیارِ مقدسہ کے سفرناموں میں محمودہ عثمان حیدر کا سفرنامہ ”مشاہدات بلادِ اسلامیہ“ مشرقِ وسطیٰ کے ممالک کے مقدس مقامات کی زیارت گاہوں کے احوال پرمشتمل ہے۔ یہ پہلی بار ۱۹۳۲ء اور دوسری بار ۱۹۶۲ء میں مشہور آفسٹ پریس کے تعاون سے کراچی سے شائع ہوا۔ یہ سفرنامہ دو حصّوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصّے میں سفر کی روداد اور دوسرے میں مختلف بزرگانِ دین کے سوانحی خاکے بیان کیے گئے ہیں۔

بیگم محمودہ عثمان حیدر بھی حقوقِ نسواں کی حامی خواتین میں سے تھیں۔ انھوں نے اپنے سفرنامے میں یہاں مختلف ملکوں کی تہذیب و معاشرت پر روشنی ڈالی ہے۔ وہاں پر وہ ہندوستانی خواتین کی تعلیم اور بیداری کے لیے بھی کوشاں نظر آئیں۔ انھوں نے اس سفرنامے میں مشرقِ وسطیٰ کے ممالک کا تفصیلی حال لکھا ہے۔ انھوں نے ۱۹۲۹ءسے جولائی ۱۹۳۳ء کا عرصہ اپنے شوہر سیّد عثمان حیدر کے ہمراہ مختلف ممالک کی زیارت گاہوں کو دیکھنے میں بسر کیا۔ یہ لوگ ایران، آبادان، بغداد، کربلا معلّی، نجف اشرف، کوفہ، موصل، ترکی، شام، دمشق، حلب، بیروت، حیفہ اور بیت المقدس سے ہوتے ہوئے وطن واپس پہنچے۔انھوں نے یہ سفر مختلف زیارت گاہوں کو دیکھنے کے مقصد سے اختیار کیا تھا۔ وہ اس سفر کے متعلق لکھتی ہیں:

> میرے سرتاج آقائے سیّد عثمان حیدر کو مدت سے بلاد اسلامیہ کی سیاحت کی آرزو تھی۔ آخر میری نند مسز الطاف حسین کے جیٹھ اور ہمارے خالہ زاد بھائی مسٹر سیّد احمد حسین اکسٹرا سسٹنٹ کمشنر سی پی اور اُن کے حقیقی بھانجے سیّد احمد صاحب کی کوششوں سے یہ آرزو پوری ہوئی۔ [۳۸]

بیگم محمودہ عثمان حیدر کو اپنے عہدے اور مقام و مرتبے کا احساس ہے۔ جس کا اظہار سفرنامے میں جا بجا پایا جاتاہے۔ جس سے خود نمائی کا عنصر نمایاں ہوتا ہے ۔ مصنفہ سید سجاد حیدر یلدرم کے خاندان میں سے تھیں۔ اس تعلق کا اظہار بارہا سفرنامے کی زینت بنا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے شوہر سید عثمان حیدر جو کہ ایسٹ انڈیا کی ایک کمپنی "اینگلو پرشین آئل کمپنی لمیٹڈ" میں اعلیٰ عہدے پر ملازم تھے، ان کے عہدے اور مراعات کا خصوصی تذکرہ پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ لکھتی ہیں کہ "جب عثمان صاحب کارِ خاص پر مامور ہوئے تو ان کی پوزیشن ہی کچھ اور ہو گئی۔ نہ پہلی سی ڈیوٹی کی پابندیاں رہیں نہ کسی کی خاص ماتحتی۔ بس اپنے وقت کے نواب بہ ملک تھے ۔ اتفاق سے کام بھی کچھ ایسے تفویض ہوتے تھے جن کی وجہ سے دیارِ غیر میں وہ لطف ہیں کہ وطن میں خواب و خیال میں بھی ممکن نہ تھے۔ کارِ خاص کے علاوہ اب عثمان صاحب دنیا کی بہترین قسم کی کاروں کے بھی مالک

تھے۔[39] اسی قسم کے اقتباسات اور اپنے شوہر کے عہدے سے حاصل شدہ عیش و عشرت کا بیان سفرنامے کی فضا پر ایک عجیب سا تاثر پیدا کرتا ہے۔

اس سفرنامے میں نوآبادیاتی عہد کی نامور ادبی اور سیاسی شخصیات جیسے مشہور شاعر رابندر ناتھ ٹیگور، حکیم سید غلام حیدر ، سید سجاد حیدر یلدرم، نذر سجاد حیدر، مسٹر ٹاؤ صاحب، ہرہائی نس لیڈی علی شاہ(والدہ سر آغا خان) ، محمد سرفراز بیگم، بیرسٹر سرتیج بہادر سپرو سے ملاقاتوں کا ذکر بھی ہے جس سے اس عہد کی تاریخ ساز شخصیات سے آگاہی

ہوتی ہے۔

یہ سفر مقدس مقامات کی زیارت کرنے کی غرض سے کیا گیا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ مختلف ممالک کے لوگوں کے رہن سہن، ان کے رسم و رواج، ان کی ثقافت اور تاریخی مقامات کے متعلق بھی معلومات جاننا چاہتے تھے۔ اس سفرنامے کی اہمیت کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید یوں لکھتے ہیں۔یہ سفرنامہ دنیائے اسلام کی زیارت گاہوں اور مقاماتِ مقدسہ کے بارے میں مفید اور قابلِ اعتماد معلومات فراہم کرتا ہے۔[40]

سفرنامے میں مصنفہ نے مقاماتِ مقدسہ اور بزرگانِ دین کی عظمت کو تفصیلی طور پر بیان کیا ہے۔ انہوں نے مختلف معلومات کے ذریعے سفرنامے کو دلچسپ بنا دیا ہے۔سفرنامہ مختصر ہوتے ہوئے بھی مختلف ملکوں کی ثقافتی اور سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ زیارتوں کا ایسا دلفریب نقشہ کھینچتا ہے کہ پڑھنے والا اس کی روحانی فضا میں کھو سا جاتا ہے۔ اس سفرنامےکی افادیت کے متعلق مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں۔

> حقیقت یہ ہے کہ مشاہدات بلاد اسلامیہ کو پڑھنے کے بعد اپنی محرومی پر افسوس ہوتا ہے کہ میں اپنے دورانِ سفر میں لاعلمی کے سبب بہت سے اہم مقامات کے پاس سے گذرا اور وہاں حاضری نہ دے

> سکے۔ اب آرزو ہے کہ اس کا ایک نسخہ لے کر دوبارہ ارض اسلام کی سیاحت پر جاؤں اور اس کی زیرِ رہنمائی سب مقامات پر حاضری دوں۔ [۴۱]

یہ سفرنامہ زائرین کی سہولت کے لیے بھی لکھا گیا ہے۔ کیونکہ اس عہد میں سفری سہولتیں کم یاب تھیں اور سفر کئی مہینوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ لوگوں کو راستے میں بہت سی مشکلات پیش آتی تھیں۔ ان کی رہنمائی کے لیے یہ ایک عمدہ کاوش تھی۔ اس سفرنامہ کی زبان عام فہم اور سلیس ہے۔ مصنفہ نے مشرق وسطی کے ممالک کی تہذیبی، سماجی اور مذہبی زندگی کو پیش کیا ہے۔ وہاں کے لوگوں کی زبان، عادات و اطوار، عمارات، مساجد، دفاتر وغیرہ سب ہی کچھ ہمیں ان کے سفرنامہ میں مل جاتا ہے۔ ایک جگہ لکھتی ہیں۔

> ایران میں سب سے اچھا شہر یہاں کا پایہ تخت تہران ہے۔ یہاں کی سرکاری عمارات میں پارلیمنٹ ہاؤس، وزرا کے دفاتر یعنی سیکرٹریٹ، یونیورسٹیاں، جنرل پوسٹ آفس، شاہی ہسپتال، فوجیوں کی بارکیں وغیرہ اور شاہی محلات میں گلستان محل قابلِ دید ہیں۔ [۴۲]

اس سفرنامہ میں ہر ملک کی مساجد کی بھی عمدہ منظر کشی کی گئی ہے۔ ایک مثال ملاحظہ کیجیے۔

> یہ مقام اس مسجد میں سب سے متبرک ہے۔ زیر گنبد مخرہ شریف یعنی پتھر کی ایک بڑی چٹان ہے جو قریب قریب معلق ہے۔ گنبد کے چاروں طرف خوب کشادہ دالان ہیں اور یہ تمام عمارت مع گنبد نہایت شاندار اور خوش نما ہے۔ اندر کثرت سے ہیرے جواہرات جڑے ہوتے ہیں اور جا بجا نہایت اعلیٰ نقش و نگار بنے ہوئے ہیں۔ [۴۳]

سفرنامہ مشاہدات بلادِ اسلامیہ میں بہت سے بزرگانِ دین کی کرامات، معجزے اور ان کی اسلام کے لیے دی گئی قربانیوں کا ذکر ہے۔ محمودہ عثمان حیدر کے دل میں بزرگانِ دین حضرت حذیفہ بن الیمان، حضرت جابر بن عبد اللہ، حضرت سلمان فارسی اور حضرت شیخ عبد القادر جیلانی

ہ کی محبت ، عقیدت اور احترام کا گہرا نقش موجود ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس احترام و محبت کے اظہار کے لیے ان مذہبی شخصیات کی نہ صرف خوب صورت حلیہ تراشی کی ہے بلکہ ان کی زندگیوں سے سبق آموز حکایات ، واقعات اور پندونصائح کے فرمودات کو بھی بیان کیا ہے۔ سفرنامہ کا یہ دوسرا حصہ ان بزرگانِ دین کے حالاتِ زندگی اور حلیہ مبارک جاننے کے لیے ایک بڑی اہم کاوش ہے جس کے لیے مصنفہ نے خاصی عرق ریزی سے اس کو مرتب کیا ہے۔

اس سفرنامہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ مصنفہ جس جس جگہ سے گذری وہاں کی ہر ایک بات، تاریخی، سماجی حالات اور عمارتوں کی تفصیلات بھی بیان کی ہیں۔ وہ لاشعوری طور پر ہندوستان سے دیگرمقامات کا موازنہ کرتی بھی دکھائی دیتی ہیں جیسا کہ لکھتی ہیں کہ آبادان جو اینگلو پرشین آئل کمپنی کا صدر مقام اور ہمارا ہیڈ کوارٹر تھا۔ وہاں ایک ماڈل ٹاؤن ہے۔ سڑکوں کی نفاست، برقی روشنی اور دنیا کے ہر حصہ کے اشخاص کا اجتماع دن رات کی چہل پہل اور قسم کے جہازوں کی آمدورفت کے اعتبار سے اس پر لندن نہیں تو بمبئی کا دھوکا ضرور ہو جاتا ہے۔[۴۴]

مصنفہ تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ وہ نہ صرف خود تعلیم کی اہمیت سے آگاہ تھیں بلکہ انھیں ہندوستان کی عورتوں کی تعلیمی پستی کا بھی گہرا احساس تھا۔ اس لیے وہ بلادِ اسلامیہ کی سیاحت کے دوران اور واپسی پر ہندوستانی عورت کی حالت پر رنجیدہ رہی۔ اس لیے انھوں نے سفرنامہ کے آخری مضمون "ہندوستان اور بلادِ اسلامیہ" میں مسلمان قوم اور یورپی اقوام کی خواتین کی تعلیمی صورت حال کا موازنہ ان الفاظ میں کیا ہے کہ بلادِ اسلامیہ کی سیاحت کے بعد اپنے ملک کو آکر دیکھا تو عجیب عالم نظر آیا۔ بمبئی، دہلی، لکھنؤ غرض جہاں بھی دیکھیے مردتو ضرور کچھ ترقی کی دوڑ میں نظر آتے ہیں مگر عورتوں کے لیے ان کی تنگ خیالی میں ابھی تک کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔[۴۵] عورتوں کی تعلیم کے حوالے سے سفرنامہ کا یہ آخری حصہ واعظانہ اہمیت رکھتا

ہے۔ مصنفہ اس میں ایک مقررہ کی صورت اختیار کر لیتی ہیں اور مزید لکھتی ہیں:

> ہمارے مرد تو بڑی ڈگریاں حاصل کرتے ہیں مگر عورتوں کی یونی ورسٹی صرف گھر ہی میں ناظرہ قرآن پڑھنے تک محدود ہے۔ ہزار میں دو چار اگر کچھ پڑھی لکھی ہیں تو وہ بھی نہ ہونے کے برابر ہیں۔ وہ غیر ممالک کی نسوانی ترقی و آزادی کی تعریفیں تو بہت کچھ کرتے ہیں مگر انہیں خیال بھی نہیں آتا کہ اپنے گھر کی ہونہار لڑکیوں کو ویسا بنانے کی کوشش کریں۔ یہ ہے ہمارے ملک و قوم کی حالت۔ یہاں غلامی و زباں بندی کے اٹل قانون پرعمل کیا جاتا ہے۔ (۴۶)

بنائیں کیا سمجھ کر شاخِ گل پر آشیاں اپنا

اے بلادِ اسلامیہ میں آزادیٔ کی زندگی بسر کرنے والو ہماری مدد کرو۔ ہمیں غلامی کی جکڑ بندیوں سے خدارا جلد آزاد کراؤ۔ ہم دولت نہیں مانگتے، حکومت نہیں مانگتے۔ بس اپنا جائز حق مانگتے ہیں جو ہمارے اور تمہارے لیے یکساں قابلِ احترام ہے۔ ہمارے مردوں کو شمشیر سے نہیں بلکہ اپنی تحریر و تقریر سے یہ بتا دو کہ ہمارا بھی کتنا اور کیا حق ہے؟ (۴۷)

اس سفرنامے میں انہوں نے کربلائے معلی نجف اشرف، بیت المقدس اور دیگر مقاماتِ مقدسہ کی زیارتوں اور ان کے تاریخی ، سماجی اور ثقافتی حالات بیانیہ انداز میں پیش کیے ہیں۔ اس میں مقدس مقامات کا احوال بھی کافی تفصیل کے ساتھ درج کیا گیا ہے جس سے اس کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہے۔

۶۔۱۔ سفرنامۂ عراق از بیگم حسر ت مؤانی

سفرنامۂ عراق بیگم حسرت موہانی کے دیار مقدسہ کے سفر کی یادگار ہے۔ انہوں نے یہ سفر ۱۹۳۶ء میں اختیار کیا اور اس سفر کی ایک اہم بات یہ ہے کہ مصنفہ نے اپنے اہلِ خانہ کے ہمراہ خشکی کے راستے سے عراق سے ہو کر حج کی

سعادت بھی حاصل کی تھی۔ بیگم حسرت نے اس سفر کے دوران مختلف مقامات سے بہت سے خطوط اپنی بیٹی نعیمہ بیگم کو ارسال کیے تھے جن میں اپنے احساسات و تجربات اور مشاہدات کو تفصیل سے تحریر کیا۔ ان کی وفات کے بعد مولانا حسرت موہانی نے ان خطوط کو اردوئے معلیٰ میں سفرنامہ عراق کے نام سے ۱۹۳۷ء میں شائع کیا اور پھر بعد میں یہ کتابی صورت میں مولانا حسرت کے دیباچے کے ساتھ شائع ہوئے۔

اس سفرنامہ میں ان تمام لوگوں کا بھی ذکر ملتا ہے۔ جن کے ہمراہ بیگم حسرت نے سفر کیا اور اس کے علاوہ زیارت گاہوں اور وہاں کی تہذیب ومعاشرت کا تفصیلی ذکر اس سفرنامہ کی اہمیت کو مزید اجاگر کرتا ہے۔ اس سفرنامہ کے بارے میں ڈاکٹر مرزا حامد بیگ یوں رقم طراز ہیں کہ نشاط النساء بیگم نے اپنے میاں مولانا حسرت کے ہمراہ ۱۹۳۶ء میں عراق کا سفر کیا تھا۔ انہوں نے سفرنامہ عراق قلم بند کرتے ہوئے عراق کے طرزِ تمدن کا گہری نظر سے مشاہدہ کیا اور شگفتہ طرزِ بیان اپنایا۔[۴۸]

بیگم حسرت نے ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۶ء تک مولانا کے ساتھ تین حج کیے۔ انھی اسفار میں سے ایک سفر کے دوران لکھے گئے خطوط کو مولانا حسرت نے سفرنامہ عراق کے نام سے مرتب کیا۔ اس میں آخری کچھ حصّہ مولانا نے مکمل کیا ہے۔ کیونکہ بیگم حسرت اپنی علالت کی وجہ سے اپنی بیٹی نعیمہ سے خطوط کا سلسلہ جاری نہ رکھ سکی تھیں۔ اس سفرنامہ کے متعلق سیّد شفقت رضوی لکھتے ہیں۔

> سفر حج کے دوران میں بیگم حسرت اپنی بیٹی نعیمہ بیگم کو تفصیلی خط لکھتی رہیں۔ جن میں سفر کے حالات کے علاوہ جن مقامات پر قیام رہا وہاں کے کوائف بھی درج کیے۔ ان خطوط کو مولانا نے مرتب کر کے اردوئے معلیٰ میں ایک تعارفی اور وضاحتی نوٹ کے ساتھ شائع کیا۔ آخری حصہ بوجہ ناسازی طبیعت مکمل نہ ہو سکا تھا۔ مولانا نے جہاں تک کے حالات بیان کیے تھے ان کے بعد کے احوال اجمالی لکھ کر اسے سفرنامہ عراق کی شکل دے دی۔[۴۹]

بیگم حسرت نے سب سے پہلا خط یکم فروری ۱۹۳۶ء کو لکھا جس میں وہ اپنی روانگی سے لے کر ٹرین کی اندرونی حالت کو بھی تفصیلاً بیان کرتی ہیں۔ وہ جس جس مقام سے گذرتی رہیں اس کا ذکر اور خصوصاً شہروں اور ملکوں کی تہذیبی، سماجی اور مذہبی زندگی کو یوں پیش کرتی ہیں۔

> دجلہ پر پل بنا ہے۔ اس طرح سے کہ نیچے برابر ناؤ کی طرح لوہے کی کشتیاں پانی میں لنگر اندازہیں۔ انھیں پر لمبا چوڑا پل قائم ہے۔ اربعانے (پل پر) نہیں جاتے۔ موٹریں بے عدد و بے شمار ہیں۔ بازاروں میں ہر طرف دوڑ دھوپ اور آدمیوں کا ہجوم ہر وقت نظر آتا ہے۔ مٹھائیوں کی دکانیں بھی بہت ہیں۔ یہاں خاص و عام، غریب و امیر سب کی ایک پوشش ہے۔ یعنی کوٹ ، پتلون، ٹائی، بوٹ ، عراقی سیاہ ٹوپیاں اور اس پر سے اوور کوٹ بھی۔ عراقی خوب گورے گورے خوب صورت انسان ہیں۔ بچے بھی اسی طرح سفید روئی کے گالے (جیسے ہوتے ہیں) چوڑے چوڑے چہرے تندرست موٹے تازے ہیں۔ ۵۰؎

اس طرح ان کے حج نامے میں لوگوں کی زبان، عادات و اطوار اور کھانے پینے سے لے کر ان کے رسم و رواج کا بھی ذکر ملتا ہے۔ کافی جگہ وہ نہ صرف کھانے کی چیزوں کے بارے میں بلکہ چیزوں کی قیمتیں بھی لکھتی ہیں۔گوشت کی دکانیں اور میوے کی بھی دکانیں بہت زیادہ ہیں۔ انار۵ آنے سیر، سرخ و شیریں بڑے بڑے دانے، شاداب خوب ہیں۔ مولی، گاجر، میٹھے نیبو، کھٹے نیبو، کیلا غرض کہ کافی چیزیں ہیں۔ ۵۱؎

مصنفہ سفرنامے میں اپنے سفری حالات و مشاہدات بھی تفصیل سے لکھتی ہیں کہ جہاز بیچ سمندر لنگر انداز ہوا اور بڑی بڑی دس پانچ کشتیوں میں مال آیا۔ انار کے بنڈل بہت آئے۔ (سوا آنہ) کا ایک انار شیرین انہوں نے بھی لیا۔ سنترے ایک آنے کے تین۔ مرغیاں انڈے وغیرہ بھی آئے۔ یہاں سے بکس انھیں کشتیوں میں اتارے گئے۔ دو لکڑی کے بڑے بڑے بکس جن میں پوری پوری موٹریں بند تھیں، وہ بھی جہاز کے نیچے کے حصہ سے زنجیروں میں باندھ کر نکالے گئے اور جس طرح تم نے بھی دیکھا ہو گا کہ سامان لاد لاد کے مشین کے ذریعہ اٹھا کر نیچے

کشتیوں میں ڈال دیتے ہیں۔ اسی طرح ایک ایک بکس ایک ایک کشتی پر لادا گیا۔ [۵۲]

بیگم حسرت نے بہت سی ایسی معلومات فراہم کی ہیں جس میں خواتین کی دلچسپی زیادہ ہو۔ اس میں نسوانیت کا بھرپور اظہار ہوتا ہے۔ وہ ہر چیز کا بھاؤ اور چھوٹی سے چھوٹی چیز کے بارے میں بتاتی ہیں۔

> ہوٹل بھی جگہ جگہ بہت ہیں۔ان میں کھانا ہر قسم کا اور سستا ملتا ہے۔ دودھ بھی ۲ سیر پرسوں منگوایا تھا، خوب گرم اچھا تھا۔ گوشت گائے کا بھی بہت سستا ہے۔ بھینسیں بھی ہیں، ملائی وغیرہ اسی (کے دودھ) کی بنتی ہے۔ دنبے کا گوشت اور بکری کا بھی، آج کل گراں ہے۔ ۸ آنے سیر چربی بھی بازاروں میں بکثرت (ملتی)۔ پنیر اور کھویا بھی ملتا ہے۔ [۵۳]

مصنفہ نے سفرنامے میں خاص طور پر ان چیزوں کاذکر کیا ہے جو اس مقدس مقامات کے سفر میں ضروری ہوتی ہیں اور لوگ اس سے ناواقف ہوتے ہیں۔ لوگوں کی رہنمائی کے لیے مصنفہ نے ایک ایک کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ لوگ اپنا اپنا کھانا انگیٹھیوں میں پکاتے ہیں۔ ہم لوگوں نے بھی کل صبح کو دال ارہر ، چاول اور روٹی پکائی۔ شام کو دال،پچ، میل چاول اور آج صبح دال مسور، چاول ، روٹی اور آلو کا بھرتا پکایا گیا۔ میری انگیٹھی خوشرنگ کی انگیٹھی اور پتیلیاں وغیرہ استعمال میں ہیں۔ کراچی سے آٹا، گھی، دالیں ، مسالے، چائے ، شکر وغیرہ آٹھ روپے کا منگوایا گیا۔ [۵۴]اس سفرنامے کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں کہ

> بیگم حسرت اگرچہ مشرقی وضعداری کی مثال تھیں تاہم ان کے آزادہ خیالی کا پرتو بھی موجود ہے۔ انھوں نے پسماندہ ہندوستان سے باہر نکل کر جب عراق کی نسبتاً ترقی یافتہ شہریت دیکھی تو انگشت بدنداں ہو جانے کی بجائے اس کی تعریف کی۔ ان کا سفرنامہ اس تحسین کا متوازن اور ہموار بیانیہ ہے۔ اس سفرنامے کی صداقت اس کا حسن اور اس کی سادگی اس کا زیور ہے۔ [۵۵]

بیگم صاحبہ خواتین کے حقوق کے لیے بھی سرگرم رہیں۔ وہ جس جگہ بھی گئیں انھوں نے عورتوں کی سماجی و ثقافتی زندگی کا بغور مشاہدہ کیا اور اس حج نامہ میں عراق کی عورتوں کے لباس کا نہ صرف حال بیان کیا ہے بلکہ مغربی تقلید کی روش پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ عراق میں مسلمان خواتین پردے کی پابند نہیں رہیں۔ ایک جگہ وہ عورتوں کےلباس کے متعلق لکھتی ہیں۔

> مسلمان اور غیر مسلم عورتوں میں لباس کا فرق صرف اس قدر ہے کہ مسلمان لڑکیاں برہنہ سر ٹیڑھی مانگ نکالے، فراک، گون، موزے پہنے، پنڈلیاں کھلی نظر آتی ہیں۔ یہودی و نصرانی عورتیں بھی بالکل اسی طرح رہتی ہیں مگر وہ اپنے سروں پر چٹائی یا مخمل کی رکابی نما چپٹی سی ٹوپی آدھے سر میں پہنے رہتی ہیں۔[۵۶]

اس سفرنامہ میں انھوں نے کربلائے معلیٰ کی طرزِ معاشرت ، سفر کی مشکلات و مسائل اور موسموں کے علاوہ مقاماتِ مقدسہ کی عمارات کا نقشہ بھی کھینچا ہے کہ ہر وقت یہاں سامنے حضرت غوث پاک کا گنبد نیلے رنگ کا نظر آتا ہے۔ اس پر پچی کاری ، پتھروں کی رنگ برنگی پھول پتیاں بنی ہیں۔ مسجد سے ملا ہوا بہت بڑا ہال ہے۔ اس کے اندر لکڑی کے منقش دروازے لگے ہیں جس میں قفل اندر اور باہر پیتل کے پڑے رہتے ہیں۔[۵۷]

مصنفہ نے اپنے سفر کے حالات خطوط کی شکل میں پیش کیے ہیں جس میں سفرِ حج اور عراق کی مقدس زیارت گاہوں کا احوال ملتا ہے۔ انھوں نے سادہ بیانیے میں سفر کے مشاہدات و واقعات کا ذکر کیا ہے جس میں ان ممالک کی تہذیبی و ثقافتی اور سماجی زندگی کی ایک جھلک بھی ملتی ہے۔ یہ سفرنامہ دیارِ مقدسہ کے اہم مقامات کی یادگار ہے۔

۲۔ دیارِ مغرب کے سفرنامے:

سولھویں صدی عیسوی کے آخر میں یورپی سیاحوں نے مشرقِ وسطیٰ اور ہندوستان کے سفر کیے تاکہ وہ ان ممالک

اور ان کے باشندوں کے بارے میں واقفیت حاصل کر سکیں اور اپنے مقاصد میں کامیاب ہو سکیں۔ انیسویں صدی میں ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط اسی سفر کا شاخسانہ ہے۔ ہندوستان میں برطانوی تسلط کے بعد یہاں کے سماجی، اقتصادی، سیاسی اور ثقافتی نظام میں کئی تبدیلیاں ہوئیں۔ لوگوں میں تعلیم کی طرف رجحان بڑھ گیا ۔ اس سلسلے میں خاص طور پر سرسید احمد خان کی تعلیمی کاوشوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے ساتھ ساتھ خواتین کا بھی تعلیم کی طرف رجحان پیدا ہوا اور طبقہ اشرافیہ کی خواتین نے ان مواقع سے خود بھی فائدے اٹھایا اور تعلیمِ نسواں کے لیے بھی کوششیں کیں۔ ان تمام تبدیلیوں کے اثرات اُردو ادب پر بھی پڑے کیونکہ ایک فاتح اور ترقی یافتہ قوم کے عادات و اطوار اور آدابِ زندگی میں مفتوح قوم کی دلچسپی ہوتی ہے۔ تعلیم کی وجہ سے معاشرے میں بیداری آئی اور خواتین کو اپنے محدود دائرے سے نکل کر ایک کھلی فضا میں اپنی صلاحیتوں کو منوانے کا موقع ملا اور ساتھ ہی گھر کی چار دیواری سے باہر نکل کر نہ صرف اندرونِ ملک بلکہ بیرونِ ملک سیاحت کا بھی موقع ملا۔ انھوں نے اپنے سفر کے حالات و واقعات، مشاہدات اور جذبات میں دوسروں کو بھی شریک کرنے کے لیے سفرنامے تحریر کیے۔ جن میں مذہبی سفرناموں کے علاوہ یورپ کے سفرنامے بھی شامل ہیں۔اس دور میں لکھے گئے خواتین کے سفرناموں میں درج ذیل یورپی ممالک کے احوال پر مشتمل ہیں۔

۱۔ سیرِ یورپ	نازلی رفیعہ سلطان	۱۹۰۸
۲۔ سیاحت سلطانی	شاہ بانو بیگم	۱۹۱۵ء
۳۔ زمانۂ تحصیل	عطیہ فیضی	۱۹۲۲ء
۴۔ سفرنامہ یورپ	بیگم ہمایوں مرزا	۱۹۲۶ء

۱۔۲۔سیرِ یورپ نازلی رفیعہ سلطان

خواتین کے سفرناموں میں ہزہائی نس نازلی رفیعہ سلطان کا سفرنامہ سیر یورپ کسی مسلمان خاتون کا

یورپ کی سیاحت کا اولین سفرنامہ ہے۔ یہ ۱۹۰۸ء میں کتابی صورت میں یونین سٹیم پریس لاہور سے شائع ہوا۔ یہ سفرنامہ ان خطوط پر مشتمل ہے جو نازلی سلطان نے یورپ کی سیر کے دوران اپنی بہن زہرا بیگم فیضی کو لکھے اور انھوں نے ان خطوط کی مدد سے اس سفرنامے کو ترتیب دیا اور شائع کروایا۔یہ سفرنامہ کتابی صورت میں شائع ہونے سے پہلے سلسلے واررسالہ عصمت میں شائع ہوتا رہا ہے اور لوگوں نے اسے خوب سراہا ہے۔ ان خطوط کو اسی ترتیب سے اس سفرنامے میں پیش کیا گیا ہے جن تاریخوں سے وہ لکھے گئے تھے۔ پہلا خط ۲۱ اپریل ۱۹۰۸ء کو اور آخری ۸ اکتوبر ۱۹۰۸ء کو لکھا گیا ہے۔ اس سفرنامے کے بارے میں مصنفہ خود سفرنامے کی تمہید میں لکھتی ہیں کہ اصل میں یہ وہ خطوط ہیں کہ جو انہوں نے اپنے بزرگوں کے نام سیرِ یورپ کے حالات لکھے ہیں۔[۵۸] سیرِ یورپ کی تمہید میں مصنفہ نے مختصراً سفرنامے کے متعلق بڑی مفید باتیں کی ہیں جس سے اُن کا مقصدِ سفر بھی پتہ چلتا ہے۔ وہ صرف سیاحت کی غرض سے نہیں گئیں بلکہ برصغیر کی خواتین کے لیے ایک لائحہ عمل لینے گئی تھیں اور انھوں نے بار بار اپنے لفظوں کے ذریعے انھیں جھنجوڑنے کی کوشش کی ہے۔اس سفر کو اختیار کرنے کا مقصد یورپ کی سیاحت تھا اور یہ سفر تقریباً چھ ماہ کے عرصے پر مشتمل تھا۔ بیگم نازلی کے ہمراہ ان کے شوہر نواب سرسیّدی احمد خان بہادر جی۔سی۔آئی۔ای۔، علی اصغر بیگ فیضی ، عطیہ فیضی، سردار سیّدی حسن، سیّدی سعید اور ڈاکٹر ہاشم لکھانی تھے۔ ان کے علاوہ ایک ملازم اور ملازمہ بھی تھی۔

انھوں نے یہ خطوط ہندوستانی خواتین اور مردوں کے پڑھنے کی غرض سے چھپوائے تھے تاکہ وہ ان کو پڑھ کر یورپ کی سیاسی و ثقافتی، سماجی و معاشرتی زندگی سے آشنا ہو سکیں اور اپنے طرزِ عمل میں تبدیلی لائیں ۔ بیگم نازلی نے اس سفرنامے میں جگہ جگہ یورپ کے سماج کی جھلکیاں پیش کی ہیں۔

> افسوس کہ گھوڑوں کی حالت بہ نسبت لنـدن کے بہت
> ہی حقیر ہے۔ یہاں لوگوں کو کتوں پـر نہایت وہ پیـارا

> ہے مگر بچوں اور گھوڑوں پر کم ہے۔ عجیب بات ہے کہ اس کا نظام بہتر نہیں جو گھوڑوں کی زندگی صرف ۲ سے ۸ سال کی ہوتی ہے۔ بعد میں کاٹ کے کھایا جاتا ہے کیوں کہ زیادہ کام کرنے کی مجال نہیں۔ تقریباً ۲۴ گھنٹے گھوڑے کام کرتے ہوں گے ۔ نہ انسان سوتے ہیں نہ گھوڑے چین پاتے ہیں۔ بہت سی دکانیں سویرے سات بجے بند ہو کر نو بجے کھلتی ہیں۔ پیرس بالکل کھوکھلا شہر ہے۔"[۵۹]

بیگم نازلی رفیعہ مختلف رسالوں کی مستقبل کی لکھاری تھیں اور انھوں نے مختلف موضوعات پر متعدد مضامین

تحریر کیے۔ ان کا شمار بیسویں صدی کی تعلیم یافتہ باشعور ادبی خواتین میں ہوتا ہے۔ان کا یہ سفرنامہ ہمیں بیسویں صدی کے انگلستان کی تہذیبی، سماجی، تمدنی ترقی، علوم زراعت، فنون لطیفہ اور ملکی انتظامی امور سے واقفیت بہم پہنچاتا ہے۔ انھوں نے لوگوں کی دل چسپی کے لیے مختلف مقامات کی تصاویر بھی شامل کر دی ہیں۔

اس سفرنامہ یورپ کو روزنامچے کی تکنیک میں لکھا ہے جس میں مصنفہ نے تمام واقعات کو تاریخی ترتیب سے بیان کیا ہے۔ سفرنامہ کے آدھے سے زیادہ حصّہ میں بحری سفر کا احوال درج ہے اور بحری جہاز کے اندر کی زندگی کے حالات و واقعات پر تفصیلاً روشنی ڈالی ہے۔جہاز جب روانہ ہوا تو بہت سے لوگوں سے ان کی سلام دعا ہوئی۔ وہ وہاں کی مصروفیات، روزانہ کے معمولات ،تفریح طبع کے سامان اور سمندر کا نظارہ اس طرح سے بیان کرتی ہیں ۔"اوپر نیلگوں آسمان ،نیچے آبی سمندر۔ ہم گویا تنکوں کی طرح بہے رہے ہیں۔ ساحل نظر ہی نہیں آتا۔ بس خدا سے لو لگائے بیٹھے ہیں۔ عدن کا انتظار ہے۔ سمندر چپ چاپ ہے۔ جہاز بے حس و حرکت چلا جا رہا ہے۔"[۶۰] باقی سفرنامہ میں یورپ کے ممالک کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے۔ مصنفہ کی تحریر میں ایک بات کا افسوس نظر آتا ہے کہ ہندوستان یورپ سے بہت پیچھے ہے اور بعض جگہوں پر وہ موازنہ کرتی بھی دکھائی دیتی ہیں مثلاً وہ روسی عورتوں کے بارے میں لکھتی ہیں کہ ان میں بھی ہندی

عورتوں کا سا حجاب ہے۔ لباس اور زیور بہت سلیقے سے پہنتی ہیں۔ گلے میں واجبی سی موتیوں کی لڑی بھی ہوتی ہے۔ [۶۱]

اس سفرنامے کی ایک خوبی تو یہ ہے کہ یہ ہندوستان کی سب سے پہلی خاتون کا سفرنامہ ہے جس نے یورپ کا سفراختیار کیااور جو تعلیم یافتہ اور طبقہ اشرافیہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ دوسری یہ کہ مشاہدات و تجربات پر نسوانیت پوری طرح غالب ہے۔ مثال کے طور پر وہ خواتین کے لباس اور زیورات پر تفصیلی بات کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ جہاز میں بچوں کے رونے پر غور کرنا اور بچوں کی تربیت کو سراہنا، کھانوں کی تعداد، ذائقے اور تراکیب بھی بیان کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں کہ نازلی رفعیہ سلطان کا مشاہدہ نسوانی دلچسپیوں کے زاویوں کو گرفت میں لیتا ہے۔ا ور وہ اشیاء اور مظاہر کو جمالیاتی انداز میں دیکھتی ہیں۔ [۶۲]

سیر یورپ میں مصنفہ نے یورپ کے باشندوں کے ان اوصاف کو پیش کیا جن کی بدولت انھوں نے ترقی کی ہے۔ بڑے بڑے ملکوں کو فتح کیا اور خوب دولت کمائی ہے وہاں کے لوگ بہت محنت کش ہیں اور یہی ان کی کامیابی کا راز ہے۔ انھوں نے لندن کے جگہ جگہ ہوٹلوں، شفاخانوں، تھیٹروں، گرجا گھروں، پارکوں کو تفصیل سے پیش کیا

ہے۔ایک جگہ وہ ہوٹل کی تعریف ان الفاظ میں کرتی ہیں۔

> اپنے کمزور قلم میں وہ روانی کہاں سے لاؤں جو اس کی قدرت کاملہ کا بیان کر سکوں۔ یعنی وہ بیان جو
>
> میرے دل میں ہے جس کا پورا اظہار امر محال ہے۔ اس ہوٹل میں کمرے بہت عمدہ ہیں بالکل نئے ڈھب کے فرنیچر سے سجے ہوئے ہیں اور تمام رائج الوقت راحت سامانیوں کے سامان سے آراستہ ہے۔[۶۳]

انھوں نے یورپ کی سیر کے دوران بہت سی خوبصورت جگہیں دیکھیں۔ راجاؤں، سفیروں، شاہی خاندان سے ملاقاتیں کیں۔ مختلف لوگوں کے ساتھ دعوتوں میں گئے اور ان تمام

مصروفیات کا ذکر بیگم نازلی خطوط کے ذریعے اپنے رشتے داروں تک پہنچاتی رہیں۔ سفرنامے میں مصنفہ نے لندن، پیرس اور ترکی کی عام حالت پر نظر ڈالی ہے اور معمولی سے معمولی واقعے کو بیان کیا۔ لندن کی بہت تعریف کی ہے اور وہاں کی تہذیب و معاشرت کو اپنے سفرنامے میں پیش کیا ہے۔ ان کی نظر جس جس چیز پر پڑتی ہے وہ حیرتوں کو جگاتی ہے اور شروع سے لے کر آخر تک مصنفہ حیرتوں میں گھری نظر آتی ہیں۔ انہوں نے جگہ جگہ یورپ کی معاشرت اور ہندوستان کی معاشرت کا تقابل کیا ہے۔وہ ہندوستان کے لوگوں کو اپنے سفرنامے کے ذریعے وہاں کی ترقیاں دکھا کر بیدار کرنا چاہتی ہیں۔ ایک جگہ وہ لکھتی ہیں:

> اس ٹرین کو پیرس ایکسپریس کہتے ہیں۔ کاؤنٹ سے معلوم ہوا کہ یہ ٹرین سب سے زیادہ تیز چلنے والی ہے۔ اس لیے اس کے چلانے والے کے اعصاب پر اتنا زور پڑتا ہے کہ منزل مقررہ پر پہنچنے تک تین یا چار بدلے جاتے ہیں اور لوگوں کو دور ہو جانے کو اس لیے کہتے ہیں کہ پہلے پہل جب یہ جاری ہوئی تو لوگ بے خیالی سے نزدیک کھڑے رہتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کئی آدمی ہوا کی لپیٹ اور ٹرین کی کشش سے کھچ کر پہیوں کے درمیان گر پڑے اور کٹ گئے۔ یہ سن کر ہمارے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔[۶۴]

نازلی رفیعہ سلطان نے سفرنامے میں انگریزی معاشرت کو اس انداز سے پیش کیا ہے جس سے اہلِ ہندوستان کو فائدہ ہو اور وہ بھی اپنی تعلیم، صحت، صنعت و حرفت میں ترقی کریں۔ اس سفرنامے میں فرانس کے شہروں، ٹاوروں، عمارتوں اور گورنمنٹ کے حالات بھی بیان کیے ہیں۔ اس کے ساتھ انگلستان کی عظمت اور وہاں کے باشندوں اور تہذیب کی عکاسی بھی کی ہے۔یہ سفرنامہ ایک تعلیم یافتہ اور باشعور خاتون کے ان خیالات کو واضح کرتا ہے جو وہ یورپ اور وہاں کی تہذیب و معاشرت اور تمدن کے بارے میں رکھتی تھیں۔ انھوں نے بڑے دلچسپ پیرائے میں تاریخ وار انگریزوں کے حالات قلم بند کیے اور ہندوستان روانہ کرتی رہیں تاکہ ہمارے لوگ اس سے واقفیت حاصل کر سکیں۔

نوآبادیاتی عہد میں ہر ہندوستانی ایک قسم کی احساس کمتری کا شکار ہو گیا تھا کیوں کہ ایک طرف جب حکومت ہاتھوں سے جاتی رہی جس نے سب کو معاشی، تہذیبی اور سماجی طور پر کنگال کر دیا تھا۔ دوسری طرف نئی تعلیم، سائنسی ایجادات اور نئی تہذیب نے تمام شعبہ ہائے زندگی کو متاثر کیا تھا۔ ان میں یورپ کا سفر کرنے والوں کے پیشِ نظر بنیادی مقصد اہلِ ہندوستان کو یورپ کی انقلابی تبدیلیوں سے روشناس کرانا تھا۔ سیروسیاحت ثانوی مقصد تھا۔ اس لیے عام طور پر ان سفرناموں میں مغربی تعلیم کی اہمیت اور ان کے طریقہ تعلیم کو خصوصیت سے پیش کیا گیا ہے۔ جیسے ایک جگہ لکھتی ہیں کہ

> کیمرہ کے عجائب خانہ میں گئے جس کا بیان بہت ہی پر حظ ہے۔ ایک پروفیسر صاحب نے جو مختلف علوم میں ماہر تھے جنھوں نے اپنی تمام دولت اور زندگی اس مقصد کے حاصل کرنے میں صرف کر دی کہ علومِ شرقیہ کو حاصل کر لیں اور اسی بنا پر اور غرض سے یہ نمائش خانہ بنایا ہے۔ اولاً انھوں نے یہ کام کیا ہے کہ مشرقی ملکوں میں برسوں سیر و سیاحت کی پرانی کتابوں کے نمونے بہم پہنچائے۔(۶۵)

اور لائبریری کے بارے میں وہ لکھتی ہیں کہ

> یہ کمرہ کیسا تھا اور کتابوں سے اوپر نیچے تک بالکل بھرپور ہے یہاں سے منظر بھی نہایت عمدہ دکھائی دیتا ہے۔ وہاں سے کتب خانہ میں لے گئے ، میں کس طرح بیان کروں کہ لارڈوں کے لیے کتب خانہ تھا۔اس طرح بہت سی غلام گردشوں اور گزرگاہوں سے ہوتے ہوئے ہوس آف کامنز کی طرف گئے۔یہاں کا کتب خانہ بھی بہت بڑا ہے۔ مگر امراء کے کتب خانہ کی طرح عالی شان نہیں۔ گو کہ واقعی کام تو یہی لوگ کرتے ہیں۔اب اس حد تک پہنچے ۔(۶۶)

بعض سیاحوں کے سفرنامے مغربی تعلیم وتہذیب ، معیشت، معاشرت،کے حوالے سے بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں کہ ان میں یورپی ممالک کے طریقہ تعلیم اور تہذیب و تمدن کو نمایاں طور پر پیش کیا گیا ہے۔ جیسے سفرنامہ یورپ، دنیا عورت کی نظر میں، زمانۂ تحصیل میں نہ صرف مغربی نظامِ

تعلیم کو بیان کیا ہے بلکہ ہندوستانی تعلیم و تہذیب اور مغربی تعلیم کا مقابلہ بھی کیا گیا ہے۔اس سے محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت ملک کا تعلیم یافتہ اور باصلاحیت طبقہ تعلیم پر زیادہ زور دے رہا تھا۔ سفرنامے کا بیانیہ سادہ اور عام بول چال کا سا انداز لیے ہوئے ہے کیوں کہ یہ سفرنامہ خطوط پر مشتمل ہے اور یہ خطوط کوئی ادبی خطوط نہیں ہیں بلکہ عام خطوط ہیں جو مصنفہ نے اپنے عزیز و اقارب کو دورانِ سفر تحریر کیے تھے۔ اس لیے زبان سادہ ہے۔ کہیں بھی زبان میں تصنع، بناوٹ اور افسانوی انداز نہیں

بلکہ حقیقت پر مبنی ہے۔ اس لیے یہ سفرنامہ بے حداہم ہیں جو اس عہد کے لوگوں کی صحیح تصویر پیش کرتے ہیں۔

۲۔۲سیاحت سلطانیاز شاہ بانو (میمونہ سلطان)

سیاحت سلطانی بیگم میمونہ سلطان المعروف بہ شاہ بانو کا سفرنامہ ہے۔ شاہ بانو ریاست بھوپال کی نواب سلطان جہاں بیگم کے سب سے چھوٹے بیٹے نواب حمید اللہ کی بیوی تھیں۔ انھوں نے بتیس (۳۲) اشخاص کے ہمراہ ۸اپریل ۱۹۱۱ء کو اپنے سفر کا آغاز کیا اور تقریباً سات ماہ کی سیاحت کے بعد یہ قافلہ وطن واپس پہنچا۔ مصنفہ نے یہ سفر اپنے سسرالی عزیز نواب کرنل محمد عبید اللہ کے علاج کے سلسلہ میں اختیار کیا تھا۔ اس سفرنامے میں زیادہ توجہ علاج اور بکھنگم پیلس میں ملاقاتوں، دعوتوں پر رہی ہے مگر پھر بھی اس سفرنامے میں بیسویں صدی کے اوائل کا یورپ دکھائی دیتا ہے۔ یہ سفرنامہ ۱۹۱۵ء میں سیاحت سلطانی کے نام سے مطبع مفید عام آگرہ سے شائع ہوا۔ یہ سفرنامہ روزنامچہ کی ہیئت میں لکھا گیا ہے۔ بیگم شاہ بانو نے دورانِ سفر اپنے مشاہدات و واقعات کو تاریخ وار ڈائری میں لکھا اور اختتام سفر پر اسے نواب سلطان جہاں بیگم کی رہنمائی میں ترتیب دے کر کتابی صورت میں شائع کروایا۔مصنفہ اس سفرنامے کو تحریر کرنے کے حوالے سے نواب سلطان جہاں کی کوششوں کے بارے میں سیاحت سلطانی کے ہدیہ تشکر میں لکھتی ہیں۔

> جن چیزوں کو حضور ممدوحہ نے ملاحظہ کیا جہاں جہاں تشریف لے گئیں جو نئی نئی باتیں معلوم ہوئیں اور ان سب کے متعلق کامل یادداشتیں لکھوا دیں اور ان یادداشتوں کو لکھواتے ہوئے ہر ایک بات میرے ذہن نشین بھی کر دی۔[۶۷]

یہ سفرنامہ دو حصّوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصّے میں انھوں نے اپنے سفرنامے کا آغاز شکریہ ،سفر کرنے کا مقصد، تیاری سفر، وداعی جلسے، روانگی، سفرنامہ بھوپال سے بمبئی تک کا راستہ، جہاز کی حالت، ایک بچے کی موت، عدن میں داخلے، بحرالاحمر کا موسم، نہر سویز، پورٹ سعید، پیرس، لندن کے مقامات کا بیان ہے۔ اور دوسرے حصّے میں لندن سے روانگی، ترکی کے حالات و مقامات اور واپسی سفر کی روداد بیان کی ہے۔

اس سفرنامے کے زیادہ تر واقعات نواب سلطان جہاں بیگم نے فراہم کیے تھے کیونکہ بہت سی جگہوں پر بیگم شاہ بانو بوجہ پردہ ان کے ہمراہ نہیں جاتی تھیں اور وہ تمام معلومات بیگم نواب انھیں لکھواتی تھیں۔ اس طرح یہ سفرنامہ دیدہ و شنیدہ معلومات پر مبنی ہے۔کیوں کہ مصنفہ پیرس کی سیر اس لیےزیادہ نہ کر سکی کہ وہاں یہ عام تھا کہ ذرا کوئی مشہور شخص آئے جس سے لوگوں کو ذراسی بھی دلچسپی ہو تو وہ فوراً اس کی تصویریں لے کر اخبارات میں چھپوا دیتے تھے۔ ۶۸۔

اس سفرنامے میں مشاہدات و تجربات کے ساتھ ساتھ یورپی ممالک کی تہذیب و معاشرت اور خاص کر سلطنت برطانیہ کے شاہی خاندان کے متعلق بھی معلومات ملتی ہیں۔ اس سفرنامے کے بارے میں ڈاکٹر فرحت جہاں لکھتی ہیں:

> اس سفرنامے کی زبان قدیم اور سادہ ہے۔ لیکن اسلوب دلکش ہے۔ کہیں کہیں بہت سطحی باتیں ان کی زبان سے نکل گئی ہیں۔ بہت سی چیزوں کے بارے میں انھوں نے جس حیرت کا اظہار کیا ہے۔ کہ قاری خود حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ کہ ایک شاہی خاندان سے وابستہ ہونے کے باوجود ان کو زندگی کے ان لوازمات کے بارے میں علم نہیں تھا۔[۶۹]

سفرنامہ میں مصنفہ نے اپنی کم علمی کا بھی سچائی سے اقرار کیا ہے اور جن جن ذرائع سے معلوما ت حاصل کیں اس کے متعلق بھی لکھا ہے کہ مصنفہ نے نواب سلطان جہاں سے یورپ کے بارے میں اپنی معلومات میں کمی کا ذکر کیا تو انہوں نے اس کمی کو دور کرنے اور ہندوستانی عورتوں کو ایسے دل چسپ حالات سے روشناس کرانے کے لیے مصنفہ کو پیسہ اخبار کے چند نمبردیے تاکہ وہ ان سے ضروری حالات کا اقتباس کر کے اس سفرنامہ میں درج کر دیں۔[۷۰]

سفرنامہ میں یورپ کی تہذیبی و سماجی زندگی کے ساتھ ساتھ ہندوستانیوں کا ذکر بھی کرتی ہیں۔ یورپ کے ملازموں کے سلیقہ اور صفائی کا موازنہ ہندوستانی خادموں سے یوں کرتی ہیں:

> اول تو ایسے خادم ملتے ہی نہیں جو سلیقہ عقل اور صفائی رکھتے ہوں اور آقا کی مرضی کے مطابق کام کریں۔ اگرمل بھی گئے یا محنت کر کے اور مشکلیں اٹھا کر کسی کو اپنی مرضی کے مطابق بنائیں بھی تو ایسے خدام کی کم یابی کی وجہ سے ان کا دماغ بگڑ جاتا ہے اور ایک عجیب قسم کا غرور پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم جہاں کہیں جائیں گے ہماری قدر ہو گی۔ ان کا یہ خیال پوری طرح اطاعت و فرمان برداری نہیں کرنے دیتا۔ یورپ کے خدام میں شائستگی وصفائی کے ساتھ اطاعت و فرمان برداری نہایت قابل قدر صفت ہے۔[۷۱]

سیاحت سلطانی میں مصنفہ نے یورپ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے وہاں کے طرزِ عمل، عمارات، طریقہ ملاقات، وہاں کے باشندوں کا رہن سہن، اُن کے عادات و اطوار اور مذہبی رسوم غرضیکہ ساری تفصیلات اس سفرنامہ میں قلم بند کر دی ہے۔ اس سفرنامہ کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید یوں لکھتے ہیں کہ وہ سیاحت سلطانی اگرچہ سفر کی تیاری، سامان سفر کی فراہمی، روانگی اور دوران سفر واقعات وغیرہ کو اہمیت دی گئی ہے اور انھیں روزنامچہ کے انداز میں قلم بند کیا گیا ہے۔[۷۲]

ان لوگوں نے لندن کے مدارس، شفاخانے، شاہی باغات اور قصرِ بکنھگم میں تاج پوشی کی رسم میں بھی شرکت کی مگر ہر جگہ ہرہائی نس نواب صاحبہ نے پردے کا خصوصی خیال رکھا۔ ان کے پردے کے بارے میں محمد امین لکھتے ہیں کہ ہرہائی نس کا سن شریف اُس وقت ۵۴ سال کا تھا۔ اس عمر میں یورپ کی سیاحت کے لیے روانہ ہونا اور پھر وہ بھی مذہب وپردے کی کامل پابندی کے ساتھ ایک عجیب حیرت ناک امر ہے۔ [۷۳]

مصنفہ نے پیرس کے بازاروں اور سڑکوں کا ذکر بھی بڑے ستائشی انداز میں کیا ہے۔ وہ جہاں کہیں بھی گئیں ہیں انھوں نے ہر چیز کا مشاہدہ گہرائی سے کیا ہے اور ایک جگہ وہ یوں رقم طراز ہیں:

> عموماً پیرس کے بازار نہایت خوش نما ہیں۔ سڑکیں چوڑی ہیں اورصاف دکانیں اپنے سامانوں سے جگمگاتی ہیں۔ دکانوں پر مضبوط شیشوں کے کواڑ لگے ہوئے ہیں تاکہ کوئی چیز نہ جاتی رہے اور روشنی میں سارا سامان بھی نظر آئے۔ [۷۴]

سفرنامہ میں لندن کے شہروں ، عمارتوں اور گورنمنٹ کے حالات بھی بیان کیے ہیں۔انگلستان کی عظمت اور وہاں کے باشندوں اور تہذیب کا حال بیان کیا ہے۔ دربار شاہی کی کیفیت، وہاں کی تعلیمی حالت کا ہندوستانی تعلیم سے

مقابلہ کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انگریزی سماج کی شائستگی، صفائی اور رکھ رکھاؤ کو بھی سراہا ہے۔ وہاں کی تہذیب سے ہندوستانی تہذیب کا موازنہ کیا ہے۔ ایک جگہ وہ برطانوی شاہی دربار کا نقشہ یوں بیان کرتی ہیں:

> جابجا شاہی عہدہ دار اور محل کے افسر زرق برق لباس پہنے اپنی اپنی خدمت پر معین تھے اور اپنے حد سے دوسرے کی حد تک پونچا دیتے تھے۔ تمام لیڈیاں جو لیوی میں شریک ہونے والی تھیں۔ عمدہ عمدہ لباس سے آراستہ اور بیش قیمت زیورات سے مزین محل میں اِدھر اودھر پھر رہی تھیں۔ محل برقی روشنی جگمگا رہا تھا چھتوں پر سنہری کام تھا جو بجلی کی

> روشنی میں شعاع نور بنا ہوا تھا۔ دیواروں پر تاریخی تصویریں سلطنت برطانیہ کی عظمت ظاہر کر رہی تھیں۔ نفیس قالین کا مکلف فرش بچھا ہوا تھا۔ سنگ رخام اور سنگ مرمر کے دوہرے ستون جن کے سروں پر طلائی ملمع تھا روشنی میں عجب بہار دکھا رہے تھے۔[۷۵]

سیاحت سلطانی ایک اہم سفرنامہ ہے۔ یہ ایک تعلیم یافتہ ہندوستانی خاتون کے ان خیالات کو واضح کرتا ہے جو وہ یورپ اور وہاں کی تہذیب و معاشرت کے بارے میں رکھتیں تھیں ۔ انھوں نے یورپی سماج، تمدن، ثقافت اور نظام حکومت کی عکاسی اس ڈھنگ سے کی ہے کہ اہلِ ہندوستان اس سے واقفیت حاصل کر سکیں۔ اس سفرنامہ میں آغاز سفر ہندوستان سے یورپی ممالک کے حالات و واقعات ملتے ہیں۔ بیگم شاہ بانو نے جگہ جگہ اپنے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں یورپ اور ہندوستان کی حالت کا مقابلہ بھی کیا ہے۔ اس سفرنامہ کا شمار بیسویں صدی کے اہم سفرناموں میں ہوتا ہے۔

۳۔۲۔زمانۂ تحصیل از عطیہ فیضی

زمانۂ تحصیل بیگم عطیہ فیضی رحمین کی سیر و سفر کی داستان ہے۔ انھوں نے یہ سفر یکم ستمبر ۱۹۰۶ء میں شروع کیا اور ۲۷ ستمبر ۱۹۰۷ء میں ختم ہوا۔ ان کا یہ سفر یورپ ایک سال اور چھبیس یوم میں ختم ہوا۔ یہ سفرنامہ ان خطوط سے مرتب شدہ ہے جو مصنفہ پہلے روز سے ہی اپنے اہلِ خانہ کے نام، تاریخ وار بھیجتی رہی تھیں ۔ ان واقعات و مشاہدات، روزمرہ کی روداد کی تفصیل کو ان کی بہن زہرا بیگم فیضی"تہذیب نسواں" میں شائع کرواتی رہی تھیں۔ عطیہ فیضی کا یہ سفرنامہ روزنامچہ کی شکل میں لکھا گیا ہے اور یہ بہت بعد میں ۱۹۲۱ء میں "مطبع مفید عام آگرہ" نے کتابی صورت میں شائع کیا۔

اس کتابی صورت میں چھپنے والے سفرنامہ زمانۂ تحصیل کا دیباچہ مصنفہ کا تحریر کردہ ہے۔ جس میں انھوں نے اپنے یورپ جانے کا مقصد ، سفرکے دوران لکھے گئے خطوط کو

رسالہ تہذیب نسواں میں شائع کرنے کی وجہ اور پھر بعد میں کتابی صورت میں چھپوانے کے اغراض و مقاصد بیان کیے ہیں۔ وہ روانگی یورپ کے متعلق لکھتی ہیں کہ وہ ۱۹۰۶ء میں گورنمنٹ اسکالرشپ لے کر لندن گئی تھیں۔ ان کے سفر کا مقصد یہ تھا کہ معلمہ بن کر وہاں سے واپس آنا اور اپنی ہم وطن بہنوں کی خدمت کرنا تھا۔[۷۶] اس سفرنامے کا دیباچہ ہی مصنفہ کے سفر کرنے کے مقصد پرروشنی ڈالتا ہے۔ اس عہد میں ہندوستان میں بیدارئ نسواں کی تحریک زوروں پر تھی۔ ہر پڑھا لکھا طبقہ معاشرے میں تعلیم کی کمی کو شدت سے محسوس کر رہا تھا اور اپنی حد تک اس کمی کو دور کرنے میں حصّہ ڈال رہا تھا۔ اس دور کی خواتین بھی اس جدوجہد میں کسی سے پیچھے نہ تھیں۔ انھوں نے ہر پلیٹ فارم سے عورتوں کے حقوق کے لیے آواز بلند کی۔ بیگم عطیہ بھی اس مقصد کو لے کر آگے بڑھیں اور یورپ کی تعلیمی، سماجی و ثقافتی ترقی کے بارے میں معلومات اپنے خطوط کے ذریعے برصغیر کی خواہش کو روانہ کرتی رہی۔

مصنفہ نے یہ سفرنامہ اپنی نانی بیگم شجاع الدین طیب علی کے نام منسوب کیا ہے۔ ایک سو اکیس صفحات پر مشتمل سفرنامے کا زیادہ تر حصّہ تعلیمی اور مجلسی زندگی پر ہونے کے ساتھ یورپ کی تہذیبی و ثقافتی، سماجی و تمدنی اور معاشرتی زندگی کی بھی خوبصورت عکاسی کرتا ہے۔ عطیہ فیضی نے وہاں کے نظامِ زندگی کا قریبی مشاہدہ کیا اور ایک ایک چیز کا گہری نظر سے جائزہ لے کر اہلِ ہندوستان سے اس کا موازنہ تاسف و تحیّر سے کیا ہے۔ وہ ہر صورت میں اپنی خواتین کی ترقی اور خوشحالی کی آرزو مند تھیں۔ اس سفرنامے کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید اظہارِ خیال کرتے ہیں کہ ڈائری کی تکنیک میں لکھا گیا یہ سفرنامہ مشاہدے کو پہلی نظر ہی میں سمیٹ لینے کی کاوش کرتا ہےا ور عطیہ فیضی کے حقیقی اور معصوم تاثر کو سامنے لے کر آتا ہے۔[۷۷]

اس سفرنامے میں ہندوستان کی کئی مشہور شخصیات ، سر عبد القادر شیخ، سید علی بلگرامی، سروجنی داس نائیڈو، ڈاکٹر مختار انصاری، مس کارنیلیا سہراب جی، ڈاکٹر محمد اقبال ، بائی ٹاٹا اور علامہ عبداللہ یوسف علی کے ذکر کے علاوہ

یورپ کے مختلف مقامات کا دلچسپ احوال ملتا ہے۔ یورپ کی مختلف سیرگاہوں، تعلیمی اداروں، تاریخی مقامات، کتب خانوں اور شفا خانوں کی تفصیلات کو بڑی حیرت اور سادگی سے بیان کیا ہے۔ ایک جگہ ریل گاڑی کا ذکر یوں حیرت سے کرتی ہیں۔

> وہ مجھے ایک نئی چیز میں یہاں بھائی صاحب قمر الدین کے ہاں لے گیا جس کو ٹیوب کہتے ہیں اور میں پہلی ہی دفعہ اس میں سوار ہوئی۔ راستے پر سے ایک بڑے نل کے ذریعے چند قدم زمین اتر کر لفٹ یعنی کل کی نشست میں بیٹھنا پڑتا ہے جو دور تک زمین کے اندر جاتی ہے پھر یہاں ریل آتی ہے۔ [۷۸]

اسی طرح سے یورپ کے کتب خانوں کے متعلق لکھتی ہیں کہ جہاں کتب بینی کی جگہ ہے۔ اس کمرے کی زمین موٹے ربڑ کی ہے کہ چلنے میں آواز نہ ہو۔ کمرہ مدّور ہے۔ خاصے ہزار آدمی ایک وقت بیٹھ کر پڑھ سکتے ہیں۔[۷۹] سفرنامہ میں مصنفہ نے انگلستان کی ایک ایک چیز اور معمولی سے معمولی واقعہ کو بھی ستائشی انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ وہاں کی درس گاہوں کا بیان اپنی تہذیبی بہنوں کی معلومات میں اضافہ کے لیے بار بار کرتی ہیں۔ وہ یورپ والوں کی سماجی زندگی سے بھی متعارف کرواتی رہتی ہیں کہ ان کی زندگی بڑی خوشگوار ہوتی ہے۔ ان کے لباس صاف ستھرے اور مکان بھی آرام دہ ہوتے ہیں۔ وہاں تھیٹر، ہوٹل، کلب، شراب خانہ بھی بہت زیادہ پائے جاتے ہیں۔ ان سب کا بیان وہ تفصیلاً کرتی ہیں۔

> یہ اتنا بڑا ہال ہے کہ دس بارہ ہزار آدمی اچھی خاصی طرح بیٹھ کر تماشا دیکھ سکتے ہیں بے حد بڑا ہے۔ وہاں تیس فٹ اونچا ارغنوں رکھا ہوا تھا اور اس کے نیچے اچھا پچی کاری کیا ہوا۔ مشہور گانوں والوں نے ترانہ سازی کی ہ [۸۰]

سفرناموں سے کسی بھی ملک کی تاریخی، سماجی، تجارتی، معاشرتی حالات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے عطیہ فیضی کا زمانۂ تحصیل پڑھیں تو ہمیں لندن، ترکی اور پیرس کے سماج اور ان کی تہذیب سے آشنائی حاصل ہوتی

ہے۔ مصنفہ سکالرشپ پر تعلیم حاصل کرنے انگلستان گئیں تھیں تو اس سفرنامے میں تعلیمی فضا کے علاوہ وہاں کی سماجی اور ثقافتی زندگی کے نمونے بھی جا بجا جلوہ افروز ہیں۔ مثال کے طور پر ایک جگہ وہ لکھتی ہیں:

> جتنا باغ میں نے دیکھا اس سے صاف یہ ظاہر ہو گیا کہ انگلستان میں بھی شاید اور کم ایسے باغ ہوں گے۔ ندی پر کشتیاں ، ہوس بوٹ وغیرہ جن پر رنگ برنگی مہین لباسوں میں ہفت آرائش مزین، نزاکت میں چور عورتیں پھرتی ہوئیں دکھائی دیتی تھیں۔ جابجا پھولوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ باجا بج رہا تھا۔ چائے نوشی کا بازار گرم ہو رہا تھا۔ [۸۱]

اس سفرنامے میں بھی بیسویں صدی کی دوسری خواتین کی طرح یورپ کی ہر ایک چیز کو سراہا گیا ہے۔ اورا س کے مطالعے سے ہم وہاں کی تہذیب ومعاشرت سے آگاہی حاصل کر سکتے ہیں۔

۴۔۲۔سفرنامہ یورپازبیگم صغرا ہمایوں

بیگم صغرا ہمایوں کا یہ سفرنامہ ان کے سفرِ یورپ کے بارے میں ہے۔ ان کا یہ سفر ۲۹ مارچ ۱۹۲۴ء کو حیدرآباد سے پونے بمبئی کے لیے شروع ہوا اور وہاں سے مارسلز، پیرس، لندن، ہالینڈ، جرمنی، سویٹزرلینڈ اور اٹلی سے ہوتے ہوئے ۳۱ ستمبر ۱۹۲۴ء کو حیدرآباد وطن واپس پہنچنے کی روداد پر مشتمل ہے ۔ صغرا ہمایوں کے شوہر کو ڈاکٹر نے دل کا عارضہ بتایا اور علاج کے لیے لندن جانے کے لیے کہا تھا۔ لٰہذا آپ اپنے بھائی، شوہر اور دو ملازمین کے ہمراہ سفر پر روانہ ہوئیں۔یہ سفرنامہ دو حصّوں پر مشتمل ہے۔ اس میں صغرا ہمایوں نے یورپی ممالک کے سفر کے دوران درپیش حالات و واقعات کو بیان کیا ہے۔ وہ مختلف ملکوں کی تہذیب ومعاشرت عمارتوں، پارکوں، تھیٹروں، تعلیمی اداروں ، ہسپتالوں، آب و ہوا، کتب خانوں اور شہروں کی تاریخ بھی ساتھ ساتھ بیان کرتی جاتی ہیں۔

سفرنامہ یورپ ۱۹۲۶ء میں اعظم سٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن سے شائع ہوا۔ یہ سفرنامہ کتابی صورت میں شائع ہونے سے پہلے سلسلہ وار رسالہ تہذیب النسواں میں شائع ہوتا رہا اور ہندوستان کے لوگوں نے اس سفرنامہ کو خوب سراہا۔ اس سلسلہ میں خود بیگم صغرا لکھتی ہیں:

> ہندوستان سے آج ڈاک آئی۔ بہت سے خطوط ملے۔ جناب مولوی ممتاز علی صاحب مینجر تہذیب نسواں کا بھی خط آیا انھوں نے لکھا ہے کہ میں آپ کا شکریہ کسی طرح ادا نہیں کر سکتا۔ آپ نے نہایت عمدہ اوردلچسپ حالات سفر تہذیب کے لیے بھیجے ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ اور مضامین بھی آپ بھجوائیں گی۔ [۸۲]

اس سفرنامہ میں دیگر معلومات کے علاوہ مصنفہ کی مختلف موضوعات پر تقاریر بھی ہیں۔ وہ نہ صرف تعلیم نسواں کے لیے آوازِ بلند کرتی ہیں بلکہ وہ مذہب اسلام کا دفاع بھی کرتی ہیں جیسا کہ وہ سفرنامہ میں جرمنی اور ہندوستانی عورتوں کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ جرمنی کی خواتین مردوں کے شانہ بشانہ مزدوری کرتی ہیں۔ وہ صرف اپنے ملک و قوم کی ترقی اور خوشحالی کے لیے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتی ہیں اور ہم اور ہماری قوم اب تک غلامی میں پڑی ہوئی ہے۔[۸۳]

بیگم صغرا ہمایوں ہندوستان کی خواتین کی تعلیم اور اُن کے حقوق کی جنگ لڑتی رہی ہیں۔ انھوں نے اپنی ہر تحریر میں تعلیم کی افادیت پر زور دیا ہے۔ اس سفرنامہ میں بھی مصنفہ نے اپنے حالاتِ سفر بیان کرنے کے ساتھ جگہ جگہ اپنے ملک کی حالت کا یورپ کے شہروں کی حالت سے موازنہ کیا ہے اور مصنفہ نے اپنی قوم اور ملک کی بھلائی کے نقطۂ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے انگلستان کی تعلیم، وہاں کا طرزِ تمدن، حسنِ معاشرت اور وہاں کی ہر قسم کی ترقیات کے اسباب جاننے کی کوشش بھی کی اور پھر اپنے مضامین کے ذریعے اہلِ ہندوستان کو روشناس کرایا۔

بیگم صغرا کا یہ سفرنامہ بیسویں صدی کے اوائل کا اہم سفرنامہ ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے سفر کے حالات و واقعات اور مشاہدات پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یورپ کی تہذیب، وہاں کے طریقۂ معاش، لوگوں کی عادات و اطوار پر روشنی ڈالی ہے۔ مصنفہ انگریزی تہذیب و معاشرت سے متاثر دکھائی دیتی ہیں اور ان کی یہ خواہش تھی کہ ہندوستانی بھی انگریزی علوم و فنون سیکھیں اور اپنی زندگی کو خوشگوار بنائیں۔ مصنفہ فرانس کے نظامِ تعلیم کے متعلق لکھتی ہیں کہ وہاں فرانس میں ہزاروں ایسے مدرسے ہیں جہاں تعلیم حاصل کرنا لڑکے اور لڑکیوں پر لازمی ہے اور ان سے کوئی فیس نہیں لی جاتی ۔ ان مدرسوں کے تمام خرچے حکومت خود برداشت کرتی ہے۔[۸۴]

صغرا ہمایوں کے اس سفرنامہ یورپ کے بارے میں ڈاکٹر فرحت جہاں لکھتی ہیں:

> انداز سنجیدہ اور زبان سادہ ہے۔ اس سفرنامے میں انھوں نے جن ممالک کا سفر کیا ان کے تہذیبی اور تاریخی پس منظر پر توجہ دی ہے اور اپنے مشاہدات کو پیش کیا ہے۔ انھوں نے وہاں کے کتب خانے دیکھے اور وہاں کی عمارتوں کا مشاہدہ کیا جن کی تفصیلات کتاب میں موجود ہیں۔ انھوں نے قیصرِ جرمنی کے مکان کو دیکھا اور اس کی جزئیات سے قارئین کو آگاہ کر دیا ہے۔ انھوں نے وہاں کے رہن سہن کے طریقے، موسم، پرفضا مقامات اور معاشرتی معاملات و مسائل کو زیادہ دلچسپی سے بیان کیا ہے۔[۸۵]

سفرنامے میں لندن کے مختلف مقامات اور جگہوں کی بڑی تعریف کی گئی ہے اور وضاحت سے تمام معلومات

فراہم کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ ایک جگہ و ہ لکھتی ہیں کہ برٹس میوزیم کا کتب خانہ بہت بڑا ہے۔ یہ دنیا بھر میں مشہور ہے۔ یہاں ہر زبان کی کتابیں موجود ہیں اور فارسی کتابوں کی بھی بہت قدر ہے۔[۸۶]

سفرنامہ یورپ میں مصنفہ نے لندن اور جرمنی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ وہاں کے بازار، مینار، طرزِ عمارت، طریقۂ ملاقات، وہاں کے باشندوں کے رہنے سہنے کا ڈھنگ اور طرز تمدن غرضیکہ ساری تفصیلات سفرنامہ میں قلم بند کر دی ہے۔ مثال کے طور پر ایک جگہ وہ لکھتی ہیں کہ ہر سال مئی کے مہینے میں چار روز تک کشتیوں کی شرطیں ہوا کرتی ہیں۔ انگریز کھیل کود کے بہت شایق ہیں اسکولوں اور کالجوں میں اقسام کے کھیل ٹینس، کرکٹ، ہاکی ، گالف ، فٹ بال وغیرہ کھیلتے ہیں جس سے ورزش ہوتی ہے۔ [۸۷]

اس سفرنامہ کے بارے میں ڈاکٹر مرزا حامد بیگ نے لکھا ہے کہ صغریٰ بیگم حیاِ کا سفرنامہ یورپ جو انتہائی باریک بینی کے ساتھ مشرقی اور مغربی تہذیبوں کا موازنہ کرتا ہوئے خالصتاً نسوانی اپروچ کا حامل ہے۔ [۸۸] صغرا ہمایوں نے اپنے سفرنامہ میں یورپی زندگی کے مختلف گوشوں کو پیش کیا ہے۔ ان کے اس سفرنامہ یورپ سے انگلستان ، فرانس اور جرمنی کے لوگوں کی جیتی جاگتی تصویریں مرتب ہوتی ہیں۔ ایک جگہ مصنفہ یوں لکھتی ہیں:

> یہاں کی ہائیکورٹ کی عمارت بہت عالیشان ہے اور ڈاک خانہ کی عمارت بھی بے نظیر ہے۔ یہاں سے ہم وکٹ پلائس اسکوبر میں آئے۔ یہ عجیب جگہ بنی ہوئی ہے۔ بیچ میں ایک گول بے انتہا بڑا حوض ہے اس میں فوارے چھوٹ رہے ہیں۔ فوارے عجیب طرح سے بنائے گئے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کی مورتیں اور شیر ببر کی مورتیں بنائی ہیں۔ ان مورتوں کے منہ میں سے پانی حوض میں گِر رہا ہے۔[۸۹]

مصنفہ نے اپنے سفرنامہ یورپ میں جہاں یورپی ممالک کے لوگوں کی زندگی کی رنگینی و دل کشی کو پیش کیا ہے وہاں انگریزوں کی بہت زیادہ تعریف بھی کرتی ہیں اور یورپی اقوام کی تعریف و ستائش کے ساتھ ہی ہندوستانی معاشرے کی زبوں حالی انہیں دکھی بھی کرتی ہیں۔ سفرنامہ میں کہیں جگہ دونوں تہذیبوں اور سماج کا موازنہ صرف اس خیال سے کرتی ہیں تاکہ اہل ہند ان ترقی یافتہ

اقوام سے سبق سیکھیں اور اپنی حالت کو سدھاریں۔بیگم صغریٰ کا یہ سفرنامہ تعلیم ہند اور شعور ہند کے مقصدی نقطہ نظر بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

۳۔ اندرونِ ہندوستان کے سفرنامے:

بیسویں صدی میں مذہبی اور یورپی سفرناموں کے علاوہ بہت سے اندرونِ ہند کے سفرنامے بھی تحریر کیے گئے ہیں یعنی کہ وہ سفرنامے جو اندرونِ ملک کی سیروسیاحت پر مشتمل ہیں۔ ان سفرناموں کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان کے ذریعے ہندوستان کی تہذیب و معاشرت، رسم و رواج، مناظرِ فطرت، تاریخی معلومات اور یہاں کی عمارتوں کی تفصیل بھی ملتی ہے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہیں کیونکہ ہر علاقہ اور شہر ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے اور ایک ملک کے باشندے ہونے کے باوجود ہم دوسرے علاقوں کے رسم و رواج، لباس اور کھانے پینے کی اشیاء سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ ایسے سفرنامے ہمیں ایسی بہت سی معلومات دیتے ہیں جن سے ہم ناواقف ہوتے ہیں۔ اندرونِ ہندوستان کے سفرناموں میں زیادہ تر شہروں کی تاریخ، عمارات، بازاروں، چشموں، زراعت، صنعت و حرفت، مزاروں ، درسگاہوں کے بارے میں معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ یہ تمام سفر مختلف مقاصد مثلاً تجارت، تحصیلِ علم، زیارتوں یا سرکاری ضرورتوں کے تحت کیے گئے ہیں۔ ان سفرناموں کا مختصرجائزہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔ ۔

۱۔ سفرنامہ پونہ و مدراس بیگم صغراہمایوں ۱۹۱۸ء

۲۔ روزنامچہ بھوپال، آگرہ و دہلی کے حالات بیگم صغراہمایوں ۱۹۲۰ء

۳۔ رہبر کشمیر بیگم صغراہمایوں ۱۹۳۱ء

۱۔۳۔روزنامچہ بھوپال،آگرہ و دہلی کے حالات از بیگم صغرا ہمایوں

اردو سفرنامے کے اولین دور کی سفرنامہ نگار خواتین میں صغرا ہمایوں کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے اپنے ان سفرناموں میں ایک طرف تو مغربی تہذیب و معاشرت کی تصویر کشی کی ہے اور دوسری طرف مقامی سفرناموں میں برصغیر پاک و ہند کی صورت حال، حقوق نسواں اور بیداریٔ نسواں کے لیے کی گئی جدوجہد کو بیان کیا ہے۔ ایسے ہی ایک سفر کا احوال انھوں نے اپنی تصنیف روزنامچہ بھوپال، آگرہ و دہلی کے حالات میں نہایت دلچسپ اور سبق آموز پیرائے میں بیان کیے ہیں۔و ہ سفرنامہ ابتدائی دور کے سفرناموں میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ بیگم صغرا نے اپنا یہ سفر ایک خاص مقصد کے تحت کیا تھا۔ چونکہ وہ ایک سماجی تحریک کی رکن تھیں اور ان کا اثر سارے ہندوستان کے مسلم گھرانوں تک تھا۔ ان کا یہ سفر ہندوستان کی عورتوں سے رابطے کی ایک صورت تھا۔ بیگم ہمایوں نے اپنا سفر ۲۳ مارچ ۱۹۱۸ء کو شروع کیا تھا اور انھوں نے یہ سفرنامہ روزنامچہ کی صورت میں یکم دسمبر ۱۹۲۰ء میں حیدرآباد دکن سے شائع کیا۔ وہ ٹرین کے ذریعے آل انڈیا لیڈیز کانفرنس میں شرکت کے لیے بھوپال روانہ ہوئیں۔ ان کے اس سفر میں مسز خدیجہ جنگ، مسز سیّد امیر حسن صاحبہ اور بیرسٹر ہمایوں مرزا شامل تھے۔ اگرچہ اس سفر میں بیگم ہمایوں ملیریا کے بخار میں مبتلا تھیں مگر انھوں نے یہ سفر بڑی ہمت و عزم کے ساتھ کیا۔

صغرا ہمایوں مرزا نے بھوپال، آگرے اور دہلی کا یہ سفر بیگم بھوپال کی دعوت پر آل انڈیا لیڈیز کانفرنس میں شرکت کے لیے اختیار کیا۔ اس کے علاوہ وہ مسلم گھرانوں کی عورتوں سے رابطہ بھی کرنا چاہتی تھی تاکہ ان علاقوں میں عورتوں کو منظم کرکے ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کیا جا سکے اور ان شہروں میں انجمن خواتین دکن کی طرز کی ایک انجمن قائم

کرنا بھی ان کا مقصد تھا۔ انھوں نے بھوپال میں عورتوں کے جلسے سے خطاب کیا اور انھیں انجمن خواتین کی غرض و غایت بتانے کے ساتھ ساتھ انھیں اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اب متحد ہو کر اپنے حق کے لیے آواز بلند کریں۔ بیگم صغرا عورتوں کی فلاح و ترقی کے لیے جوش و جذبہ رکھتی تھیں اور مخلوق خدا کو ہر وقت فائدہ پہنچانے کے لیے کوشاں رہتی تھیں۔ اس سفرنامہ میں وہ خدا سے ان الفاظ میں دعاگو ہیں کہ خدا کرے ہمارا بھوپال جانا کار آمد ہو۔ ہماری قوم کو ہم سے فیض پہنچے۔ میں خدا سے ہمیشہ دست بدعا رہتی ہوں کہ مجھ سے مخلوقِ خدا کو فائدہ پہنچے۔[۹۰]

اس سفرنامہ میں انھوں نے تین شہروں کی سیاحت کی اور سفر بھوپال میں مختلف کانفرنسوں کی روداد، نامور خواتین سے مختلف مسائل پر گفتگو، بیگم بھوپال سے ملاقات، بھوپال کے مختلف حالات اور اس کی تاریخی حیثیت کا بیان ملتا ہے۔ سفر آگرہ میں تاج محل کی تاریخی اہمیت، مغل شہنشاہوں کے حالاتِ زندگی، اکبر کے مقبرہ کی تفصیل اور اس کے شاندار عہد حکومت کو بیان کیا ہے، دہلی کے سفر میں حضرت خواجہ سلیم اللہ چشتی، جہانگیر کی ولادت، قطب مینار کی تعمیر، ہمایوں کا مقبرہ، حضرت نظام الدین اولیاء، حالات جامع مسجد، حالات لال قلعہ، مختلف لوگوں کی تقاریر اور دہلی کے تاریخی حالات کی تفصیل ملتی ہے۔ یہ سفرنامہ تاریخی معلومات کے حوالہ سے ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس سفرنامہ میں بیگم ہمایوں مرزا نے بیگم بھوپال سلطان جہاں کی عورتوں کے لیے کی گئی کاوشوں کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ انھوں نے بیگم بھوپال سے ان کے محل میں ملاقات بھی کی اور ان سے ملک کی صورت حال اور خواتین کی حالت زار کے بارے میں کھل کر اظہار خیال کیا۔ وہ بیگم بھوپال کے رکھ رکھاؤ، نرمی، فیاضی اور بھوپال کے قصرِ

شاہی کی تزئین و آرائش سے بہت متاثر ہوئیں۔ سفرنامہ میں بھوپال کے دربار کی منظر کشی پیش کرتی ہیں۔

> سنا جاتا ہے کہ بھوپال میں شاہی ایوانوں میں سب سے بڑا مکان یہی ہے گویا صدر منزل اسم بامسمیٰ ہے۔ بہرحال صدر منزل کے سب کمروں میں دربار ہال بڑا ہے اس پر مستزاد اس کی سجاوٹ اور آراستگی ’’نور علے نور‘‘ تمام سبز سرخ و زرد کا شانی محل کا فرش جس پر کار چوبی کا کام کیا ہوا تھا۔ چاروں طرف سونے چاندی کی کرسیاں رکھی تھیں۔ بیچ میں ایک چوبی تخت تھا جس پر کارچوبی مسند بچھی تھی اس پر ایک بڑی سی گنگا جمنی کام کی زرنگار کرسی صدر نشین کے لیے رکھی گئی تھی۔ غرض اسی مقام کی دلکش سجاوٹ کی وجہ سے وہ مقام چوتھی کی دلہن معلوم ہوتا تھا۔ [۹۱]

اس سفرنامہ میں بہت سی نامور خواتین بیگمات بھوپال، بیگم صاحبہ زنجیرہ، زہرہ فیضی صاحبہ، بیگم سربلند جنگ، مسز خواجہ عبد المجید، فاطمہ آرزو بیگم صاحبہ، مسز سروجنی نائڈو، نواب قیصر دلہن صاحبہ، مسز جمشید، خورشید بیگم صاحبہ، مسز راشد لطیف کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔ بیگم صغرا نے اپنے سفرنامہ میں مستقبل کی (اس وقت کی) پیش گوئی ان الفاظ میں کی ہے:

> مولوی صاحبان میرے خیالات کو دیکھ کر کیا ریمارک کرتے ہیں مگر میں کسی ریمارک سے نہیں ڈرتی۔ کلمہ حق کے کہنے میں مجھے کوئی باک نہیں ہے گو اس وقت نہ سہی مگر ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے کہ میرے خیالات موجودہ کے موافق ہی عمل ہو گا اس وقت گو میں نہ رہوں گی لیکن میرے خیالات اگر صفحہ قرطاس پر رہ گئے تو اس زمانہ والے کلمہ خیر سے مجھے یاد تو کریں گے۔ [۹۲]

بیگم صغرا ایک مہذب اور روشن خیال خاتون تھیں انھوں نے غلط قسم کے عقائد کے خلاف آواز بلند کی۔ وہ اپنے عہد

کہ بعض اہم سماجی اور تہذیبی مسائل سے بخوبی آگاہ تھیں ان میں سے ایک مسئلہ عورتوں کا مروجہ پردہ تھا جو کہ تعلیمی ترقی میں بہت بڑی رکاوٹ تھا۔ وہ اسلامی پردے کی قائل تھیں اور پردے کو ایک مہذب لباس کا نام دیتی تھیں لیکن وہ ہرگز یہ برداشت نہیں کر سکتی تھیں کہ پردے کے نام پر عورتوں کو گھر کی چاردیواری میں قید رکھا جائے۔ چنانچہ مروجہ پردے کے خلاف انھوں نے ایک ریزولیوشن پاس کروائی اور پردے کے متعلق اپنے دلائل کو قرآنی آیات سے پرزور بنا کر پردے کی تاریخی حالت پر بھی روشنی ڈالتی ہیں۔ وہ اپنی تقریر میں کہتی ہیں کہ میں یہ نہیں مانتی کہ یورپی ممالک کی طرح ہندوستانی عورت کو بھی بے پردگی و آزادی مل جائے۔ [۹۳] اسی طرح ایک اور جگہ پردے کے متعلق قرآنی حکم بتاتی ہیں:

> پردے کے متعلق جو حکم قرآنی سے ظاہر ہوتا ہے وہ اسی قدر ہے اور جس کے الفاظ یہ ہیں۔ وقل للمومنت یعفظن ابصارھن و یحفظن جس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان عورتوں سے کہے کہ اپنی آنکھیں بند کریں اور اپنی حفاظت کریں۔ مردوں کے لیے بھی اسی طرح کا حکم ہے۔ قل للمومنین یعفظو من ابصارھم یحفظو یعنی کہ مسلمان مردوں سے کہ اپنی آنکھیں بند کریں اور اپنی حفاظت کریں۔ اس سے ظاہر ہے کہ مرد و زن دونوں کے لیے ایک ہی قسم کا حکم ہے۔ آنکھیں بند رکھنے سے غرض اسی قدر ہے کہ بدنیتی سے نظر غیر محرم عورت نہ ڈالے اور نہ مرد عورت پر ڈالے۔[۹۴]

بیگم صغرا ہمایوں تعلیم نسواں کی پُرزور حامی خاتون تھیں۔ انھوں نے ساری زندگی ایسی جدوجہد میں بسر کی کہ خواتین اپنے حقوق کو جانتے ہوئے زندگی کے ہر میدان میں آگے بڑھیں۔ اس کے لیے انھوں نے علمی اور قلمی جہاد کیا۔ سفرنامہ بھوپال میں بھی وہ خواتین کی تعلیم کے مسئلہ کو

اجاگر کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ گورنمنٹ کو لازم ہے جس طرح لڑکوں کی تعلیم کی جانب متوجہ ہے۔ لڑکوں کی تعلیم کا بھی خیال کرے اور ہر بڑے شہر میں مدرسہ نسواں کھولے اور لڑکیوں کی تعلیم کے لیے ایک یونیورسٹی جدا قائم کی جائے۔
[۹۵]

اسی طرح ایک اور ریزولیوشن میں مسز سر بلند جنگ نے استدعا کی کہ لیڈی ڈاکٹروں کی تعداد میں اضافہ کرنے کے لیے ان کی تعلیم کا زیادہ انتظام کیا جائے اور زنانہ ہاسپٹل کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔ بیگم ہمایوں کانفرنس کی کاروائی بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ گورنمنٹ سے استدعا کی جائے کہ لیڈی ڈاکٹروں کی تعداد میں افزائش کرنے کے لیے لیڈی ڈاکٹروں کی تعلیم کا زیادہ انتظام کیا جائے اور زنانہ ہاسپٹل کی تعداد بڑھائی جائے۔ [۹۶]

اس سفرنامہ میں بیگم صغرا نے اپنی کانفرنس کا احوال بتانے کے علاوہ بہت سی معلومات بھی دی ہیں۔ ان کی نظر نہ صرف اپنے کام پر تھی بلکہ انھوں نے ساتھ ساتھ بہت سے واقعات، ملاقات اور سیر کے دوران میں جس جس جگہ گئیں اور لوگوں سے ملیں ان سب کو تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ قلعہ بھوپال کو دیکھتے ہوئے انھوں نے وہاں ایک نادر و نایاب قرآنی نسخہ دیکھا۔ اس کو دیکھ کر انھوں نے اپنی حیرت کا اظہار ان الفاظ میں کیا۔

> یہاں ایک کلام مجید نایاب زمانہ ہے۔ دوگز لانبا اور ڈیڑھ گز عریض ہے سات حصوں پر منقسم ہے۔ حروف بہت بڑے بڑے ایک ریح پر جو تقریباً تین گز طویل ہو گی۔ صرف ایک حصّہ اس پر رکھا ہے جس کو ہم چار آدمیوں نے مل کر کھولا۔ بامعنی اور قلمی ہے اس کی جلد چاندی کی بہت خوبصورت بنی ہوئی ہے اور الماری میں علیحدہ رکھی ہوئی ہے۔ سنا گیا ہے کہ سرکار عالیہ کے جدا اعلیٰ نے اس کلام مجید کو

> کسی ایرانی سے لیا تھا اور دو لاکھ ہدیہ دیا۔ سات اونٹوں پر سات جلدیں آئی تھیں۔[97]

یہ سفرنامہ ایسی معلومات بھی فراہم کرتا ہے۔ جو صرف تاریخ کی کتابوں میں ملتی ہیں۔ اس میں انھوں نے اردو ادب کے قاری کے لیے ہندوستان میں مختلف حملہ آوروں کے حملے، مغل بادشاہوں کی آمد ، ان کے حالاتِ زندگی، ان کے کارنامے، تاریخی عمارات، واقعات اور مقبروں کے متعلق بھی معلومات فراہم کی ہیں۔ ایک اور جگہ وہ ممتاز محل اور شاہ جہاں کی قبر کے بارے میں لکھتی ہیں:

> گنبد کے نیچے ممتاز محل کی قبر ہے۔ اس سے ملی ہوئی شاہجہاں کی قبر ہے۔ دونوں قبریں سنگِ مرمر کی ہیں جن کے چاروں طرف سنگِ مر مر کی باریک جالیاں ہیں۔ مزار پر دو قرآن خوان رہتے ہیں ۔ ممتاز محل کی قبر پر تھوڑے سے موتیا کے پھول پڑے ہوئے تھے جو کسی نے تھوڑی دیر پیشتر چڑھائے ہوں گے لیکن تعجب یہ کہ شاہ جہاں کی قبر پر ایک پھول بھی نہ تھا۔[98]

صغرا ہمایوں نے اس سفرنامے میں حضرت خواجہ سلیم اللہ چشتی سے اکبر شہنشاہ کی عقیدت و محبت کو بیان کیا ہے۔ ان کی بدولت شہزادہ جہانگیر کی ولادت ہوئی اور جہانگیر کا نام خواجہ سلیم اللہ سے عقیدت کی بنا پر مرزا سلیم رکھا۔ اس کے علاوہ قطب مینار کے بارے میں کہتی ہیں کہ یہ قطب الدین ایبک نے تیار کروایا تھا اور دنیا کے عجائبات میں شمار ہوتا ہے۔ اس مینار کے علاوہ دوسرے میناروں کا بھی ذکر ملتا ہے۔ مغل فنِ تعمیر کے متعلق انھوں نے جا بجا بہت سی مفید معلومات بھی فراہم کی ہیں۔ سفرنامے میں وہ ایک جگہ رقمطراز ہیں:

> وہاں سے ہمایوں کا مقبرہ دیکھنے کے لیے ہم سب گئے ، یہ بہت عالیشان عمارت ہے۔ بہت سے سلاطین مغلیہ ، بیگمات شاہی خاندان و اعزائے خاندان تیموریہ یہاں

> مدفون ہیں۔ بعضوں کے نام جو دریافت میں آسکے وہ
> یہ ہیں۔ فرخ سیر، جہاندار شاہ، عالمگیر ثانی، شاہ
> عالم ان کی بیوی قدسیہ بیگم، ہمایوں کی بیگم ،
> حاجی بیگم اور ان کی بہن کا مزار بھی یہیں ہے۔
> کھلے ہوئے چبوترے پر بھی بہت سی قبریں ہیں اورنگ
> زیب کے بھائی داراشکوہ مرزا مراد و شاہ شجاع کی
> قبریں مرزا رفیع الدولہ اور رفیع الدرجات کی قبریں
> جو چند دنوں کے لیے دہلی کے تخت پر بٹھائے گئے۔ [۹۹]

یہ پورا سفرنامہ مغلیہ سلاطین کی تاریخی معلومات سے بھرپور ہے۔ صغرا ہمایوں نے ان کو بیان کرتے ہوئے تاریخ اور سنہ کا خیال بھی رکھا ہے۔ اور اس سفرنامہ کو پڑھتے ہوئے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہم خود اُس عہد کی یادگار کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ انھوں نے تاریخی معلومات بھی بڑے لطیف انداز میں بیان کی ہیں جنھیں پڑھتے ہوئے بوجھل پن کا احساس نہیں ہوتا بلکہ انھوں نے سیر ہی سیر میں مغلیہ عہد اور ان کی یادگاروں کی تصویر کشی کی ہے۔ انھوں نے بڑی روانی اور آسان اردو الفاظ کے ساتھ ساتھ بہت سے انگریزی الفاظ کو بھی خوبصورتی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ انھوں نے اپنے اس سفرنامہ میں مغلیہ عہد کی تاریخ کو محفوظ کرنے کا فریضہ بھی انجام دیا ہے۔ بہت سے ایسے واقعات جن سے ایک عام قاری نا آشنا ہے دورانِ سیر وہ بھی بیان کرتی گئی ہیں مثال کے طور پر انھوں نے شہنشاہ بابر کا محبت بھرا واقعہ کچھ یوں بیان کیا ہے۔ واقعہ کچھ طویل ہے مگر دلچسپی سے بھرپور ہے۔

> کچھ عرصہ کے قیام کے بعد ہمایوں کو بہت تیز بخار
> آیا۔ بابر نے معالجہ کی غرض سے آگرے پاس بلا لیا۔
> حاذق اطبائے وقت نے معالجہ میں کوئی دقیقہ
> فروگزاشت نہیں کیا لیکن مرض بڑھتا گیا۔ جوں جوں
> دو کی ۔بابر نے عاجز و پریشان ہو کر اپنے ندما سے
> مشورہ کیا اور پوچھا کہ کونسی تدبیر کی جائے کہ
> ہمایوں مرزا کو شفا ہو۔ میرابو البقا نے جو ایک فاضل

> زبردست تھا عرض کی کہ جب دوا کارگر نہ ہو تو دعا کرنی چاہیے اور جو شے مریض کو پیاری اور عزیز ہو اس پر سے صدقہ کرنا چاہیے۔ بادشاہ نے کہا کہ ہمایوں کو سب سے زیادہ عزیز میں ہوں میں اس پر سے فدا ہوں گا چنانچہ مریض کے پلنگ کے گرد تین دفعہ جس طرح صدقے ہوتے ہیں پھرا اور دعا کی کہ باری تعالیٰ میں اس کا فدیہ ہوں اس کے عوض مری جان لے اور اسے بخش دے۔ یہ عجیب واقعہ ہے کہ مغل بابر کی اس حرکت کے ہمایوں کی حالت زوبہ اصلاح ہوتی گئی اور بابر اُسی وقت سے مبتلائے بخار ہوا۔ [۱۰۰]

بیگم صغرا ہمایوں نے اپنے سفرنامہ میں آل انڈیا لیڈیز کانفرنس کی کاروائی، تقاریر، آگرہ اور دہلی میں انجمن خواتین کے قیام کی کوششوں، مغلوں کی تاریخ، دہلی، بھوپال ، آگرہ کا جغرافیہ بیان کیا ہے۔ بلکہ انھوں نے ان علاقوں کا رہن سہن، عورتوں کے زیورات کی اقسام اور یہاں کے لوگوں کے ناک و نقشہ کو بھی اپنے خوبصورت انداز سے بیان کیا ہے۔ ان سب باتوں کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ بیگم صغرا کی معلومات بہت وسیع تھی اور ان کی ہر چیز پر گہری نظر تھی۔ وہ دلی کے لوگوں کے بارے میں لکھتی ہیں:

> دلی کے دیسی لوگوں کا رنگ عموماً صاف کھلا ہوا ہوتا ہے۔ گوری رنگت کی بی بیوں کی کمی نہیں ہے اور چہرے بھی ان کے تروتازہ۔ عام صحت بھی اچھی ہوتی ہے۔ دکن و مدراس صوبہ بہار کے باشندوں کی طرح لاغر و گندمی رنگ کے نہیں ہوتے ہیں۔ قدوقامت میں بھی دلی کے باشندے بلند و بالا توانا و فربہ ہوتے ہیں۔ یہاں کے لوگوں کا تکیہ کلام اچھی بات ہے۔ خاص و عام سب کی زبان پر یہ لفظ چڑھے ہوئے ہیں۔ [۱۰۱]

بیگم صغرا نے مسلمان عورتوں کی زبوں حالی اور ان کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی، وہ عورت اور مرد کے درمیان مساوات پر یقین رکھتی تھیں۔وہ

کہتی تھیں کہ عورت اگر تعلیم یافتہ ہو گی تو وہ اپنی نسل کے اندر بھی اخلاقیات اور آزادی کا مفاہیم واضح کر سکے گی۔ وہ تعلیمِ نسواں اور حرّیت نسواں کی بھرپور حامی تھیں اور تعلیم کو انسان کی بنیادی ضرورت تصور کرتی تھیں۔ وہ اسلام میں عورت کی تعلیم کی اہمیت سے آگاہ تھیں اس لیے اکثر مقامات پر کی گئی تقاریر اور اپنی تحریروں میں اسلامی آیات کو حوالے کے طور پر استعمال کیا کرتی ہیں وہ تعلیمِ نسواں کے فروغ کے لیے ہندوستان کے مختلف حصوں میں گئی اورجلسے منعقد کروائے جس میں انہوں نے اپنی تقاریر کے ذریعے خواتین میں بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہ سفرنامے لحاظ سے بڑی اہمیت اور دلچسپی سے بھرپور ہے۔

۲۔۳۔سفرنامہ پونہ و مدراس از بیگم صغرا ہمایوں مرزا

سفرِ ہندوستان کے اسفاد میں سے ایک اہم سفر پونہ و مدراس کا ہے۔ بیگم صغرا کے ان تمام اسفار سے ایک تو ان کی سیاحت سے دلچسپی ظاہر ہوتی ہے اور دوسرا اس نو آبادیاتی عہد میں برصغیر کی خواتین میں سیاسی، تعلیمی شعور بیدار کرنا نمایاں ہے۔ سفرنامہ پونہ و مدراس بیگم سیّد ہمایوں مرزا کا لکھا ہوا سفرنامہ ہے۔ وہ ۱۹ اگست ۱۹۱۶ء میں پونہ، وقار آباد، گلبرگہ شریف گئیں اور وہاں کے سماجی و ثقافتی احوال اپنے اس سفرنامے میں قلم بند کیے۔

اس سفر میں ان کے ہمراہ بیرسٹر ہمایوں مرزا، بیگم صغرا کی چھوٹی ہمشیرہ، رشتے میں بھائی (مرزا محمد رضا سلمہ) اور چند ملازمین تھے۔ بیگم صغرا دورانِ سفر وہاں کے حالات اور ہر مقام کی تفصیل لکھ کر رسالہ ظل السلطان (بھوپال) میں شائع کرواتی رہیں اور بعد میں ۱۹۱۸ء میں اسے کتابی صورت میں شائع کیا۔

انہوں نے یہ سفر رشتے داروں کے اصرار پر کیا اور ان سے ملاقات کی۔ اس طرح ان کا یہ سچفر ذاتی نوعیت کا اور

سیاحتی مقاصد کا حامل ہے۔ اس سفرنامے کا دیباچہ مصنفہ کے احساس کا ترجمان ہے۔ اِس لیے میں اس کو یہاں رقم کرنا ضروری سمجھتی ہوں تاکہ اُن کے الفاظ سے اس سفرنامے کو مرتب کرنے اور دیگر اہم باتوں کا پتہ چلے۔ وہ دیباچہ میں لکھتی ہیں:

> پونہ و مدراس وغیرہ کا جب میں نے سفر کیا تو وہاں کے حالات لکھ کر رسالہ ظل السلطان کو جو بھوپال سے شائع ہوتا ہے میں نے بھیجے تھے چنانچہ سلسلہ وار کئی نمبروں میں شائع ہوتے رہے۔ مگر اب میرے دوستوں اور عزیزوں کی باصرار خواتین ہوئی کہ ان حالات کو جو کئی نمبر میں نکلے اور منتشر ہیں ایک جگہ جمع کر کے مثل سفرنامہ عراق عرب کے چھپوا دوں ۔ [۱۰۲]

سفر کے احوال بیان کرنے سے پہلے وہ اللہ، محمد، علی، فاطمہ، حسن، حسین اور پھر بسم اللہ لکھتی ہیں۔ اس کے بعد وہ سفر اختیار کرنے کی وجہ بیان کرنے کے بعد اپنی روانگی کی تاریخ بتاتی ہیں۔ ان کا قافلہ بذریعہ ٹرین روانہ ہوتا ہے۔ وہ جہاں جہاں بھی گئے وہاں کے حالات تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں۔ ان کا یہ علاقائی سفرنامہ نوآبادیاتی عہد کے ہندوستان ، معاشرے اور تہذیب و ثقافت کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کرتا ہے۔ جس میں تاریخ بھی ہے، موسموں کا احوال بھی، صنعتوں کا عروج بھی، رسوم، واقعات بزرگانِ دین کی مرقع کشی ، تہذیبوں کی رنگا رنگی اور زبان کے بارے میں بھی معلومات درج ہیں۔

اس سفرنامے میں بیگم ہمایوں نے شہروں، تفریح گاہوں، مزاروں کا حال بیان کر نے کے علاوہ ہندوستان کی تہذیب اور یہاں کے لوگوں کے رسم و رواج پر روشنی ڈالی ہے۔ ہندوستان کے پہاڑ، دریا اور وادیوں کی عظمت بیان کی ہے تاکہ وہ لوگ جو ہندوستان کے دوسرے شہروں کے بارے میں ناواقف ہیں ان کے لیے یہ سفر معلومات فراہم کر سکے۔ وہ ایک رسم کا یوں ذکر کرتی ہیں کہ جس وقت گاڑی سے میں اتری بعوض تیل ماش وغیرہ دکھانے اور وارنے کے ایرانی دستور کے موافق ایک کشتی میں کلام مجید ایک آئینہ تھوڑے سے پھول

رکھ کر میری ایک عزیزی کھڑی ہو گئی اور مجھے کشتی کے نیچے سے گزرنے کے لئے کہا ۔[۱۰۳]

مصنفہ نے اپنے سفرنامے میں ہندوستان کے شہروں کی تاریخ پر زیادہ زور دیا ہے۔ وہ جس جس علاقے میں گئیں وہاں کی ایک ایک چیز کا بیان ایسے کرتی ہیں کہ قاری خود کو وہاں گھومتا پھرتا محسوس کرتا ہے۔ اورا س کے ساتھ ساتھ ان شہروں کو آباد کرنے والے لوگوں کا ذکر ایسے کرتی ہیں کہ تاریخ سے واقف ان سے بڑھ کر کوئی اور نہیں۔ ان کی اس صلاحیت کو سراہے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ مدراس کی تاریخی حیثیت یوں بیان کرتی ہیں:

> مدراس کوئی شہر نہیں ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے مدراس پر ۱۶۶۳ء میں قبضہ کیا اور یہاں ایک تجارتی منڈی قائم کی۔ایک سال بعد ایک قلعہ مسمٰی بہ فورٹ سینٹ جارج تعمیر کیا جس میں وقتاً فوقتاً ترمیم و ترقی ہوتی رہی۔ حیدر علی نایک اور ان کے بیٹے ٹیپو سلطان سے اور کمپنی سے برابر لڑائیاں ہوتی رہیں۔ ایک جنگ میں حیدر علی نے کمپنی مذکور کو شکست فاش دی۔[۱۰۴]

ایک اور شہر کے بارے میں لکھتی ہیں:

> والئیر ایک جزیرہ نما مقام ہے۔ جس کو انگریزوں نے چالیس بیالیس سال کا عرصہ ہوا کہ آباد کیا۔ اس کے تین جانب خلیج بنگالہ کی چھوٹی بڑی اونچی نیچی بہت سی پہاڑیوں پر انگریزی وضع کے بنگلے اور کوٹھیاں ہیں جن میں عموماً یورپین اشخاص رہتے ہیں ۔[۱۰۵]

مصنفہ جس بھی شہر کی سیاحت کرتی ہیں اس کے بارے میں معلومات دینے سے پہلے اس کی تاریخ بتانا ضروری سمجھتی ہیں۔ یہ خوبی ان کے تمام سفرناموں میں پائی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ اپنے روزمرہ کے احوال کا ذکر کرتی ہیں۔ وہ نظامِ زندگی میں صنعت و حرفت کی اہمیت سے بھی بخوبی آگاہ ہیں اس لیے یہ پہلو بھی ان کے سفرنامے میں نمایاں ہے۔ وہ ہر علاقے کی صنعتوں کا بھی بیان کرتی ہیں کہ

صنعت و حرفت بھی پونے کی قابل تعریف ہے۔ پیتل کے برتن نہایت عمدہ بنتے ہیں ساڑیاں بہت نازک اور باریک ہوتی ہیں۔ چاندی کا کام بہت صفائی سے بنتا ہے۔ مٹی کے کھلونے لکنہو وغیرہ کی طرح بنائے جاتے ہیں ۔ [۱۰۶] ایک اور شہر کی صنعت کے متعلق لکھتی ہیں:

> اسحاق پٹن میں بعض صنعتیں نایاب اور لایق قدر ہوتی ہیں۔ صندل کی لکڑی کے سینگ کے اور ٹورٹویس کے یعنی کچھوے کی پیٹھ کی ہڈی کی صندوقچے و قلمدان، سگرٹ اور سگار کیس، دندان کا نہایت نازک اور باریک جالیوں کا کام قابل دید بناتے ہیں۔ [۱۰۷]

مصنفہ نے جہاں دیگر حالات و واقعات پر روشنی ڈالی ہے وہاں انھوں نے تعلیم گاہوں کی صورت حال بھی بیان کی ہے۔ خاص طور پر مسلمان لڑکیوں میں تعلیم کی کمی پر وہ دل گرفتہ نظر آتی ہیں۔ ایک جگہ وہ لکھتی ہیں کہ وہاں کے مسلمانوں کی حالت مالی اور تعلیمی دونوں حیثیت سے ابتر ہے۔ مسلمان لڑکیوں کے لیے دو زنانہ مدرسے ہیں ۔ چونکہ مسلمانوں کی تعداد کم ہے اس لیے لڑکیوں کی تعداد بھی کم ہے اس پر مستزاد شوق تحصیل علم ندارد۔انہوں نے دونوں مدرسے جا کر دیکھے تھے ۔ [۱۰۸] بیگم صغرا مدراس کے تعلیمی نظام کا احوال یوں دریافت کرتی ہیں :

> میں نے حکیم صاحب سے پوچھا اس میں مسلمان طلبا کتنے ہیں حکیم صاحب نے کہا دو تھے اب تو ایک بھی نہیں ہی میں نے کہا اس کا مجھے بہت افسوس ہے کیونکہ ہندوؤں کو چاہیے اپنےمسلمان بھائیوں کو اپنےساتھ برابر رکھا کریں ان کو ترغیب دیں ۔ [۱۰۹]

ہندوستان کی مشہور و معروف شخصیتوں کا ذکر بھی اس سفرنامے میں ملتا ہے۔ جیسا کہ مسز آغا شمس الدین شاہ (ہز ہائی نس سر آغا خان کی عم زاد) مسز متھرا داس، لیڈی جگ موہن داس ، لیڈی آغا خان، مسز مہر علی، مسز نصیر الدین، راجہ پری لال آنریبل، مسٹر رفیع الدین، مسٹر گھاس والا بیرسٹر، مسٹر محمد علی صاحب، آغا ابو القاسم، سرسیّد علی امام، مسٹر سیّد حسن امام، مولوی وحید الزماں

خان صاحب المخاطب بہ وقار نواز جنگ بہادر (مصنف انوار اللغات) حضرت محمداسحاق مدنی اور خاص طور پر اردو ادب کے ایک صوفی شاعر حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز علیہ الرحمہ کے متعلق ایک اہم ترین واقعہ ملتا ہے۔ جس سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ ان کے سفرناموں میں ایسی نایاب اور مفید سماجی و ثقافتی معلومات ملتی ہیں جو تاریخی کتب میں بھی کم یاب ہو گئی ہیں ۔ ان کے سفرنامے بہت سے پہلوؤں سے اہمیت رکھتے ہیں۔

۳۔۳ رہبر کشمیر از بیگم صغرا ہمایوں مرزا

بیگم صغرا ہمایوں مرزا کا ایک اہم سفرنامہ رہبر کشمیر ہے۔ یہ ایک مقامی سفر کی روداد ہے جو انھوں نے خصوصی طور پر اپنی ہندوستانی خواتین کی بہبود و ترقی کے مقصد سے لکھا ہے۔ وہ سفر کی شوقین تھیں اور خواتین کے لیے ایک نرم گوشہ رکھتیں تھیں۔وہ اردو ادب کی نامور مصنفہ ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ حقوق نسواں اور تعلیمِ نسواں کے لیے آواز بلند کی اور خواتین کو آگاہی دینے اور انھیں بیرونی حالات و واقعات سے روشناس کروانے کے لیے بہت سے سفرنامے تخلیق کیے ہیں ۔

ان کا یہ سفر کشمیر ۸ جولائی ۱۹۲۸ء اور اسلامی مہینے کی مناسبت سے ۱۸ محرم کو شب کے نوبجے سکندر آباد کے ریلوے اسٹیشن سے شروع ہوا۔ ان کے ہمراہ بیرسٹر صاحب (شوہر ہمایوں مرزا) بھائی حیدر علی مرزا اور دو ملازم تھے۔ انھوں نے یہ سفر بیرسٹر ہمایوں مرزا کے ڈاکٹر کے مشورے تبدیلی آب و ہوا کی خاطر کیا اور انھوں نے تقریباً پانچ مہینے سفر میں گزارے۔ ان کا یہ سفر کشمیر ۸ جولائی ۱۹۲۸ء کو شروع ہوا اور ۱۹ دسمبر ۱۹۲۸ء کو ختم ہوا۔ یہ سفرنامہ روزنامچے کی ہیئت میں لکھا گیا ہے۔ مصنفہ نے اپنی سیاحت کی تفصیل تاریخ وار بیان کی ہے اور کوشش کی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ تاریخی، معاشی، سماجی اور ثقافتی معلومات مہیا کریں۔

یہ سفرنامہ رہبر کشمیر ۱۹۳۱ء میں اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹر چار مینار حیدرآباد دکن سے شائع ہوا۔ اس کا خوبصورت دیباچہ جناب عبد الماجد دریا بادی نے تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> کہاں حیدرآباد اور کہاں کشمیر!مشرق و مغرب کا نہ سہی، شمال و جنوب کا فرق! اور یہ عورت ذات کے لیے؟ لیکن جو بلند ہمت خاتون یورپ تک سفر کر چکی ہیں، ان کے لیے اس فاصلہ کی کیا حقیقت تھی؟ کوئی چار سال ہوئے اور اپنے شوہر کے ہمراہ وہ کشمیر گئیں اور واپس آئیں۔ لاہور، دہلی، اجمیر، علی گڑھ، وغیرہ راستہ میں پڑتے رہے۔ جو کچھ ان کی آنکھوں نے اور دل کی آنکھوں نے دیکھا، اپنے لطف میں ان اوراق کے ذریعہ سے وہ اپنے بھائیوں اور بہنوں کو بھی شریک کر رہی ہیں ۔[۱۱۰]

اور اس سفرنامہ کا ریویو ملک الشعراء استاد حضرت حافظ جلیل احمد نے ان الفاظ میں لکھا ہے:

> شروع میں جو بسیط مقدمہ ہے۔صرف اس کے دیکھنے سے کشمیر کا پورا مرقع آنکھوں کے سامنے کھچ جاتا ہے۔ حالات پڑھنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ نگار نے کشمیرکے اعلیٰ مناظر اور مشہور مقامات کو سطحی نظر سے نہیں دیکھا بلکہ تمام جزئیات پر گہری نظر ڈالی ہے۔ بیان بہت سلجھا ہوا اور زبان بہت پاکیزہ ہے۔ میں قابل مصنفہ کو اس کامیاب تصنیف پر مبارکباد دیتا ہوں ۔[۱۱۱]

اس سفرنامہ کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ اس کے شروع میں مصنفہ بیگم صغرا ہمایوں کی اس تخلیق پر مولانا سید علی حیدر صاحب نے یہ اشعار کہے ہیں:

لکھا صغرا ہمایوں میرزا نے — بہت تفصیل سے کشمیر کا حال
زبان اُن کی ہے موجِ آبِ کوثر — قلم اُن کا ہمایوں فر ہما بال
عبارت ہے کہ تصویریں کھنچی ہیں — مطابق کس قدر ہے حال سے قال

یہی کشمیر کا جغرافیہ ہے — یہی کشمیر کے تاریخی احوال
وہ جھیل اس کی سمندر آسمانی — پہاڑ اس کے بلند اور چرخ تمثال
وہ طغیانی وہاں کی ندیوں کی — کریں جو نوح کے طوفاں کو پامال[۱۱۲]

رہبر کشمیر کا مقدمہ بیگم صغرا نے ان الفاظ سے شروع کیا ہے کہ قبل اس کے کہ میں اپنے حالیہ سفر وسیاحت کشمیر جنّت نظیر کے حالات و واقعات اپنی ڈائری (روزنامچہ) میں سے نقل کروں اور ایک کتاب کی شکل میں پبلک کے سامنے پیش کروں یہ مناسب خیال کرتی ہوں کہ مختصر طور پر کشمیر کے جغرافیائی و تاریخی حالات اور وہاں کی قدرتی خوبیوں کا بھی کچھ تذکرہ کروں ۔[۱۱۳]

اس مقدمہ کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے کیوں کہ مصنفہ نے سیاحت کشمیر کا احوال بیان کرنے سے پہلے کشمیر کے جغرافیہ، تاریخ، اسلامی عہد حکومت، کشمیر کی قدرتی خوبیاں اور کشمیر کے آنے جانے کے راستے کے متعلق بھرپور معلومات فراہم کی ہیں اس سے مصنفہ کی معلومات اور دلچسپی کی داد دینا پڑتی ہے۔

کشمیر ، لاہور، راول پنڈی، ٹیکسلا، امرتسر، دہلی، علی گڑھ اور اجمیر شریف کے بارے میں اتنی جامع معلومات دینے میں خواتین میں بیگم صغرا کو اولیت حاصل ہے۔ اس سے پہلے کشمیر کے بارے میں کسی خاتون نے اگر سیاحت نامہ تخلیق بھی کیا ہے تو نہایت مختصر اور معلومات بھی سرسری بہم پہنچائی ہیں۔

بیگم صغرا نے سکندر آباد سے اپنے سفر کا آغاز کیا اور مختلف شہروں سے ہوتے ہوئے کشمیر پہنچے۔ راستے میں اور کشمیر میں وہ اپنے عزیزوں اور دوستوں سے بھی ملے اور ان ملاقاتوں کا ذکر بھی سفرنامہ میں کیا ہے۔ مثال کے طور پران میں یہ معروف شخصیات شامل ہیں۔

۱۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال

۲۔ مولوی ممتاز علی
۳۔ سرمحمد شفیع
۴۔ امتیاز علی تاج
۵۔ خواجہ حسن نظامی
۶۔ بیگم راشد الخیری
۷۔ سید حسن جلالی
۸۔ مولا بخش

بیگم صغرا ایک اچھی شاعرہ بھی تھیں۔ انھوں نے اس سفرنامے میں اپنی اس شاعرانہ طبیعت سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ ہمیں نثر کے ساتھ ساتھ شاعری سے بھی لطف اندوز ہونے کا موقع ملتا ہے۔ جیسا کہ انھوں نے سفرکے دوران ملکہ نور جہاں کا مقبرہ دیکھنے کی آرزو میں یہ نظم لکھی اور اس نظم کے بارے میں وہ لکھتی ہیں کہ انھوں نے دوران ِ سفر محمد اقبال کو یہ نظم دکھائی اور انھوں نے پسند فرمائی۔ [۱۱۴] نظم کے اشعار کچھ یوں ہیں:

اے خوشا وقت کہ ہوں آج میں آئی لاہور — میری دیرینہ تمنا مجھے لائی لاہور
مرقد نور جہاں دیکھنے کی خواہش تھی — آرزو ہو گئی پوری مِرے خالق دل کی
زندگی میں تھی تیرے نور سے دنیا تاباں — بعد مرنے کے ہے لاہور اسی سے رخشاں [۱۱۵]

سفرنامے میں وہ کشمیر کی سماجی و ثقافتی کیفیت و حالات بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ کشمیر بہت خوبصورت جگہ ہے اور وہ وہاں کے مندروں دھرم داد مندر اور مندر کہیر بہوانی میں بھی گئیں اور ان میں سے ایک مندر کی منظر کشی یوں کی ہے:

بہت بڑا باغ ہے بیچ میں ایک حوض ہے۔ اس کے سامنے مندر ہے۔ اس حوض کے اندر ایک چشمہ ہے ہر وقت پانی ابلتا رہتا ہے ہزاروں پھول پانی پر پڑے تھے جو پوجا کر کے ڈال دیئے جاتے ہیں۔ گھڑوں میں دودھ لا لا کر اسی حوض میں ڈالتے ہیں۔ [۱۱۶]

سفرنامے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کشمیریوں کی زبان اور لباس اس وقت کیسے تھے۔ صغرا ہمایوں مرزا نے ایک ایک بات پر نظر رکھی ہے اور کوئی بھی پہلو تشنہ نہیں رہنے دیا۔ وہ کشمیری زبان کے بارے میں لکھتی ہیں کہ یہاں کی بولی کشمیری ہے جو فارسی و سنسکرت سے مل کر ایک خاص زبان ہو گئی ہے۔ چند باتیں کشمیری لکھتی ہوں۔ بھائی کی جگہ (بابوچھ) لوگ ہیں (لوگ چھ) لڑکے تھے کی جگہ (لگت اُسی) شاید ہو گا (شاید سا) ۔ [۱۱۷]

انھوں نے کشمیر نہ صرف کشمیر کے تاریخی مقالات، مزاروں، مسجدوں بلکہ کشمیر میں موجود باغوں کے متعلق بھی خوبصورت منظر کشی کی ہے۔ بیگم صغرا نے کشمیر کے نشاط باغ کی سیر کی اور اس کی خوبصورتی سے متاثر ہوئیں۔ انھوں نے اس کے علاوہ نسیم باغ، نگینہ باغ اور بادام باغ کے متعلق بھی بتایا ہے:

> اس باغ کے چار تختے ہیں جو ایک دوسرے سے بلندی پر درجہ بدرجہ اونچا ہے۔ آخری طبقہ سب سے اونچا ہے ہر طبقہ میں الگ الگ قسم کے پھول ہیں اور فوارے اور آبشار ہیں۔ آخری درجہ عین دامن کوہ میں ہے جہاں ایک چھوٹا سا مکان بھی ہے ۔ [۱۱۸]

رہبر کشمیر میں مغلوں کی سلطنت، عروج و زوال اور تاریخی واقعات کے علاوہ انگریز حکمرانوں کی آمد کے متعلق بھی معلومات ملتی ہیں۔ اس سفرنامے میں لاہور، راولپنڈی اور ٹیکسلا کے حالات، لاہور میں ان کی دعوتوں کا احوال اور قلعہ لاہور کی یادگار سیر بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ وہ ریشم کے کیڑے کے بارے میں بھی معلومات دیتی ہیں کہ مصنوعی طریقے سے ریشم کیسے حاصل کیا جاتا ہے اور کیڑوں کی افزائش کے طریقے بھی بتاتی ہیں:

> وہ دیکھا جہاں ریشم نکلتا ہے اور تیار ہوتا ہے وہ گرنی دیکھی روزانہ چھ سو آدمی کام کرتے ہیں۔ عورتیں ایک طرف بیٹھی کیڑوں کے گھر چن رہی تھیں۔ تین قسم کے انڈے ہوتے ہیں۔ ان کی قیمت بھی اس لحاظ سے ہوتی ہے۔ جب یہ انڈے یعنی کیڑے کے

> گھر ضرورت سے زیادہ ہو جاتے ہیں تو انھیں کشمیر
> سے یورپ بھجوا دیے جاتے ہیں ۔ [۱۱۹]

بیگم صغرا اس سفرنامے میں ہر جگہ بہت مصروف نظر آتیں ہیں۔ ان کی زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہیں جس میں وہ مصروف عمل نہیں۔ وہ جس شہر بھی جاتی ہیں وہاں پر خواتین کے حقوق کی بیداری اور تعلیم کے لیے بھی کوشاں رہی ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے تقاریر بھی کیں اور پردے کے متعلق بحث و مباحثہ بھی ملتا ہے۔ اس سفرنامے میں جگہ جگہ وہ تہذیب نسواں اور عصمت (رسائل) کے ساتھ رابطے میں رہیں اور ان کے ساتھ خط و کتابت اور انھیں مسلسل مضامین لکھ کر بھیجتی رہیں۔ انھوں نے اس سفرنامے رہبر کشمیر کو بھی ان رسائل میں سلسلے وار شائع کروایا۔ بیگم صغرا کے سفرنامے سے بیسویں صدی کے کشمیر اور دیگر علاقوں کی ثقافتی، معاشرتی اور تاریخی بہت سی اہم معلومات ملتی ہیں جسے پڑھ کر ان کی دلچسپیوں اور جدوجہد کی داد دینا پڑتی ہے۔ ان کی زندگی سے مسلسل حرکت اور پُرعزم ارادوں کا درس ملتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد امین زبیری مارہروی، حیات سلطانی ، ص ۲۳۸۔
۲ ۔ قدسیہ قریشی، اردو سفرنامے انیسویں صدی میں،ص ۶۵۔
۳۔ محمد شہاب الدین، اردو میں حج کے سفرنامے، ص۶۵۔
۴۔ نواب سلطان جہاں بیگم، حیاتِ سکندری، ص ۱۵۴۔
۵۔ محمد شہاب الدین، اردو میں حج کے سفرنامے، ص ۶۵۔
۶۔ رضیہ حامد ، نواب سلطان جہاں بیگم، ص ۵۳۔
۷۔ رضیہ حامد، نواب سلطان جہاں بیگم، ص۵۲۔
۸۔ محمد شہاب الدین، اردو میں حج کے سفرنامے، ص ۶۵۔
۹۔ محمد امین زبیری مارہروی، بیگمات بھوپال،ص۵۱۔
۱۰۔ نواب سلطان جہاں بیگم، حیاتِ سکندری، ص۱۰۲۔
۱۱۔ نواب سلطان جہاں بیگم، حیاتِ سکندری، ص۲۴۷۔
۱۲۔ محمد شہاب الدین، اردو میں حج کے سفرنامے، ص ۱۲۸۔
۱۳۔ نواب سلطان جہاں بیگم، روضۃ الریاحین،ص۲۔
۱۴۔ محمد امین زبیری مارہروی، حیات سلطانی ، ص ۲۳۴۔
۱۵۔ بیگم سربلند جنگ بہادر، دنیا عورت کی نظر میں،(دہلی: خواجہ برقی پریس، ۱۹۱۰ء)، ص۱۵۔
۱۶۔ ایضاً، ص ۱۷۔
۱۷۔ ایضاً، ص۱۲۶۔
۱۸۔ مرزا حامد بیگ، اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ، ص۶۹۔
۱۹۔ بیگم سربلند جنگ بہادر، دنیا عورت کی نظر میں، ص۱۶۔
۲۰۔ ایضاً،ص ۱۳۰۔
۲۱۔ ایضاً، ص ۸۹۔
۲۲۔ ایضاً، ص ۱۲۔
۲۳۔ ایضاً، ص ۴۰۔
۲۴۔ ایضاً، ص ۱۰۰۔
۲۵۔ صغرا ہمایوں، سفرنامۂ عراق۔(حیدر آباد :مطبع نظام دکن، ۱۹۱۵ء)،سرِ ورق۔
۲۶۔ ایضاً، ص۱۔
۲۷۔ ایضاً، ص۱۔
۲۸۔ ایضاً، ص۳۵۔
۲۹۔ ایضاً، ص۱۔
۳۰۔ ایضاً، ص ۶۸۔
۳۱۔ انور سدید، اردو ادب میں سفرنامہ ،ص۴۸۳۔

۳۲۔ صغرا ہمایوں، سفرنامہ عراق، ص ۶۸۔
۳۳۔ ایضاً، ص ۲۸۔
۳۴۔ ایضاً ، ص۴۵۔
۳۵۔ ایضاً، ص۶۶۔
۳۶۔ ایضاً، ص ۴۸۔
۳۷۔ ایضاً، ص۲۹۔
۳۸۔ محمودہ عثمان حیدر، مشاہدات بلاد اسلامیہ، (کراچی: مشہور آفسٹ پریس، ۱۹۶۲ء)، ص۱۱۔
۳۹۔ ایضاً، ص ۱۳۔
۴۰۔ انور سدید، اردو ادب میں سفرنامہ، ص ۵۰۱۔
۴۱۔ شبلی نعمانی، معارف ، مشمولہ محمودہ عثمان، مشاہدات، ص۰۷۔
۴۲۔ محمودہ عثمان، مشاہدات بلاد اسلامیہ، ص۱۷۔
۴۳۔ ایضاً، ص ۱۱۷۔
۴۴۔ ایضاً، ص ۲۳۔
۴۵۔ ایضاً، ص ۱۳۷۔
۴۶۔ ایضاً، ص ۱۳۹۔ ۱۴۰۔
۴۷۔ ایضاً، ص ۵۶۔
۴۸۔ حامد بیگ، مرزا، اردو سفرنامہ کی مختصر تاریخ،ص ۸۶۔
۴۹۔ سیّدشفقت رضوی، بیگم حسرت موہانی: حیات وسیرت،ص۸۵۔
۵۰۔ ایضاً، ص ۱۱۱۔
۵۱۔ ایضاً ، ص۱۱۰۔
۵۲۔ ایضاً ، ص۱۰۵۔
۵۳۔ ایضاً ، ص ۱۱۱۔
۵۴۔ ایضاً، ص ۱۰۲۔
۵۵۔ انور سدید، اردو ادب میں سفرنامہ، ص ۲۴۷۔
۵۶۔ سیّدشفقت رضوی، بیگم حسرت موہانی: حیات وسیرت ، ص ۱۱۹۔
۵۷۔ ایضاً، ص ۱۱۸۔
۵۸۔ نازلی رفعیہ سلطان، سیر یورپ، (لاہور: یونین ایٹم پریس، ۱۹۰۸ء)، ص۱۔
۵۹۔ ایضاً، ص ۱۳۱۔
۶۰۔ ایضاً، ص ۱۵۔

۶۱۔ ایضاً، ص۵۲۔
۶۲۔ انور سدیدؔ اردو ادب میں سفرنامہ۔ ص ۱۹۹۔
۶۳۔ ایضاً، ص ۱۹۶۔
۶۳۔ ایضاً، ص۱۹۴۔
۶۵۔ نازلی رفعیہ سلطان، سیر یورپ ، ص ۱۶۳۔
۶۶۔ ایضاً، ص ۷۲۔
۶۷۔ شاہ بانو، سیاحت سلطانی ،(آگرہ:مطبع مفید عام، ۱۹۱۵ء)، ص۶۔
۶۸۔ ایضاً، ص۴۹۔
۶۹۔ فرحت جہاں، بیسویں صدی میں خواتین کی غیر افسانوی نثر: ایک مطالعہ، ص ۱۲۳۔
۷۰۔ شاہ بانو، سیاحت سلطانی، ص ۷۰۔۷۱۔
۷۱۔ ایضاً، ص۶۹۔
۷۲۔ انور سدید، اردو ادب میں سفرنامہ،ص ۲۰۲۔
۷۳۔ محمد امین، مارہروی، بیگمات بھوپال،ص ۱۳۳۔
۷۴۔ شاہ بانو، سیاحت سلطانی، ص ۵۶۔
۷۵۔ ایضاً، ص ۶۱۔
۷۶۔ عطیہ فیضی، زمانۂ تحصیل،(آگرہ: مطبع مفید عام، ۱۹۲۱ء)، ص دیباچہ۔
۷۷۔ انور سدید،اردو ادب میں سفرنامہ، ص۱۹۹۔
۷۸۔ عطیہ فیضی، زمانۂ تحصیل،ص۷۸۔
۷۹۔ ایضاً ،ص۷۶۔
۸۰۔ ایضاً ،ص۶۲۔
۸۱۔ ایضاً ، ص۱۲۸۔
۸۲۔ صغرا ہمایوں، سفرنامہ یورپ (حصہ دوم)،(حیدرآباد دکن :اعظم ایسٹم پریس، چار مینار، ۱۹۲۶ء)، ص۸۶۔
۸۳۔ ایضاً، ص ۱۹۲۔
۸۴۔ ایضاً(حصّہ اوّل)، ص ۱۲۲ ۔
۸۵۔ فرحت جہاں ، بیسویں صدی میں خواتین کی غیر افسانوی نثر : ایک مطالعہ، ص ۳۴۔
۸۶۔ صغرا ہمایوں، سفرنامہ یورپ، ص ۱۳۴۔
۸۷۔ حامد بیگ، مرزا، اردو سفرنامہ کی مختصر تاریخ، ص۸۰۔

۸۸۔ صغرا ہمایوں مرزا، سفرنامہ یورپ، ص۱۳۵
۸۹۔ شفیع عقیل، زندگی پھر ہم کہاں ، بک ہوم، (لاہور: ۲۰۰۶ء)، ص۹
۹۰۔ سیمیں فضل ثمر، ہندوستانی مسلم خواتین کی جدید تعلیمی ترقی میں ابتدائی ناولوں کا حصہ، ص۲۵۶
۹۱۔ بیگم ہمایوں مرزا، روزنامچہ سفر بھوپال و آگرہ و دہلی کے حالات،(دکن: انجمن خواتین، ۱۹۱۸ء)، ص۲
۹۲۔ ایضاً، ص۶
۹۳۔ ایضاً، ص ۴
۹۴۔ ایضاً، ص ۶
۹۵۔ ایضاً، ص ۹
۹۶۔ ایضاً، ص ۱۰
۹۷۔ ایضاً، ص ۳۰
۹۸۔ ایضاً، ص ۴۱
۹۹۔ ایضاً، ص ۶۰
۱۰۰۔ ایضاً، ص ۶۲
۱۰۱۔ ایضاً، ص ۷۱
۱۰۲۔صغرا ہمایوں، سفرنامہ پونہ مدراس، مقدمہ۔۔
۱۰۳۔ایضاً، ص۲۔
۱۰۴۔ایضاً، ص۳۷۔
۱۰۵۔ایضاً، ص ۲۷۔
۱۰۶۔ایضاً، ص ۵۔
۱۰۷۔ایضاً، ص۵۲۔
۱۰۸۔ایضاً، ص ۳۳۔
۱۰۹۔ایضاً، ص ۳۲۔
۱۱۰۔ایضاً، ص ۵۲۔
۱۱۱۔عبد الماجددریا بادی، سیر کشمیر (دیباچہ)، ص ا
۱۱۲۔ایضاً، سیر کشمیر (ریویو)، ص ۱
۱۱۳۔ایضاً، ص ۱
۱۱۴۔صغرا ہمایوں، سیر کشمیر (مقدمہ)، ص۳

۱۱۵۔ایضاً، ص ۱۹
۱۱۶۔ایضاً، ص۹۲
۱۱۷۔ایضاً، ص ۱۱۹
۱۱۸۔ایضاً، ص ۱۰۴
۱۱۹۔ایضاً، ص ۶۱

باب پنجم

خواتین سفرنامہ نگاروں کے امتیازی خصائص:
تہذیبی و تمدنی مظاہر

برعظیم پاک و ہند کی سرزمین مسلمانوں کی آمد سے علم و ادب کا گہوارہ بنی۔ مسلمانوں میں شجاعت کی صلاحیتوں کے علاوہ علوم و فنون کی بھی غیر معمولی صلاحیت تھی۔ ان ہی کی بدولت ہندوستان میں طب، ہیئت، ریاضی، کیمیا، ادب، فقہ، تفسیر، حدیث، تاریخ اور سیرت نگاری میں قابل قدر اضافہ ہوا ۔ انہوں نے علوم کی بھی سرپرستی کی۔ ان علمی سرگرمیوں اور تمام شعبۂ ہائے زندگی میں خواتین بھی مردوں کے ساتھ حصّہ لیتی تھیں۔ خواتین میں یہ علم و فن کا شوق اسلام کی وجہ سے پیدا ہوا۔ اسلام نے عورت کو بلند مقام و مرتبہ عطا کیا اور اسی وجہ سے دیگر مذاہب میں سے صرف مسلمان خواتین کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے ہر علم و فن میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا اور مردوں سے کسی طور پیچھے نہیں رہیں۔ ان خواتین میں رقیہ سلطان، گل بدن بیگم، نور جہاں، زیب النساء، جہاں آرا بیگم ، گل رخ بیگم اور ممتاز محل کے نام بھی قابلِ ذکر ہیں۔

اس دور کی سیاسی و سماجی صورت حال کا طائرانہ جائزہ لیا جائے تو بدقسمتی سے مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد سے مغل سلطنت کا شیرازہ بکھرنا شروع ہو گیا تھا۔ نااہل حکمرانوں کی نااہلی کا فائدہ

اٹھاتے ہوئے بہت سی ریاستوں نے خودمختاری کا اعلان کر دیا ۔ ساتھ ہی مرہٹے، فرانسیسی، انگریز اور دوسرے سیاسی گروہ مرکزی حکومت کے زوال کے بعد اپنا اقتدار مضبوط کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ ان حالات میں ہر طرف معاشی، تہذیبی، معاشرتی ، اخلاقی، بدحالی پھیل گئی اور پوری قوم تنزلی کا شکار نظر آنے لگی۔ مسلمانوں کے عہد زوال سے پورے معاشرے پر جمود طاری ہو گیا۔ جس سے تہذیبی اور تمدنی قدریں بدل گئیں۔ خواتین جو مسلم معاشرے میں مردوں کے شانہ بشانہ ہر علمی و ادبی سرگرمیوں میں حصّہ لیتی تھیں۔ وہ معاشرے کی زبوں حالی سے گھر کی چار دیواری میں مقید ہو گئیں۔

۱۔تعلیم نسواں اور اس کے اثرات:

برصغیر پاک و ہند میں انیسویں صدی کے شروع میں عورتوں کی تعلیم نہ ہونے کے برابر تھی۔ ملک میں جو کوششیں ہو رہی تھیں ان کی رفتار بھی کافی سست تھی۔ بنگال میں خواتین کی پست تعلیمی حالت کے بارے میں ایک رپورٹ کے مطابق "بنگال کی ۴۹۶۹۷۴ کی کل آبادی میں سے (۲۱۹۰۷ مردوں کے مقابلے میں) صرف چار خواتین خواندہ تھیں۔ اسی طرح بمبئی کی صورت حال بھی کچھ اسی نوعیت کی ہی تھی۔ ۱۸۲۵ء اور ۱۸۲۹ء میں کی گئی دونوں تحقیقات میں کسی ایسی لڑکی کا ذکر نہیں ملتا جو کسی دیسی سکول میں پڑھتی ہو۔ لیکن ایک محقق جروس نے مسلمان عورتوں کی نجی تعلیم کا ذکر ضرور کیا ہے۔ اور اس قسم کی تعلیمی حالت کی گواہی اونچی ذات کے ہندو گھرانوں میں بھی ملتی ہے۔ ان علاقوں کی نسبت مدراس کی تعلیمی حالت قدرے بہتر تھی۔ وہاں کے اعداد و شمار کے مطابق ۱۸۴۱۱۰۰ لڑکوں میں سے ۵۴۸۰ لڑکیاں تھیں۔ ان تمام صوبوں کے مقابلے میں پنجاب کی حالت بہتر تھی۔ جہاں طالبات کے مخصوص سکول موجود تھے۔ [۱] ہندوستان میں ایسی پست تعلیمی صورت حال کو دیکھتے ہوئے پہلی بار ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۸۱۳ء کے چارٹر ایکٹ کے مطابق ہندوستان کے لوگوں کی تعلیمی حالت کو بہتر بنانے کی ذمہ داری تو لی مگر افسرانِ اعلیٰ نے لڑکیوں کی

تعلیم کی بجائے اپنی تمام تر توجہ لڑکوں کی تعلیم تک محدود رکھی۔ کیوں کہ ان لوگوں نے جان لیا تھا کہ ہندوستانی معاشرے لڑکیوں کی تعلیم کے سخت خلاف ہے اور اس معاملے کو چھیڑنا اپنی مشکلات کو دعوت دینا ہے۔[۲]

ہندوستان میں عورتوں کی تعلیم کے سلسلے میں مسیحی مشنریوں کا بڑاا ہم حصہ ہے۔ انھوں نے ۱۸۱۹ء میں علیحدہ سکولوں کے ذریعے لڑکیوں کو تعلیم دینے کا آغاز کیا اور خاص طور پر ۱۸۱۹ء تا ۱۸۳۷ء کا عہد ان لوگوں کی زبردست تعلیمی جدوجہد کا زمانہ ہے۔ لیڈی امہرسٹ (Lady Emehrist)کی سرپرستی میں ۱۸۲۴ء میں Ladies Society for Native Female Education قائم ہوئی۔ جس کی سرپرستی میں لڑکیوں کے تیس سکول کھولے گئے۔ ان مشنریوں کے قائم کردہ سکولوں میں مغربی انداز کی تعلیم دی جاتی تھی۔[۳] لیکن اس تمام جدوجہد کے باوجود عورتوں کی تعلیمی حالت بہتر نہ ہو سکی کیوں کہ مسلمان اور اونچی ذات کے ہندو اپنی بچیوں کو ان مغربی اندازِ تعلیم کے سکولوں میں بھیجنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ان سکولوں کی ذمہ داری خود ایسٹ انڈیا کمپنی نے قبول نہیں کی تھی۔ کیوں کہ یہ لوگ جانتے تھے کہ ہندوستان کے مذہب اور سماج میں عورتوں کی تعلیم کے خلاف تعصب کی شدت اتنی شدید ہے کہ تعلیمِ نسواں کی ذرا سی بھی کوشش ان کے لیے مسائل کھڑے کر سکتی ہے۔ لیکن کمپنی کے اس فیصلے میں تبدیلی لانے کی جرأت لارڈ لہوزی (Lord Dilhosi)نے کی اور انھوں نے تعلیمِ نسواں کے لیے امداد اور حکومت کے تعاون کا تاریخ ساز فیصلہ ۱۱اپریل ۱۸۵۰ء میں کیا۔[۴]

عورتوں کی تعلیم کو فروغ دینے میں ایف۔ای۔ڈی بیتھون (F-E-D Bethune)کی کوششوں کا بڑا دخل ہے۔ وہ یہ بات جانتا تھا کہ اونچی ذات کے ہندو کبھی بھی اپنی بچیوں کو مسیحی مشنریوں کے اسکولوں میں نہیں بھیجیں گے۔ اس لیے بیتھون نے ۱۸۴۹ء میں انفرادی طور پر ایک سکول قائم کیا ۔ پھر اس سکول کی کارکردگی سے اور ہندوستانیوں کے رجحان میں تبدیلی سے اسی طرز کے سکول کھولے جانے لگے۔ بعد میں

یہی سکول ترقی کر کے بیتھون کالج کے نام سے ہندوستانی خواتین کا پہلا اور اہم ادارہ بن گیا۔ [۵]

برطانوی حکومت کے مکمل تسلّط کے بعد برعظیم پاک و ہندکی سیاسی، تہذیبی ، تعلیمی اور ثقافتی میدان میں بہت سی تبدیلیاں آئیں۔ ان روز بروز کی تبدیلیوں اور مغربی نظام کی ترقیوں کی وجہ سے ہندوستانی لوگوں میں بھی شعور بیدار ہونا شروع ہوا۔ ان کے ذہنوں میں ایک انقلاب برپا ہوا اور سوچنے سمجھنے کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ تعلیم کے سلسلے میں کے۔ایم۔پنکر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ جہاں برطانوی نظام حکومت نے ہندوستان کے لوگوں کے لیے بہت کچھ کیا ہے مگر وہاں صرف انگریزی تعلیم کے نفاذ سے ہی ہندوستانیوں کے فرسودہ رسم و رواج ، مافوق الفطرت عقائد اور ان کے تعصبات ددر کرنے اور ان کے اندر ایک نئے فکر و عمل کی جلا بخشنے میں کافی مدد ملی۔ [۶]

جب ہندوستانیوں میں انگریزی تعلیم کی وجہ سے شعور بیدار ہوا تو پھر ہندوستان کے دانش وروں اور مصلحین نے بھی معاشرے میں موجود جہالت، فرسودہ رسم و رواج، عقائد کا قلع قمع کرنے کے لیے مختلف شہروں میں انجمنیں اور تحریکیں قائم کیں مثلاً مذہبی تحریکیں ،علی گڑھ تحریک ،آریا سماج، برہمو سماج، تھیوسی فیکل سوسائٹی وغیرہ۔ ان کے ذریعے انہوں نے اپنی اصلاحی مہمیں شروع کیں اور لوگوں میں شعور بیدار کرنے کے لیے ان تھک کوششیں کیں۔

برہمو سماج (۱۸۲۶ء) کی قیادت راجہ رام موہن رائے کر رہے تھے۔ انہوں نے ہندوستان میں تعلیمِ نسواں اور عورتوں کو خاص حیثیت دلانے کے لیے ایک مہم شروعَ کی۔ لیکن اس اصلاحی تحریک کو پورے ہندوستان میں متعارف کروانے کا اعزازِ کیشب چندر سین کو حاصل ہے۔ جن کی کوششوں سے اس کی شاخیں ملک کے مختلف حصوں میں قائم ہوئیں۔ اسی طرح آریا سماج (۱۸۷۵ء) اور تھیوسی فیکل سوسائٹی (۱۸۷۹ء) نے بھی ہندوستانی عورتوں کی تعلیمی حالت کو سدھارنے کے لیے ملک گیر تحریکیں شروع کیں۔ غرض کہ اس صدی میں

ہندوستان میں مذہبی اور سماجی اصلاحات کی تحریکیں کافی شدت سے نکلیں۔ اس میں جہاں مردوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، وہاں خواتین بھی کسی سے پیچھے نہ رہیں۔ اگرچہ ان کی تعداد بہت قلیل تھی مگر ان کی موجودگی سے ایک عام عورت کو بھی طاقت ملی۔ تعلیمِ نسواں کی تحریک کو مہارانی تپسوینی (Maharani Tapasvini) ، رانی شرنومی (Rani Sharnomoyee) سورن کماری دیوی، رانا بائی راناڈے وغیرہ جیسی شخصیات نے نئی شاہراہ پر گامزن کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

لاہور میں ۱۹۰۹ء میں ایک سوشل کانفرنس منعقد کی گئی جس کی صدارت پرتاب گڑھ کی رانی صاحبہ نے کی تھی۔ اس کانفرنس میں ایک تجویز پیش کی گئی کہ ہندوستان میں "بھارت استری منڈل" کے نام سے ہندوستان کی خواتین کی ایک سبھا قائم کی جائے لیکن اس وقت کوئی عملی جامہ نہ پہنایا گیا۔ تاہم نومبر ۱۹۱۰ء میں لاہور ہی میں ایک جلسے میں، جس کی صدارت مسز سین کر رہی تھیں اس تجویز کو قبول کر لیا گیا۔ اس طرح عورتوں کی تعلیم کے فروغ کے لیے "بھارت استری منڈل" کا قیام ہوا۔اس تجویز کی محرک شریمتی سرلا دیوی چودھرانی تھیں اور وہ ہی اس کی سیکرٹری مقرر ہوئیں۔ اس کانفرنس کی استقبالیہ کمیٹی کی پردھان رانی صاحبہ پرتاب گڑھ تھیں اور مسند دیب نارائن سنگھ، مسز سچدانند سہنا، مسز موتی لال نہرو، مسز للت موہن برجی، مسز جیوتی سروپ وغیرہ اس کمیٹی کی ممبر تھیں۔ بیگم صاحبہ جنجیرہ نے اس منڈل کی پہلی کانفرنس کو اپنی صدارت سے اعزاز بخشااور بیگم بھوپال بھی اس جلسے میں شریک تھیں۔ [۷]

ہندوستان میں تعلیم نسواں کی تحریک طبقہ اشرافیہ کی چند خواتین نے شروع تو کی تھی لیکن کم وسائل ہونے کی وجہ سے اس کے نتائج بھی بہت کم حاصل ہو رہے تھے۔ کیوں کہ ایک تو تربیت یافتہ خواتین اساتذہ کی بہت کمی تھی اور دوسرا سکول بھی کم تھے۔ اس کے علاوہ حکومت کا روّیہ بھی اس معاملہ میں زیادہ سازگار نہیں تھا۔ ان تمام مشکلات کے باوجود کچھ تنظیمیں اور تحریکیں اس جدوجہد میں بڑھ چڑھ

کر حصہ لے رہی تھیں اور اس کے فروغ کے لیے مالی وسائل بھی فراہم کررہی تھیں۔اگرچہ ۱۸۶۶ء تا ۱۸۸۲ء کے درمیانی عرصے میں عورتوں کی تعلیمی حالت کچھ زیادہ تسلی بخش نہیں تھی مگر بیسویں صدی کے اوائل تک لوگوں میں کافی شعور پیدا ہوا اور وہ اس کی اہمیت سے آگاہ ہوئے اور انھوں نے اس کی طرف توجہ کی۔ جیسے بعض ترقی یافتہ ریاستوں میسور، بڑودہ اور ٹراونکور میں تعلیم نسواں پر خصوصی توجہ دی گی۔ اس کے علاوہ برطانوی افسران نے بھی جن علاقوں میں اس میں دلچسپی لی وہاں بہت اچھے اثرات برآمد ہوئے۔[۸]

ہندوستان میں جس وقت عورتوں کی سماجی اور تعلیمی حالت کو بہتر بنانے کی تحریک شروع ہوئی اس وقت دوسرے ممالک میں بھی عورتوں کی حالت کو بہتر بنانے کی کوششیں ہو رہی تھیں۔ ان تحریکوں کے اثرات ہندوستان کی تعلیم نسواں کی تحریک پر بھی اثر انداز ہو رہے تھے اور ان کاوشوں نے ہندوستانی تحریک کو بھی نئی سمت دی اور لوگوں نے بڑھ چڑھ کر اس میں حصّہ لینا شروع کیا۔ مختلف رسالوں اور اخباروں میں عورتوں کے حقوق کے لیے تحریریں شائع ہونے لگیں اس کے علاوہ خواتین کے جلسے اور کانفرنسیں بھی منعقد ہو نے لگیں تاکہ عورتوں میں بیداری پیدا کی جا سکے۔

جنگ آزادیٔ ۱۸۵۷ء کے بعد کا عرصہ مسلمانوں کے لیے ہر میدانِ زندگی میں بڑا کٹھن اور آزمائش کا زمانہ تھا۔ اس کے برعکس ہندو ہر میدان میں مسلمانوں سے آگے تھے۔ انھوں نے انگریزی تعلیم کی طرف توجہ کر کے انگریزوں کے خیر خواہ اور مددگار بننے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اس نازک مرحلے پر سرسید احمد خان نے ملت اسلامیہ کو تعلیم کی افادیت سے روشناس کروانے کا بیڑا اٹھایا۔ انھوں نے جب جدید تعلیمی تحریک کا آغاز کیا۔ اس سے تقریباً پچاس سال پہلے راجہ رام موہن رائے اسی قسم کی تعلیمی تحریک شروع کر چکے تھے مگر تب تعلیم کے نام پر صرف مقامی مکاتب اور مذہبی مدرسے تھے۔ لڑکوں کو اخلاقیات، مذہب اور شریعت کی ہی تعلیم دی جاتی تھی۔ مگر سرسید نے جدید انگریزی تعلیم کے فروغ کے لیے کوشش کی۔ ان دونوں مصلحین کی تعلیمی

کوششیں صرف لڑکوں کی تعلیم تک محدود تھیں۔ لڑکیوں کی تعلیم کو کسی نے کسی مصلحت کی وجہ سے نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ ان حالات میں سرسیّد احمد خان مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے میدانِ عمل میں نکلے۔ انھوں نے اپنی کاوشوں کا آغاز دو چیزوں سے کیا۔ایک تو انھوں نے اپنے رسائل (اسباب بغاوت ہند، رائل محمڈنز آف انڈیا) کے ذریعے انگریزوں کے ساتھ مسلمانوں کی وفاداری ثابت کرنے کی کوشش کی اور دوسرا مسلمانوں کو جدید تعلیم سے روشناس کرانے میں بر سر پیکار ہوئے۔ سرسید کو اس بات کا گہرا احساس تھا کہ مسلمان تعلیم کے میدان میں ہندوؤں سے بہت پیچھے ہیں اور وہ انگریزی تعلیم سے گریزاں ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ یہ وقت انگریزوں سے تصادم کا نہیں بلکہ مفاہمت کا ہے۔ اس لیے انھوں نے مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے کی جدوجہد کی اور احیائے علوم کی تحریک شروع کی۔ اس مقصد کے لیے سائنٹیفک سوسائٹی (۱۸۶۳ء) اور ایم۔اے۔ او کالج ۱۸۷۷ء کی بنیاد رکھی۔ انھوں نے برعظیم پاک و ہند میں جدید تعلیم کا آغاز کیا۔ اس مقصد کی بارآوری کے لیے رسائل "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق" جاری کیے تاکہ ان رسائل میں مختلف موضوعات پر مضامین شائع کروا کر مسلمانوں کو شعور و آگاہی دی جا سکے۔ سرسید جدید تعلیم کے زبردست حامی ہونے کے باوجود تعلیمِ نسواں کے معاملے میں قدامت پرست تھے۔ ان کا خیال تھا کہ لڑکوں کی تعلیم ہی لڑکیوں کی تعلیم کا پیش خیمہ ہے۔ لیکن ان کے دوسرے رفقا کی سعی و کوشش سے ۱۸۸۹ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے تیسرے اجلاس منعقدہ لاہور میں پہلی مرتبہ تعلیم نسواں کا مسئلہ زیرِ غور آیا۔ مختلف اجلاسوں میں بحث و تمحیص کے بعد ۱۸۹۶ء میں تعلیمِ نسواں کا ایک شعبہ قائم ہوا جس کے سیکرٹری مولوی کرامت حسین بار ایٹ تھے۔ ۱۹۰۲ء میں جب شیخ عبد اللہ اس شعبہ کے سیکرٹری ہوئے تو یہ فعال ہوا اور زنانہ مدرسے قائم ہونے لگے۔[۹] سرسید کے رفقا میں سے ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا الطاف حسین حالی ایسی شخصیات ہیں جنھوں نے خواتین میں شعور بیدار کرنے کے لیے اصلاحی ناول لکھے۔ اس علمی و ادبی تحریک کی برکات سے معاشرے کے دوسرے افراد نے بھی عورتوں کی تعلیم کے بارے میں سوچنا

شروع کیا اور خواتین کے اخبار جاری کیے ۔اس کاوش میں
مولوی ممتاز علی کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے "تہذیب
نسواں" کا اجراء کیا جس میں خواتین کے لیے خواتین نے
مضامین نگاری کی۔جہاں سے خواتین کی تعلیم و ترقی کا ایک
نیا دور شروع ہوا۔

اسی طرح تعلیم نسواں کی تحریک کو آگے بڑھانے میں
مولوی ممتاز علی کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔
انھوں نے ایک رسالہ "تہذیب نسواں" کا اجراکیا۔ وہ عورتوں
کی تعلیم و اصلاح کے بہت بڑے حامی تھے۔ ممتاز علی نے
۱۸۹۸ء میں عورتوں کے حقوق کے متعلق ایک کتاب "حقوق
نسواں" بھی تحریر کی۔" ہندوستانی خواتین میں بیداری و
اصلاح پیدا کرنے میں علامہ راشد الخیری کا نام بھی بڑا اہم
ہے۔ انھوں نے ایک رسالہ "عصمت " جاری کیا۔ اس میں زیادہ
تر ایسے مضامین شائع ہوتے تھے جن کا تعلق مذہبی تعلیم سے
تھا۔

بیسویں صدی کے اوائل میں شیخ عبد اللہ کی عملی
جدوجہد سے نہ صرف عورتوں کی تعلیم کو فروغ حاصل ہوا
بلکہ ان میں بیدار ی بھی آئی۔ وہ تعلیم نسواں کی تحریک کے
سب سے بڑے محرک تھے۔ انھوں نے خواتین کے لیے ۱۹۰۶ء میں
ایک رسالہ "خاتون" بھی جاری کیا۔ اس میں عورتوں کے لیے
مختلف موضوعات پر مضامین شائع ہوئے تھے۔ "شیخ عبد اللہ
نے علی گڑھ میں ۱۹۰۶ء میں لڑکیوں کا ایک سکول قائم کیا۔
ان تمام فلاحی کاموں میں ان کی بیوی بھی ان کے قدم بہ قدم
رہیں۔ اس اسکول کو قائم کرنے میں انھیں رجعت پسند عناصر
کی طرف سے بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن
انھوں نے تمام صعوبتوں کو بڑے حوصلہ کے ساتھ برداشت کیا۔
مگر جلد ہی انھیں اس جدوجہد میں حکمران بھوپال نواب
سلطان جہاں بیگم کی سرپرستی اور حمایت حاصل ہو گئی۔
وہ شیخ عبد اللہ کی تعلیمی کاوشوں سے بہت متاثر ہوئیں۔
کیوں کہ وہ خود بھی تعلیم نسواں میں خصوصی دلچسپی
رکھتی تھیں۔ انھوں نے ریاست بھوپال میں نہ صرف لڑکیوں کے
لیے سکول قائم کیے بلکہ خواتین کی اصلاح و بہبود کے لیے
کوششیں بھی کیں۔ نواب بیگم نے تعلیمی نظام کے لیے بہت

سے فنڈ بھی مختص کیے۔ اس طرح ہندوستان میں تعلیم نسواں کی پہلی منظم تحریک شروع ہوئی۔ا س تحریک کے پیشِ نظر شیخ عبداللہ نے "انجمن خواتین اسلام" کی بنیاد رکھی۔"[10] ہندوستان میں عورتوں کی تعلیم کے فروغ کے لیے نہ صرف اجتماعی بلکہ انفرادی سطح پر بھی کوششیں جاری تھیں۔ اس وقت مسلم بچیوں کے لیے علیحدہ سکولوں کی بہت کمی تھی کیوں کہ مسلمان اپنی لڑکیوں کو عیسائی مشنریوں کے زیرِ سایہ چلنے والے سکولوں میں بھیجنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اُنھیں تبدیلی مذہب اور بے پردگی کا خطرہ تھا۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے مسلمان رہنماؤں کی یہی کوشش رہی کہ وہ جگہ جگہ مسلمان لڑکیوں کے لیے سکولوں کا انتظام کریں تاکہ وہ اپنی مذہبی روایات کے مطابق جدید تعلیم حاصل کر سکیں۔ چنانچہ اس مقصد کے تحت بیگم بھوپال نے اپنی ریاست بھوپال کے علاوہ دیگر علاقوں میں بھی سکول قائم کیے۔ شیخ عبد اللہ نے علی گڑھ میں اور نظام حیدرآباد کی اجازت سے حیدرآباد میں سکول قائم کیے گئے۔[11] مسلمانوں کے ایک گروہ نے جہاں اپنی عملی کوششوں سے تعلیم نسواں کے فروغ کے لیے قدم اٹھایا تو وہیں دوسرے گروہ نے اپنی تحریروں کے ذریعے عورتوں کی تعلیم سے متعلق بے حسی اور بے زاری کو دور کرنے کی تحریک شروع کی۔ ان میں زیادہ تر وہ لوگ شامل تھے جو سرسیّد کی تحریک سے یا تو وابستہ تھے یا اس کے پُرزور حامی تھے۔ ان لوگوں میں حالی، شبلی، نذیر احمد، محسن الملک نمایاں ہیں۔ ان شخصیات کے علاوہ بیگم صغرا ہمایوں ، محمدی بیگم، عطیہ فیضی، نازلی بیگم، زہرا فیضی، نفیس دلہن، فاطمہ بیگم، نذر سجاد حیدر، اکبری بیگم وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ ان خواتین کے علاوہ بھی بے شمار خواتین نے اپنی تحریروں کے ذریعے ہندوستانی خواتین کی اصلاح کی اور انھیں تعلیم کی اہمیت و افادیت سے آگاہ کیا۔ تعلیمی اصلاح کی ان کوششوں کی وجہ سے ہندوستان میں تعلیم یافتہ مسلمان خواتین کا ایک گروہ پیدا ہو گیا جس نے مزید آگے چل کر تعلیم نسواں کے فروغ میں اہم خدمات انجام دیں۔ انھوں نے اپنی تحریروں سے عورتوں میں اصلاح، بیداری اور آزادی کی ایک لہر دوڑا دی۔

انگریزحکومت نے مشنری سکول قائم کیے۔ انگریزی نظام کے ہندوستانی معاشرے پر اثر انداز ہونے سے عام خواتین پر بھی تعلیم کے اثرات مرتب ہونا شروع ہوئے۔ خواتین کی تعلیم کے حوالے سے ایسا کہنا بالکل درست نہیں کہ خواتین کی ساری تعلیمی ترقی انگریز تسلط کے بعد ہوئی بلکہ مسلم فاتحین کی خواتین کے علاوہ طبقہ اشرافیہ کی خواتین بھی علمی و ادبی صلاحیت سے مالا مال تھیں ۔صرف ہندوستانی معاشرے کی عام خواتین جاگیردارانہ اور قدامت پرست نظام میں جکڑے ہونے کی وجہ سے تعلیم سے دور تھیں ۔انگریزوں کی آمد سے قبل ہندوستان میں روایتی تعلیم کا نظام تھا۔ معقولات اور منقولات کی درس گاہیں تھیں اور اسلامی علوم کے ساتھ عربی اور فارسی ادبیات کی دانش گاہیں بھی تھیں ،لیکن جدید تعلیم اور صنعت و ٹیکنالوجی کی تعلیم کا رواج نہیں تھا ۔تعلیمِ نسواں کے ادارے بھی نہیں تھے۔ خواتین کی بیداری کے آثار تو اسی وقت سے ملنے لگتے ہیں جب انگریز باقاعدہ قابض ہو کر سرگرم ہو گئے تھے۔ [۱۲]

انیسویں صدی کے اختتام تک تعلیم و بیداری نسواں کی تحریک میں شدت آگئی۔ اور پاک و ہند کے طول و عرض میں ایسے ادارہ قائم ہونے لگے جن میں لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کا باقاعدہ انتظام تھا ۔ لوگوں میں بھی شعور کی بیدار ی نے انہیں اپنی بچیوں کو مدارس بھیجنے پر اکسایا۔ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں کئی ایسے رسائل و جرائد بھی منظرِ عام پر آئے جن میں خواتین کی اصلاح و تعلیم پر زور دیا گیا تاکہ وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے معاشرے کی تعمیر اور خاندانی نظام میں فعال کردار ادا کر سکیں۔ ان تمام کوششوں کے نتیجے میں خواتین کی موجودگی سیاست، ادب اور معاشرے میں ہر جگہ نظر آنے لگی ۔ انھوں نے تحریکِ آزادی کی جدوجہد میں مردوں کے شانہ بشانہ کام کیا۔ معاشرے میں اس تبدیلی کی لہر چلنے اور تحریکِ آزادی نسواں کے تحت صنفی عدم مساوات کے خلاف خواتین میں بیداری پیدا ہوئی تو انھوں نے فرضی ناموں کا پردہ ہٹا کر براِ راست عوام سے مخاطب ہونے کی کوشش کی ۔ اس کوشش نے انھیں باعزت مقام کا احساس دلایا اور پھر آہستہ آہستہ

معاشرے اور ادب ان کی اہمیت تسلیم کرنے لگے۔ اس حوالے سے ترنم ریاض صاحبہ یوں رقم طراز ہیں:

> اردو ادب میں ادیباؤں کے کارنامے ایک پوری صدی پر محیط ہیں۔ اردو ادب کے اس سارے منظر پر نظر ڈال کر یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ادیباؤں نے اس منظرنامے کو اور بھی دل کش اور جاندار بنانے میں خاصا کردار ادا کیا ہے۔ گزشتہ ایک صدی میں خواتین ناول نگار، سفرنامہ نگار، افسانہ نگار، شاعرات،انشائیہ نگار، مزاح نگار حتیٰ کہ خاتون تنقید نگاروں نے بھی اردو ادب کی بقا میں ایک اہم حصہ ادا کیا ہے۔ [۱۳]

اردو میں سفرنامہ نگاری کی ابتدا برطانوی سامراج کے تسلط کے بعد سے ہوتی ہے۔ خاص طور پر ۱۸۰۰ء کے بعد جب برصغیر پاک و ہند کی سیاسی، تہذیبی، تعلیمی اور سماجی زندگی میں ایک زبردست تبدیلی رونما ہوئی تو اس کا نمایاں اثر ادب پر پڑا۔ اس لیے اس عہد کے شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں نے ادب کو نئے حالات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی۔ اردو سفرنامہ عربی، انگریزی اور فارسی کے توسط سے ہمارے یہاں آیا اور انگریزی زبان و ادب کے فروغ کے ساتھ ساتھ اسے بھی فروغ حاصل ہوا۔ چنانچہ سفرنامہ کا آغاز بھی اسی وقت ہوا جب ہندوستان کی تہذیبی و سیاسی زندگی میں تبدیلیاں پیدا ہو رہی تھیں۔ اس تبدیلی کے متعلق ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں:

> ملک میں پیداواری وسائل کی تبدیلی صنعتی ترقی کا فطری اور منطقی نتیجہ نہیں تھی بلکہ وہ ایک غیر ملکی سامراجی اقتدار کے زیرِ اثر مصنوعی طورپر وقوع میں آرہی تھی اور بعض حیثیتوں سے اس عہد کی اصلاحی تحریکوں کا نتیجہ تھی۔ [۱۴]

ان بدلتے ہوئے ماحول میں ادیبوں نے بھی زندگی کے تقاضے کو ایک مخصوص زاویہ سے دیکھنا شروع کیا۔ اب حقیقت پسندی کا دور شروع ہوا اور زندگی کے مصائب کا مقابلہ اپنے عمل اور ہمت سے کرنے کا شعور پیدا ہوا ۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اردو میں سفرنامے کی شروعات بھی ہندوستان میں چلنے والی اصلاحی تحریکوں کا نتیجہ ہے۔ ابتدائی دور میں

لکھے گئے سفرناموں میں ہمیں اس عہد کے سفرنامہ نگاروں کا ایک مخصوص نقطۂ نظر کا بھرپور احساس ہوتا ہے جو ان کی شخصیتوں اور ان کے خیالات و تصورات کو بے نقاب کرتا ہے۔ انھوں نے اپنے سفرناموں کے ذریعے ہی معاشرتی اصلاح کا بیڑا اٹھایا ۔ ان میں اولیت تعلیمِ نسواں کو حاصل ہے کیوں کہ تعلیم ہی اس عہد کی اولین ضرورت تھی۔ خصوصاً مسلمان عورتوں کی تعلیمی حالت اور بھی غیر تسلی بخش تھی۔ اس لیے ہندوستان کی پڑھی لکھی خواتین نے مسلمان خواتین کی تعلیمی اصلاح کے لیے اپنے اپنے طور پر جدوجہد کی۔ اس لیے ابتدائی دور کے سفرناموں میں سرسید احمد خان کی جدید تعلیم کی تحریک کے علاوہ ہندوستان کی سیاسی و سماجی اور مذہبی تحریکوں کے اثرات نظر آتے ہیں۔

گزشتہ باب میں نوآبادیاتی عہد کے اردو سفرناموں کا جائزہ ان کی موضوعاتی تقسیم، دیارِ مقدسہ، دیارِ مغرب اور اندرونِ ہندوستان کے سفر کے تحت لیا جا چکا ہے ،جس سے ان کی تاریخی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ سفرنامے ہمیں مختلف ملکوں اور شہروں کی سماجی، سیاسی، ثقافتی اور تمدنی حالات کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہیں ۔ اس کے علاوہ ان کے مطالعے سے وہاں کے جغرافیائی و تاریخی حالات اور دوسری باتوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ کوئی بھی سفرنامہ نگار کسی نہ کسی مقصد کے تحت سفر اختیار کرتا ہے۔ کوئی علمی و مذہبی مراکز کو دیکھتا ہے توکوئی سیاحت کی لذتوں سے آشنا ہونے کے لیے سفر پر روانہ ہوتا ہے۔ مقصد خواہ کوئی بھی ہو مگر ان سفرناموں میں تخلیق کار کے جذبات و احساسات اہمیت رکھتے ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ اس کا دوسروں کے بارے میں نقطۂ نظر اہم سمجھا جاتأ ان کی اہمیت کے پیشِ نظر نوآبادیاتی عہد میں بہت سے سیاحوں نے اپنے اپنے تجرباتِ میں دوسروں کو شاملِ حال کرنے کے لیے اس صنف میں طبع آزمائی کی اور اپنے مشاہدے اور حالات و واقعات کی سچی تصویر کشی کرنے کی وجہ سے ان کے سفرناموں کو اہمیت حاصل ہوئی۔ اس لیے اس باب میں ان سفرنامہ نگار خواتین کے امتیازی خصائص کا ان کے سفرناموں کے حوالے سے جائزہ لیا جائے گا۔

اس نوآبادیاتی عہد اور اردو سفرنامہ نگاری کی صنف کی اولین سفرنامہ نگار خواتین کا تہذیبی و تمدنی اور سیاسی و سماجی شعور بھی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ خود بھی ان حالات سے متاثر ہوئیں اور انھوں نے اپنے سفرناموں میں بھی انہی حالات کے تناظر میں دوسری جگہوں کا مشاہدہ کیا۔ ان خواتین میں نواب سکندر بیگم، نواب سلطان جہاں بیگم، نازلی رفیعہ سلطان، بیگم سر بلند جنگ بہادر (اختر حمید)، بیگم صغرا ہمایوں مرزا، شاہ بانو (میمونہ سلطان)، عطیہ فیضی، محمودہ عثمان حیدر اور بیگم حسرت موہانی قابلِ ذکر ہیں۔ یہ خواتین اردو سفرنامہ نگاری کی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس عہد کی طبقہ اشرافیہ کی خواتین کو تعلیم کے مواقع میسر تھے۔انہوں نے تہذیبی،سیاسی ، اورتمدنی تعلیم پرخصوصی توجہ سے اور ایسے گھرانوں سے تعلق ہو نے کی وجہ سے جو اپنے وقت کے اہل ثروت تھے، یورپی ممالک کی سیاحت کیے حجاز مقدسہ کے بھی سفر کیے۔ اب یہ تعلیم سے مزین خواتین کہیں بھی جاتیں تو وہاں کے حالات و واقعات کا مشاہدہ کرتیں اور ان کو ساتھ ساتھ لکھ لیا کرتیں ۔ساتھ ہی ان کو سلسلہ وار رسالوں میں بھی شائع کرواتیں تاکہ ہند وستان کی دوسری کم تعلیم یافتہ اور اپنے گھروں میں گھر داری کے امور انجام دینے والی خواتین بھی ان تمام معاملات سے مستفید ہو سکیں جن سے وہ خود آشنا ہو ئیں ہیں۔

بر عظیم پاک و ہند کی سیاسی، سماجی، تعلیمی اور اقتصادی تبدیلیوں کے پیش نظر جب اردو میں خواتین نے سفرنامہ نگاری شروع کی تو انھوں نے اپنے دور کے سب سے اہم ترین مسئلہ یعنی تعلیم نسواں کو نظر انداز نہیں کیا ۔ سفرنامہ کی صنف کو انہوں نے ہندوستانی عورتوں اور بالخصوص مسلمان عورتوں کی تعلیمی اور سماجی اصلاح کے لیے ایک موثر و سیلہ بنا کر پیش کیا ۔ ان ابتدائی سفر نامہ نگار خواتین نے ہندوستانی خواتین کی ذہنیت بدلنے ، ان کی نا خواندگی دور کرنے اور ان کو جدید تعلیم کی اہمیت سے روشناس کرانے میں اہم کردار ادا کیا ۔ وہ جہاں کہیں بھی گئیں انھوں نے وہاں کے نظام تعلیم، مدارس اور خواتین کی تعلیمی حا لت کا بغور جائزہ لیا اور انہیں سفرنامہ میں تحریر

کیا۔ اردو ادب کی سب سے پہلی خاتون سفرنامہ نگار نواب سکندر بیگم جس کا شمار بھوپال کی بیگمات میں سے دوسرے نمبر پر ہوتا ہے۔ انھوں نے اور اس خاندان کی دوسری خواتین نے اپنی ریاست میں عورتوں کی بہبود اور تعلیم کے لیے عملی اقدامات کیے ہیں۔ ان کی یہ خدمات کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ انھوں نے ہند میں سب سے پہلے عورتوں کے حقوق اور تعلیم کے لیے ادارے قائم کیے کیوں کہ یہ نواب خواتین خود بھی علم کی اہمیت سے واقف اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں۔انھوں نے اپنے زمانے کے مشہور علما اور باکمال اساتذہ سے تعلیم حاصل کی اور فنون سپہ گری سیکھنے، ملک داری کی تربیت و تعلیم اپنی ماں کے مقبر وزرا حکیم شہزاد مسیح، میاں کرم محمد خان اور راجہ خوشوقت رائے کی نگرانی میں حاصل کی۔[۱۵] اس لیے وہ تعلیم کی اہمیت سے بخوبی واقف تھیں۔ اس کے علاوہ وہ معاشرے کے تہذیبی و سیاسی حالات سے بھی آگاہ تھیں۔ خواتین کے لیے کی گئیں ان تمام تعلیمی کوششوں کے نتیجے میں بیسویں صدی میں بہت سی خواتین دیگر اصناف کے علاوہ سفرنامہ نگاری کی صنف میں آئیں۔ اردو ادب میں خواتین سفرنامہ نگاری کا آغاز تو انیسویں صدی کے وسط میں نواب سکندر بیگم وائی بھوپال کے سفرنامہ یادداشت تاریخ وقائع حج (۱۸۶۵ء) سے ہوا۔ البتہ یہ سفرنامہ اس وقت اشاعت کے مرحلے سے ہم کنار نہ ہو سکا ۔اس کا قلمی نسخہ رضا لائبریری رام میں موجود ہے۔ مگر۱۸۷۰ ء میں اس کو انگریزی زبان میں ولیم اچ السن و کمپنی، واٹر لو (برطانیہ) نے شائع کیا اور ملکہ وکٹوریا کی خدمت میں پیش کیا۔[۱۶] اسی انگریزی ترجمہ کو ۲۰۰۷ء میں *Princess Pilgrimage* کے نام سے آکسفورڈ پریس نے شائع کیا۔ اس لحاظ سے یہ سفرنامہ اردو ادب کا پہلا سفرنامہ شمار ہو گا۔

بیگم نواب اپنی ریاست میں بھی عورتوں کی خیرخواہ تھیں اور سفر کے دوران بھی انھوں نے عورتوں کی تعلیمی پسماندگی کا ذکر کیا ہے۔ ریاست بھوپال کی آخری خاتون حکمران نواب سلطان جہاں بیگم نے عورتوں کی فلاح و بہبود اور تعلیم کے لیے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی کیوں کہ نواب سلطان جہاں کا عہد انگریز استعماری طاقتوں کی مکمل عمل داری کا عہد ہے۔ اس دور میں انگریزوں نے برصغیر میں

ترقیاتی کاموں کا جال بچھا دیا اور خود کو ہر لحاظ سے ہندوستان اور ہندوستانی عوام کا خیرخواہ ثابت کرنے کی کوشش کی۔ بیگم سلطان جہاں کی تعلیم و تربیت پر بھی خصوصی توجہ دی گئی تھی۔ محمد امین زبیری ان کی تعلیم کے متعلق کہتے ہیں:

> نواب سکندر بیگم نے ولادت کے چند ماہ بعد ہی ہرہائی نس کی پرورش اپنی خاص نگرانی میں لی اور غذا ، سواری، مقامات ہوا خوری وغیرہ کا ایک دستور العمل بنایا اور جب تعلیم کا وقت آیا تو تعلیم کے ہر خزینے اور کلیے کو خود ہی قائم کیا۔ حتیٰ کہ تعلیم کا ضابطہ بھی خود متعین کیا۔ [۱۷]

نواب سلطان جہاں کی اردو ، فارسی، عربی اور انگریزی زبان کے لیے ملک میں سے اساتذہ منتخب کیے گئے اور اس کے ساتھ ان کو شہ سواری، نشانہ بازی کے لیے بھی باکمال تعلیم دینے والوں کے سپرد کیا گیا۔ ان کو امورِ سلطنت میں ماہر کرنے کے لیے بیگم سکندر نے اپنے تمام تجربات کی روشنی میں تربیت دی اور فرماں روا ریاست بننے کے بعد انھوں نے اپنی ریاست کا نظم و نسق ایسے احسن طریقے سے چلایا اور پورے ہندوستان میں ان کے کمالات، سخاوت اور علم پروری کی مثال دی جاتی تھی۔ برصغیر میں ۱۸۵۷ء کے بعد تعلیمِ نسواں کی تحریک دن بدن زور پکڑتی جا رہی تھی اور اس کے اثرات ہر خاص و عام پر پڑ رہے تھے ۔ عام طبقہ اپنی تہذیبی و تمدنی اور سماجی روایات سے انحراف کا حوصلہ نہ رکھنے کی وجہ سے اپنی عورتوں کو جدید تعلیم دلوانے سے ہچکچا رہا تھا۔ ان میں سے اعلیٰ طبقے کی خواتین تعلیم کے ثمرات سے فیض پا رہی تھیں۔ ان تمام صورت حال سے نواب سلطان جہاں آگاہ تھیں۔

انھوں نے اپنی اقدار و روایات کی بھی پاسداری کی اور انگریزی نظام کی بھی حمایت میں کسی طور کمی نہ چھوڑی۔ انھوں نے انگریزی و دیسی تعلیم کو باہم کر کے اپنے قائم کردہ مدرسوں میں لڑکیوں کی تعلیم کا انتظام کیا۔عورتوں کی تعلیمی اصلاح کی کوششوں میں ان کا بڑا اہم کردار رہا ہے۔ نواب بیگم کے دیگر کارناموں کے علاوہ ایک اہم ترین کارنامہ

ان کی تصانیف کی تعداد ہے۔ وہ قدیم خواتین ادیبوں میں واحد خاتون ہیں جن کی تصانیف کی تعداد ڈاکٹر رضیہ حامد کے مطابق بیالیس (۴۲) ہے۔[۱۸] ان تصانیف میں سے زیادہ تر عورتوں کے لیے تحریر کی گئی ہیں۔ ان کی عورتوں کے لیے تخلیق کی گئی کتابوں کے بارے میں محمد امین زبیری لکھتے ہیں:

> ہندوستان میں جب سے تصنیف و تالیف کا مذاق پیدا ہوا ایسی بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں جو عورتوں کی خصوصیت کے ساتھ مفید ہوں اور ان کو امورِ خانہ داری اور تربیت اولاد میں مدد دیں اور ان میں مذہبی روح پیدا کر سکیں جو ہمیشہ سے عورتوں کی خصوصیت رہی ہے۔[۱۹]

بیگم سلطان جہاں نے دیگر تصانیف کے ساتھ سفرنامے بھی تحریر کیے۔ انہوں نے ۱۳۲۱ ھ بمطابق ۲۳فروری ۱۹۰۴ء میں فریضہ حج کی ادائیگی اوراپریل ۱۹۱۱ء میں یورپ کی سیاحت کی۔[۲۰] یہ دونوں سفر ان کی شاہانہ مسافت کو بیان کرتے ہیں۔ سفرِ حج کی روداد کو انہوں نے خود روضۃ الریاحین کے نام سے قلم بند کیا اور یورپ کے سفر کے احوال انہوں نے اپنی بہو شاہ بانو سے سیاحت سلطانی کے نام سے تحریر کروائے۔ ان دونوں سفرناموں سے ایک عورت کا زاویہ نظر دکھائی دیتا ہے۔ سفرنامہ حج زیادہ تر سعودی عرب کے جغرافیائی و سماجی احوال پر مبنی ہے مگر یورپ کے سفرنامے میں برصغیر کی عورت ان کے ساتھ ساتھ جلوہ گر رہتی ہے۔ وہ یورپ کے نظامِ تعلیم اور عورتوں کی آزادی سے متاثر ہو کر اس کا اظہار سفرنامے میں بھی برملا کرتی ہیں۔

ان سفرنامہ نگاروں کے بعد نازلی رفیعہ سلطان کا نام آتا ہے۔ ان کا سفرنامہ سیرِ یورپ ان کی دل چسپ سیاحت کا خوب صورت مرقع ہے۔ ان کا سفرنامہ کسی مسلمان خاتون کا یورپ کا پہلا سفرنامہ ہے۔ انہوں نے اپنی ریاست میں لڑکیوں کی تعلیم کا اہتمام کیا اور حقوق و تعلیمِ نسواں کے لیے مختلف رسائل میں مضامین بھی تحریر کرتی رہیں۔ وہ اہلِ علم حضرات کی دل سے قدر کرتیں اور اپنی ریاست میں انہیں مدعو بھی کرتی رہیں۔ ان کے کئی دانش وروں سے تعلقات

بھی رہے جن میں علامہ شبلی نعمانی اور علامہ اقبال نمایاں ہیں۔ ڈاکٹر فرحت جہاں کہتی ہیں کہ علامہ شبلی نے اپنی سیرت النبی کی کتاب، ان کی تحریک اور رعانت سے مکمل کی۔ [۲۱]

بیگم نازلی نے اپنے سفرنامے میں یورپ کی تہذیبی و ثقافتی، سماجی و سیاسی اور تعلیمی حالات کے بارے میں لکھا ہے۔ وہ یورپی ممالک کا ہندوستانی ماحول اور حالات سے موازنہ بھی کرتی ہیں۔ مصنفہ نے ایک عورت کی نظر سے یورپ کو دیکھا اور عورتوں کے معاملات، ان کا لباس، تعلیم، آزادی، زیورات کے بارے میں بہت سی معلومات دی ہیں۔ مصنفہ ایک جگہ یورپی عورت کے متعلق لکھتی ہیں:

> یہاں کی امیر عورتیں بھی عجیب عجیب مفید کام کرتی ہیں مثلاً انھوں نے ایک مجلس قائم کی ہے جس کا مقصدیہ ہے کہ یہاں کے دیہات کے غربا کو مرغیوں کے پالنے اور انڈے جمع کرنے کا کام سکھایا جائے گا تاکہ انگلستان اپنی ضروریات کے مطابق انڈے خود پیدا کر سکے۔ اس وقت بے حد و شمار انڈے باہر سے آتے ہیں۔ خدا جانے ہر سال کتنے پونڈیا کتنے کروڑ روپیہ کے انڈے انگلستان میں باہر آکر بکتے ہیں جن کا نفع دوسرے ملکوں میں جاتا ہے۔ یہ ڈچز صاحبہ اس کوشش میں ہے کہ اس نفع کا بہت سا حصہ ملک میں ہی رہے۔ ان کی ترقی کا یہی باعث ہے کہ ہر چھوٹے بڑے کے دل میں ملک کی ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ [۲۲]

سفرنامہ میں ایک جگہ مصنفہ تعلیم کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

> باتوں کا سلسلہ تو اکثر ہندی لباس، موسیقی، تعلیم نسواں وغیرہ پر جاری رہا۔ اثنائے راہ میں عطیہ سے مادام نے جب علی گڑھ سکول کا ذکر سنا تو صدق دل سے کہنے لگیں کہ میرا شوہر اب ہے نہیں۔ اس لیے کوئی خاص علاقہ پیرس سے نہیں رکھتی ہوں۔ واسطے بہت خوشی سے میں ہندوستان آکر اس سکول کے لیے مدد کرونگی، میرے رہنے اور کھانے پینے کا بندوبست کردو گی تو کافی ہو گا۔ [۲۳]

سرسید کی علمی تحریک سے متاثر ہو کر جن لوگوں نے مسلمان عورتوں کی تعلیمی اصلاح کی کوشش کی ان میں اردو کی خواتین سفرنامہ نگاروں کا بھی حصہ ہے۔ انھوں نے جہاں عورتوں کی تعلیمی اصلاح کے لیے راستے ہموار کیا وہیں انھوں نے اپنے سفرناموں کے ذریعے ایسی معلومات بہم پہنچائیں جن سے اس دور کی عورتوں کی نصابی کتابوں کی ضرورت بھی پوری ہوئی۔ سفر کے دوران یہ خواتین جس خطے میں بھی گئیں۔انھوں نے وہاں کی تعلیمی، سماجی، ثقافتی اور اقتصادی معلومات سے اپنی ہم عصر بہنوں کو مطلع کیا۔ ان سفرنامہ نگاروں میں ایک طبقہ ایسا بھی تھا جس نے مسلمان عورتوں کو جدید تعلیم کی اہمیت سے روشناس کرانے کا بیڑا اٹھایا، کیوں کہ اس وقت اس بات کی اشد ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ جب تک عورتوں کومردوں کے مقابلے میں تعلیم یافتہ نہیں کیا جائے گا اس وقت تک برصغیر کے مسلمانوں کی ازدواجی زندگی خوش گوار نہیں ہو سکتی۔ اس وقت تک مسلمانوں کا ایک طبقہ جدید تعلیم سے آراستہ ہو چکا تھا لیکن بدقسمتی سے ان کی عورتیں جاہل تھیں۔

بیگم صغرا ہمایوں بھی اس عہد کی ایک پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ انھیں بھی ہندوستان کی عورتوں کی فلاح و بہبود سے خصوصی دل چسپی تھی۔ انھوں نے تعلیم نسواں کے لیے بڑا فعال کردار ادا کیا ہے۔ وہ برصغیرپاک و ہند کی عورتوں کو اپنے حق کے لیے منظم کرنا چاہتی تھیں اور ان تمام رسم و رواج کی مخالف تھیں جنھوں نے برصغیر کی عورتوں کی شخصیت کو تباہ کر دیا تھا۔ صغرا ہمایوں ایک ترقی پسند خاتون تھیں۔ اس لیے وہ تمام عورتوں کو آزاد اور تعلیم یافتہ دیکھنا چاہتی تھی۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے عورتوں کی کئی انجمنیں قائم کیں۔ بقول نصیر الدین ہاشمی:

> یہ انجمنیں نہ صرف حیدرآباد بلکہ مدراس اور دہلی وغیرہ شہروں میں بھی قائم کی گئیں۔ انجمن خواتین دکن کو انھوں نے ہی قائم کیا تھا اور انجمن خواتینِ اسلام کی وہ ایک عرصے تک سیکرٹری رہیں۔ ۱۹۰۶ء میں جب لیڈی ڈاکٹر زنانہ سوچل ایسوسی ایشن کی بنیاد ڈالی گئی تو وہ ان کی دست راست تھیں۔ [۲۴]

عورتوں میں شعور بیدار کرنے اور حقوقِ نسواں حاصل کرنے کی ہمت پیدا کرنے کے لیے وہ تقریریں بھی کیا کرتی تھیں۔ انھوں نے نہ صرف عورتوں بلکہ مردوں کے جلسوں میں بھی تقاریر کیں تاکہ مرد بھی عورتوں کی جہالت اور ان کی حالتِ زار سے واقف ہوں اور ان کی ترقی کے لیے وہ خود بھی اٹھ کھڑے ہوں۔

سیر و سیاحت کے علاوہ بیگم صغرا کا دوسرا محبوب مشغلہ اشاعتِ تعلیمِ نسواں تھا۔ انھوں نے اپنی تصانیف و تالیف کے ساتھ ساتھ اس کوشش کو بھی جاری رکھا۔ اس مقصد کے لیے بیگم صاحبہ نے شہروں شہروں اور قصبے و دیہات کا دورہ کیا اور عورتوں کی تعلیمی حالت کا جائزہ لیااور اس مسئلے کی پسماندگی کو دور کرنے کے سلسلے میں حکمرانِ ریاست جیسے بیگمات بھوپال اور دوسری پڑھی لکھی و باشعور خواتین سے ملاقاتیں کیں، جلسے اور سیمیناروں میں شرکت کی اور ان اجلاسوں میں اپنے مطالبات پیش کیے۔ مثال کے طور پر ان کا سفرنامہ بھوپال و آگرہ ،دہلی کے حالات کا زیادہ حصّہ ان تعلیمی کاروائیوں پر مشتمل ہے۔

صغرا ہمایوں کی تعلیم و تربیت ایک پڑھے لکھے گھرانے میں پیدا ہونے کے باوجود گھر پر ہی ہوئی تھی۔ اس زمانے میں شرفا اپنی لڑکیوں کو اسکول بھیجنا پسند نہیں کرتے تھے۔ انھیں خود بھی پڑھنے کا شوق تھا اور انھوں نے گھر پر ہی اپنی تعلیم کو جاری رکھا۔ مگر جب ان کی شادی نواب ہمایوں مرزا سے ہوئی تو انھوں نے ان کے شوق کو دیکھتے ہوئے علمی اور اصلاحی کاموں میں پوری آزادی دے دی۔ بیگم صغرا نے صحافت کے میدان میں بھی قدم رکھا اور ایک عرصے تک حیدرآباد سے نکلنے والے خواتین کے رسالے "النساء" کی مدیر بھی رہیں۔ انھیں علمی و ادبی کام کرنے کا جنون تھا۔ ان کے ادبی اور اصلاحی کارنامے ان کے جنون کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ انھوں نے عورتوں کی فلاح و بہبود کے لیے اور عورتوں سے رابطے رکھنے کے لیے اندرونِ ہند کے بہت سے سفر کیے ۔ اپنے سفر کے حالات و واقعات اور مشاہدات و تجربات سلسلے وار رسالوں (تہذیب نسواں اور عصمت) میں شائع کروائیں تاکہ برصغیر کی خواتین ان معلومات سے فائدے اٹھائیں اور اپنی آزادی کے لیے آواز بلند

کریں۔ ہندوستان کے سفرنامے یہ ہیں۔ سفرنامہ پونا مدراس، روزنامچہ سفر بھوپال و آگرہ و دہلی کے حالات، رہبر کشمیر، سیر بہار و بنگالہ۔ ان تمام اسفار میں وہ ہر دم متحرک رہیں اور مختلف جلسوں اور کانفرنسوں میں عورتوں کی نمائندگی کی۔ انھوں نے مختلف شہروں میں خواتین کی انجمنوں کی رہنمائی کے علاوہ لڑکیوں کے سکول بھی قائم کیے۔ ایک جگہ سفرنامے میں وہ عورتوں سے یوں مخاطب ہوتی ہیں کہ آپ حضرات جو سمجھدار اور پڑھی لکھی بیبیاں دلّی کی ہیں ایک انجمن قایم کرین تاکہ آپس میں اتحاد باہمی قایم ہو تبادلہ خیالات ہو اور اسی کے تحت میں اس مدرسہ کو چلائیے۔ [۲۵]

ایک اور جگہ عورتوں کی ترقی کے متعلق یوں رقم طراز ہیں:

> کانفرنس کی رائے میں بخیال ترقی دستکاری نسواں سال بھر میں تین دفعہ کم از کم ایک دفعہ ہر صوبہ کے مشہور شہر میں نمائش دستکاری نسواں ہوا کرے تاکہ ہند کی صنعت و حرفت میں بھی ترقی ہو اور اس ضمن میں کانفرنس کے مقاصد میں تکمیل میں بھی ترقی ہوتی رہے۔ [۲۶]

بیگم صغرا ہمایوں کا سب سے بڑا کارنامہ ہندوستان کی مسلمان عورتوں کو جدید علم کی روشنی سے منور کرنا اور انھیں اپنے حقوق کے لیے منظم کرنا تھا۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے نہ صرف ایک تحریک شروع کی بلکہ ان تحریکوں کی حمایت بھی کی جو ہندوستان میں اس مقصد کے لیے چلائی جا رہی تھیں۔ بیگم صغرا کا سفرنامہ یورپ بھی ہندوستان میں چلنے والی اصلاحی اور تعلیمی و سیاسی تحریکوں کے متعلق معلومات سے بھرا ہے۔ وہ یورپی ممالک کے نظامِ تعلیم اور مدارس کا جائزہ لیتی ہیں اور ایک ایسا ہی تعلیمی نظام وہ ہندوستان میں قائم کرنے کی خواہش رکھتی ہیں۔ سفرنامہ یورپ میں وہ عورتوں کی تعلیم و تربیت پر تقریر کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ہمارے زنانہ مدرسے بھی قائم کیے جائیں اور ہر مدرسہ میں دار الاقامہ بھی ہو تاکہ طالبات کی تربیت اچھی ہو اور غیر مذاہب کی لاوارث لڑکیاں مسلمان

> بنا کر یہاں رکھی جائیں۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ جس قوم کی عورتیں جاہل ہوں گی ہرگز وہ قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ [۲۷]

مصنفہ سفرنامہ یورپ میں فرانس کے تعلیمی نظام کے بارے میں لکھتی ہیں:

> میری ملاقات فرانسیسی لیڈی میڈم ڈوبرنی سے ہوئی انگریزی اچھی بول لیتی تھی۔ ان سے گفتگو رہا کرتی تھی۔ فرانس کے تعلیمی حالات جو ان سے معلوم ہوئے وہ یہ کہ پرائمری تعلیم کے عرض و طول فرانس میں ہزاروں مدرسے ہیں جن کا معیار مڈل تک سمجھنا چاہیئے۔ یہاں تک تعلیم حاصل کرنا ہر لڑکے اور لڑکی کا گورنمنٹ کی طرف سے فرض ہے اور فیس بالکل معاف ہے۔ اس کے بعد سیکنڈری تعلیم کے مدارس بھی بہت ہیں۔ [۲۸]

مصنفہ اس سفرنامے میں ہر ملک کا نظام اور تعلیم کے لیے گورنمنٹ کی کی گئی کوششوں کے بارے میں معلومات دیتی ہیں ۔بعض جگہوں پر وہ ہندوستان کی صورت حال پر کافی رنجیدہ بھی نظر آتی ہیں۔ ان کا پورا سفرنامہ کتب خانوں، کالجوں، آرٹ گیلری ، ایسٹرن و ویسٹرن کلچر ، سوسائٹی اور ہندوستان کی اصلاحی تحریکوں پر مشتمل ہے۔ سفرنامہ لکھتے ہوئے مصنفہ نے انگریزی کے الفاظ کثرت سے استعمال کیے ہیں جو ان کی تعلیم سے وابستگی کا ثبوت ہیں۔

عطیہ فیضی بھی اس عہد کی نامور خاتون ہیں۔ ان کی بھی ساری زندگی تعلیم و آزادی نسواں کے لیے جدوجہد کرتے گزری۔ وہ ایک علمی و ادبی گھرانے کی چشم وچراغ تھیں اور یہ خاندان بمبئی میں کاروباری حوالوں سے کافی شہرت رکھتا تھا۔ ان کی والدہ امیر النساء بیگم اپنے زمانے کی معروف ادیبہ و شاعرہ تھیں۔ اس کے علاوہ عطیہ فیضی کی بہنیں زہرا فیضی، نازلی رفیعہ سلطان بھی ادبی حلقوں میں کافی شہرت رکھتی تھیں اور رسالوں میں عورتوں کے مسائل پر باقاعدہ مضمون نگاری بھی کرتی رہیں۔

بیگم عطیہ فیضی کے اس عہد کے نامور سیاسی اور ادبی لوگوں سے گہرے مراسم بھی تھے اور وہ اپنے وقت کی آزاد خیال اور تعلیم یافتہ خاتون شمار ہوتی تھیں ۔ ان کی نظر عمیق اور مطالعہ وسیع تھا۔ اپنے عہد کی تحریکوں سے بھی وہ متاثر تھیں اور بڑے سے بڑے سیاسی لیڈروں کی دلیرانہ گفتگو کرتیں ۔انہیں شاعری کا بھی اچھا ذوق تھا۔ ان کو ترکی کے سلطان نے تمغۂ "شفقت نشان" سے نوازا۔ پورے ہندوستان میں یہ واحد مسلمان خاتون ہیں جنہیں اس نشان کو حاصل کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ اس کے علاوہ سماجی، اصلاحی اور خواتین کی تعلیم و ترقی میں بھی ان کا کردار نمایاں ہے۔ [۲۹]

عطیہ فیضی ۱۹۰۶ء میں برطانوی سکالرشپ پر حصولِ تعلیم کے لیے انگلستان گئیں اور وہاں ایک کالج میں داخلہ لیاَ مگر اپنی دوسری اصلاحی اور ادبی سرگرمیوں کی وجہ سے تعلیم پر توجہ نہ دے سکیں۔ ان کے سفرنامہ زمانہ تحصیل سےاس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اگرچہ بعض وجوہات کی بنا پر ان کا تعلیمی سفر نامکمل رہا مگر ان کے علمی امور، ثقافت کی معلومات اور دانشوروں کے ساتھ روابط کی وجہ سے یہ سفرنامہ کافی اہم ہے۔ وہ انگلستان میں ایک تعلیم یافتہ ہندوستانی خاتون ہونے کے ناطے انگلستان کے علمی و ادبی، ثقافتی ، میڈیا اور اہلِ سیاست کی توجہ کا مرکز بھی رہیں۔ انھوں نے یورپ کے مختلف شہروں کی سماجی، ادبی، علمی اور ثقافتی محفلوں اور اداروں کو قریب سے دیکھا ۔ ان سے خود بھی متاثر ہوئیں اور ہندوستان کی عورتوں کو بھی اس معلومات میں شریک کیا۔ ان کا یہ سفرنامہ زہرا بیگم فیضی نے مرتب کیا اور تہذیب نسواں میں شائع کرواتی رہیں، جس کی وجہ سے ہند کی گھریلو عورت کو باہر کی دنیا جاننے کا موقع ملا۔ اس عہد میں سفرنامہ اس مقصد کی تکمیل کے لیے زیادہ تر لکھے جاتے تھے کہ بیرونی دنیا کے حالات سے آگاہ ہو کر خواتین اپنی زندگیوں میں تبدیلیاں لائیں۔ سفرنامہ زمانہ تحصیل کا زیادہ حصہ عطیہ کی اپنی تعلیمی سرگرمیوں پر مبنی ہے اور وہ اسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انگلستان کی خواتین کے تعلیمی نظام پر روشنی ڈالتی ہیں:

> آج میں کہیں آئی گئی نہیں، کالج کا کام بہت تھا مثلاً نمبر ۴ اور نمبر ۵ کے کمروں کو درست حالت میں رکھنا یعنی صبح، شام کالج چھوڑنے کے پیشتر دیکھتے رہنا کہ سب کچھ وہاں پر درست ہے پھر چند کاغذ لکھ کر تیار کرنے ہوتے ہیں جس میں چند سوال دیے جاتے ہیں۔ ان کے جواب بغیر کسی کتاب دیکھنے کے دینے ہوتے ہیں گویا یہ چھوٹے چھوٹے امتحان ہیں ہر مضمون کا الگ الگ پرچہ ہوتا ہے۔[30]

اسی طرح ایک اور جگہ سفرنامے میں وہ اپنی ہندوستانی بہنوں کو لائبریری کے بارے میں معلومات یوں فراہم کرتی ہیں:

> اس عجائب خانے میں کتب خانہ ہے جہاں کتب بینی کی جگہ ہے۔ اس کمرے کی زمین موٹے ربڑ کی ہے کہ چلنے میں آواز نہ ہو۔ خاصے ہزار آدمی ایک وقت میں بیٹھ کر پڑھ سکتے ہیں مگر بناوٹ کی خوبی کا کیا بیان کروں۔ تمام میزوں کی قطار اور چوگرد دیوار جس میں پچاس ساٹھ لاکھ کتابیں موجود ہیں۔ اگر کتب بینی کا شوق ہے تو میز کے قریب بیٹھے اور کتاب کے نام کی چٹھی ایک جگہ رکھ دیجیے وہ کمرے کے ایک حصے میں جاتی ہے اور چند دقیقوں میں اپنے آپ وہ مطلوبہ کتاب چلی آتی ہے۔ کوئی کتاب ایسی نہیں جو شائع ہوئی ہو اور وہاں موجود نہ ہو۔[31]

بیگم عطیہ ہندوستان کے حالات کا موازنہ بھی کرتی ہیں اور اس کے اندر یہ آرزو ہے کہ ہندوستانی عورتیں بھی علم کی دولت سے مالا مال ہو جائیں۔ سفرنامے میں وہ ہر جگہ برطانوی معاشرت اور نظام سے خاصی متاثر نظر آتی ہیں۔ وہاں کی ایجادات ، سائنس اور صنعت کے میدان میں ترقی انہیں خاصا مرعوب کرتی ہے۔ ان تمام چیزوں کا ذکر وہ حسرت سے کرتی ہیں کہ ہندوستان بھی ایسے ہی ترقی کر جائے۔ یہ سفرنامہ اپنے دور کی اہم دستاویز ہے جس میں عورتوں کی فلاح کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی ترقی کی خواہش بھی نظر آتی ہے۔

بیگم عطیہ فیضی کی طرح نشاط النساء (بیگم حسرت موہانی) کا نام بھی اردو ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ وہ بیسویں صدی کی سیاسی و سماجی اور نسوانی تحریک کا حصہ تھیں۔نشاط النساء نے چھوٹی سی عمر میں باقاعدہ تعلیم کا آغاز کیا اور اردو، فارسی، عربی کی ممکنہ تعلیم حاصل کی۔ ان کی تمام تعلیم و تربیت زمانے کے حالات کے مطابق گھر کی چار دیواری میں ہوئی۔ اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنے قصبے کی لڑکیوں کو بھی لکھنا پڑھنا سکھاتی تھیں۔ ان کی تعلیمِ نسواں کی کوششوں کے متعلق عبد الشکور کا کہنا ہے کہ زمانے دوشیزگی میں آپ کا مشغلہ یہ تھا کہ پس ماندہ قصبے کی لڑکیوں کو لکھنا پڑھنا سیکھاتی تھیں اور آج اگر موہان میں تعلیم نسواں کی جھلک نظر آتی ہے تو محترمہ نشاط النساء کی کوشش اور مالی ایثار کا ثمرہ ہے۔[۳۲]

بیگم حسرت نے مولانا کے ساتھ فریضہ حج کی ادائیگی اور مقامات مقدسہ کی زیارت کا شرف بھی حاصل کیا اور ان مقدس مقامات کے تجربات و مشاہدات اور واقعات کو سفرنامہ حجاز اور سفرنامہ عراق کے نام سے مولانا حسرت نے سفرناموں کی شکل میں ترتیب دیا۔ نشاط النساء کا شمار بھی ان خواتین کی فہرست میں آتا ہے جنھوں نے برصغیر پاک و ہند کی مسلمان عورتوں کے اندر عصری تقاضوں کو سمجھنے کا شعور پیدا کیا اور انھیں جدید تعلیم اور برطانوی علوم و افکار کی حقیقتوں سے روشناس کرانے کے لیے عملاً اور تخلیقی میدان میں بھی کوشش کی۔ ان کے سفرناموں کا تعلیم اور بیدارئ نسواں کے حوالے سے مطالعہ کریں تو اس بات کا گہرا یقین ہوتا ہے کہ انھوں نے بھی اپنے سفرناموں کے ذریعے خواتین کی اصلاح کا فریضہ بخوبی نبھایا ہے۔ انھوں نے ہندوستانی خواتین کی دلچسپی کے تحت زیورات، ملبوسات، انواع و اقسام کے تعام کے ساتھ ان کو مختلف شہروں کی سماجی و تعلیمی صورت حال سے بھی آگاہ کیا ہے۔ بیگم حسرت اگرچہ مشرقی روایات و اقدار کی مثال تھیں مگر عورتوں کی آزادی اور تعلیم کی حامی تھیں۔ انھوں نے پسماندہ ہندوستان سے جب باہر نکل کر سرزمین عراق کی ترقی یافتہ عورتیں دیکھیں تو اس کا اظہار سفرنامہ عراق میں کرنے سے خود کو باز نہ رکھ سکیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> یہاں عیسائی اور یہودی بھی ہیں۔ مسلم اور غیرمسلم عورتوں کے پہننے کے لباس میں صرف اسی قدر فرق ہے کہ مسلمان لڑکیاں برہنہ سر اور ٹیڑھی مانگ نکالے ، فراک گون موزے پہنے پنڈلیاں کھلی نظر آتی ہیں۔ یہودی اور نصرانی عورتیں بھی بالکل اسی طرح رہتی ہیں۔ بس ورنہ صورت، شکل اور کسی بات میں فرق نہیں۔ [۳۳]

بیگم حسرت کی پوری زندگی ایثار و قربانی اور آزادیٔ کا نعرہ بلند کرتے ہوئے گزری ۔قیامِ پاکستان کی جدوجہد میں ان کا نام کسی طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ وہ ہر سفر و حضر میں مولانا کی دست راست رہیں۔ان کے سفرنامہ سے بھی ان کی جدوجہد کا پتہ چلتا ہے۔جیسےکہ وہ لکھتی ہیں، شام کو انجمن میں ایک جلسہ بھی تھا۔ خیر ہم سب عصر کے وقت دعوتوں میں چلے اور میرا ارادہ نہ تھا مگر مولانا نے کہا جلسے میں چلو تو میں بھی ساتھ ہو گئی۔ [۳۴]

تعلیم کے متعلق بھی اپنے خیالات کا اظہار کچھ یوں کرتی ہیں کہ بغداد کے باشندے سب کچھ نہ کچھ اردو بول لیتے ہیں اور مطلب تو خوب سمجھ لیتے ہیں۔ انگریزی تعلیم کا بھی انتظام ہے۔ [۳۵]

اختر حمید (بیگم سربلند جنگ بہادر) اپنے عہد کی ایک روشن خیال و تعلیم یافتہ اور روایت شکن خاتون تھیں۔ انھوں نے بیگمات بھوپال کی سرپرستی میں قائم آل انڈیا لیڈیز کانفرنس کی شمولیت اختیار کی اور برصغیر کی مسلمان عورتوں کے حقوق اور آزادیٔ کے لیے اس کانفرنس میں ریزولوشن پیش کیے۔ وہ دوسری مسلم خواتین کے ساتھ اس جدوجہد میں شامل رہیں۔ ان کی مستعدی اور فعال رکن آل انڈیا لیڈیز کانفرنس کے حوالے سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> قیصر دلہن صاحبہ نے کرسی صدارت پر ممکش ہو کر خطبہ صدارت پڑھا۔ اس کے بعد مسز سربلند جنگ بہادر صاحبہ نے ریزولوشن نمبر (۴،۵) کی تحریک کی۔ ان ریزولوشن کا منشاء یہ تھا کہ گورنمنٹ سے استدعا کی جائے کہ لیڈی ڈاکٹروں کی تعداد میں افزائش کرنے کے لیے لیڈی ڈاکٹروں کی تعلیم کا زیادہ انتظام

کیا جائے اور زنانے ہاسپٹل (شفاخانے) کی تعداد بڑھائی جائے۔[۳۶]

بیگم سربلند جنگ (اخترحمید)، ایک ایسے ماحول کی پیداوار تھیں جہاں ایک طرف تو مغربی تہذیب و تمدن کا ایک نیا سورج طلوع ہو رہا تھا تو دوسری طرف ایک قدیم تہذیب کی قدریں مٹ رہی تھیں۔ اس دوراہے پر تمام ادیب و شاعر ایک عجیب کشمکش میں مبتلا ہیں۔ وہ مشرقی تہذیب کی پیداوار اور دلدادہ ہونے کے باوجود بھی مغربی طرز و تمدن کے حامی نظر آتے ہیں۔ ان کی کوشش ہے کہ مسلمان قوم جدید تعلیم حاصل کر کے اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر لیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ہندوستان کے مرد و خواتین تمام کوشش کر رہے تھے۔ بیگم اختر حمید بھی اسی جدوجہد میں کسی سے پیچھے نہیں تھیں۔ انہوں نے عورتوں کے حقوق کے لیے تقاریر کیں جو "رسالہ تہذیب نسواں" اور "عصمت" میں شائع بھی ہوتی رہیں۔ بیگم اختر کا تعلق بھی طبقہ اشرافیہ کے نواب گھرانے سے تھا۔ وہ نواب سرور جنگ محبوب علی خان کی بیٹی تھیں جو کہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کے چیف آرکیٹکٹ تھے اور ان کی شادی بھی نواب گھرانے کے مولوی سمیع اللہ خان (سفرنامہ لندن) جو سرسید احمد خان کے قریبی دوست اور دستِ راست تھے ، ان کے بیٹے حمید اللہ خان (چیف جسٹس حیدر آباد دکن) سے ہوئی۔ جنھیں انگریزوں کی طرف سے افضل العلماء اور سربلند جنگ کے خطاب سے بھی نوازا گیا۔

بیگم اختر نے نواب حمید اللہ کے ہمراہ ۱۲ نومبر ۱۹۰۹ء کو حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنے کے ساتھ یورپ کی سیاحت بھی کی اور سفرنامہ دنیا عورت کی نظر میں تخلیق کیا۔ اس عہد کی تمام تعلیم یافتہ خواتین اس دور میں چلنے والی تحریکوں سے متاثر تھیں اور وہ جہاں کہیں بھی جاتیں وہاں کی تعلیم اور عورتوں کی سماجی حالت کا بغور مشاہدہ کرتیں اور اپنے سفرناموں میں بیان کرتیں تاکہ ہندوستانی عورتیں جو گھر کی چار دیواری کی دنیا سے ناآشنا ہیں وہ بھی دوسرے ملکوں کی خواتین کی سماجی حالت سے آشنا ہو سکیں۔ بیگم اختر بھی اسی نظریے اور مقصد کے تحت اپنے سفر کی معلومات دینے کے لیے روزنامچے تحریر کرتی رہیں۔

سفرنامے میں سے عورتوں کی زبان اور لباس کے بارے میں ملاحظہ کیجیے:

> عورتیں صرف ایک ڈریسنگ گون یا مثل نیچی فراک پہنتی ہیں۔ سر پر ایک رومال کانوں تک باندھ لیتی ہیں۔ بچوں کو وہی فراک پہناتی ہیں۔ زبان خاص عربی بولتے ہیں۔ عیسائی تک عربی بولتے ہیں بلکہ یہاں کے عیسائیوں کو انگریزی آتی بھی ہے۔ [۳۷]

ایک جگہ اسکول کے بارے میں یوں لکھتی ہیں:

> اس جگہ مشن اسکول بہت ہیں۔ بچوں کی تعلیم انگریزی، جرمن اور فرنچ زبان میں دی جاتی ہے۔ میں نے راستے میں چھوٹے چھوٹے بچوں کو علاوہ ان ہرسہ زبان کے عربی زبان بولتے خوب سُنا۔ مجکو اپنے حال پر افسوس آیا کہ عیسائی تک عربی بولتے ہیں اور میں مسلمان ہوں مگر عربی نہیں بول سکتی۔ [۳۸]

مصنفہ انگریزی زبان سے بھی خوب واقفیت رکھتی تھیں۔ انھوں نے دورانِ سفر جہاز پر انگریز خواتین سے دوستی کی اور ان کے ساتھ گفتگو کرتی رہیں۔ اسی طرح جب وہ لندن میں پرنس آف ویلز کے ہاں دعوت پر گئیں تو ان سے اسی زبان میں بات چیت کی۔ انھوں نے مغربی تہذیب و تمدن اور انگریزی تعلیم کے لیے اپنے بیٹوں کو بھی انگلستان بھیجا تھا۔ دورانِ سفر انھوں نے اپنے بیٹوں سے بھی ملاقات کی اور پرنس نے ان کے بیٹے کی انگریزی کی تعریف بھی کی۔

محمودہ عثمان حیدر نے مشاہدات بلادِ اسلامیہ کے نام سے دو حصوں میں سفرنامہ لکھا۔ مصنفہ کا تعلق ایک علمی و ادبی خانوادے سے تھا۔ وہ سید سجاد حیدر یلدرم کی حقیقی چچازاد بہن اور حکیم سید غلام حیدر کی بیٹی تھیں۔ ان کی شادی بھی خاندان میں سجاد حیدر یلدرم کے بھانجے سید عثمان حیدر سے ہوئی جو کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ایک فرم اینگلو پرشین آئل کمپنی لمیٹڈ میں ملازم تھے۔ مصنفہ کو اپنے اس مرتبے اور شان و شوکت کا احساس تھا۔ پورے سفرنامے میں اس ملازمت سے اٹھائی گئی مراعات کاخصوصی کا تذکرہ بار بار آیا ہے۔ مصنفہ بھی اپنے دور کی پڑھی لکھی خاتون تھیں اور

ان کا گھرانہ بھی علم اور فضیلت میں بڑھ کر تھا۔ ان کے پیشِ نظر بھی عورتوں کی فلاح و بہبود کا فریضہ بھی ضروری رہا اور سفرنامہ میں بھی وہ ہندوستانی عورتوں کی حالت زار پر رنجیدہ ہیں۔ ایک جگہ وہ یوں لکھتی ہیں کہ:

> ہمارے مرد بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کرتے ہیں مگر عورتوں کی یونیورسٹی صرف گھر ہی میں ناظرہ قرآن پڑھنے تک محدود ہے۔ ہزارمیں دوچار اگر کچھ پڑھی لکھی ہیں تو وہ بھی نہ ہونے کے برابر ہیں۔ وہ غیر ممالک کی نسوانی ترقی و گھر کی ہونہار لڑکیوں کو ویسا بنانے کی کوشش کریں۔ یہ ہے ہمارے ملک و قوم کی حالت جہاں غلامی و زبان بندی کے اٹل قانون پر عمل کیا جاتا ہے۔[39]

اس آزادی اور اپنے حقوق کی آواز بلند کرتے ہوئے وہ تمام بلادِ اسلامیہ کے مسلمانوں سے ایک عورت کی طرف سے دکھی فریاد یوں کرتی ہیں:

> اے بلادِ اسلامیہ میں آزادی کی زندگی بسر کرنے والو ہماری مدد کرو، ہمیں غلامی کی جکڑ بندیوں سے خدارا جلد آزاد کراؤ۔ ہم دولت نہیں مانگتے حکومت نہیں مانگتے۔ بس اپنا جائز حق مانگتے ہیں جو ہمارے اور تمھارے لیے یکساں قابلِ احترام ہے۔ ہمارے مردوں کو شمشیر سے نہیں بلکہ اپنی تحریر و تقریر سے یہ بتا دو کہ ہمارا بھی کتنا اور کیا حق ہے؟[40]

اس اقتباس سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ مصنفہ کے نزدیک عورت کی آزادی اور حق کتنی اہمیت رکھتا ہے۔ انہی ہندوستانی بہنوں کی حالت زار پر وہ افسوس کرتی ہیں۔ اس سفرنامہ میں اس عہد کے سیاسی حالات کی بھی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ کوئی بھی ادیب اپنے ماحول یا معاشرے سے کٹ کر ادب تخلیق نہیں کر سکتا۔ اس کا ادب اس کے معاشرے کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اگر ہم خواتین کے سفرناموں کا بھی جائزہ اسی تناظر میں لیں تو تمام خواتین نے اپنے عہد کے منظرنامے کو اپنے سفرناموں میں بیان کیا ہے۔ ان کے سفرکا مقصد خواہ دیارِ مقدسہ کی زیارت تھا یاعلمی سیاحت پر مبنی تھا یا ہندوستانی مقامات میں جلسے جلوس

کی کاروائیاں، ہر جگہ اِن پڑھی لکھی سفرنامہ نگار خواتین نے اپنی دوسری پسماندہ بہنوں کے حق کے لیے آواز بلند کی اور انھیں دوسری قوموں کی عورتوں کی تعلیم و ترقی اور سماجی صورت حال سے آگاہ کرنے کے لیے اپنے سفرناموں میں شعوری اور لاشعوری ان تمام باتوں کے بارے میں معلومات دیتی رہیں۔

۲۔برصغیر کی مذہبی تحریکیں اور ان کے اثرات:

برسا برس سے ہندوؤں کی صحبت میں رہنے کی وجہ سے شہنشاہ اکبر اپنی اوائل عمری سے ہی ہندوؤں کے قریب تھا۔ اس قربت کی وجہ سے انھوں نے نہ صرف ہندومت کے بہت سےعقائد و رسوم کو اپنا لیا تھا بلکہ کچھ فرائض اسلامی کو ممنوع بھی قرار دیا اور اس نے کبیّر اور گرونانک کی طرح باہمی اخوت کی پالیسی اختیار کی اور اسلام کی برتری ختم کر کے پورے ہند کو دارا لسلام سے لادینی سلطنت میں تبدیل کر دیا۔[۴۱] ایسے حالات میں حضرت مجدد الف ثانی کفر و الحاد کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ انھوں نے اور ان کے ساتھیوں نے اکبر کی حکمت عملیوں کی خلاف جن کی وجہ سے اسلام تصوف کی غیر اسلامی صورتوں کی وجہ سے ملنے لگا تھا، ان لوگوں نے جہاد کیا۔ حضرت مجدد الف ثانی اور خواجہ باقی بااللہ اس تحریک احیائے دین کے بانی تھے۔[۴۲]

بادشاہ اکبر نے بعد مغل شہزادہ دارا شکوہ بھی اکبر جیسے خیالات رکھتا تھا بلکہ لگتا کہ تھا کہ وہ اکبر سے بڑھ کر ثابت ہو گا۔ اس نے ہندومت اور اسلام کو بالکل ایک مذہب ہی سمجھا۔ جس کی وجہ سے راسخ العقیدہ لوگوں کی امیدیں اورنگ زیب سے وابستہ تھیں۔[۴۳] اورنگ زیب نے امور سلطنت سنبھالتے ہی حضرت مجدد الف ثانی کی راہ کو اختیار کیا اور سلطنت کو غیر اسلامی عناصر سے پاک رکھنے کی جدوجہد کی۔ مگر اس کی وفات کےبعد مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہوا اور نا اہل حکمرانوں کی وجہ سے ایسٹ انڈیا کمپنی اور ہندوؤں کو استحکام حاصل ہوا۔ پورا معاشرہ

انحطاط اور انتشار کا شکار ہوا۔ مسلم معاشرے نہ صرف سیاسی بلکہ اخلاقی لحاظ سے بھی کمزور سے کمزور تر ہوتا جا رہا تھا۔ ایسے حالات میں شاہ ولی اللہ نے اپنی فکری تحریک کا آغاز کیا۔ وہ ملت اسلامیہ کے عوارض سے آشنا تھے اور ان کے ذہن میں اسلام کا عملی تصور موجود تھا۔ سب سے پہلے تو وہ مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کو تباہی سے بچانا چاہتے تھے تاکہ ملک میں امن و امان قائم ہو اور پھر سیاسی و سماجی، مذہبی و ثقافتی اصطلاحات کا انقلاب برپا کیا جا سکے۔ ان کی یہ کوشش امرائے سلطنت کو سنبھالنے اور احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان بلانے کی صورت میں دیکھی جا سکتی ہیں۔[۴۴] یہ اور بات ہے کہ کاہل اور کوتاہ بین مغل حکمرانوں نے ان حالات سے فائدہ نہیں اٹھایا جنھیں شاہ ولی اللہ نے پیدا کیا تھا۔ لیکن پھر بھی انھوں نے لوگوں میں جو شعور بیدار کر دیا تھا اس سے بعد میں آنے والے مجاہدین و مصلحین شاہ عبد العزیز، سید احمد شہید ، شاہ اسمٰعیل شہید، حاجی شریعت اللہ، تیتو میر آزادی کی جدوجہد میں مصروف رہے۔ اس تحریک سے وابستہ مجاہدین اسلام نے تحریک قیامِ پاکستان تک کفر کے خلاف جہاد کیا۔

حاجی شریعت اللہ نے اصلاح دین کی خاطرفرائضی تحریک شروع کی۔ اس کا دور تحریکِ مجاہدین کے ساتھ ساتھ ہے۔ اس تحریک کا اہم مقصد ان رسوم و عقائد کی اصلاح کرنا تھا جنھیں مسلمانوں نے غیر مسلموں سے روابط کے باعث اختیار کر لیا تھا۔ اس تحریک نے مسلمانوں کو اسلام کی حقیقی تعلیمات کی جانب متوجہ کرایا۔ فرائض کی پابندی اور بجاآور پر زور دیا ۔ وہ تمام رسومات اور تقریبات جس کی سند قرآن و سنت سے نہ ملتی تھی بدعت قرار دے کر ترک کرنے کی تلقین کی۔ بہت جلد اس تحریک نے بنگال کے ایک وسیع علاقے میں اپنے لاتعداد کی ایک اچھی خاصی جماعت تیار کر لی جو اسلام کے عقائد کردہ فرائض کی تکمیل کو مقدم سمجھتے اور اس لیے وہ فرائضی کہلاتے۔[۴۵] یہ تحریک اپنی نوعیت کے اعتبار سے اسلامی ہونے کی وجہ سے عام مسلمانوں میں بہت مقبول ہوئی۔ اس کی مقبولیت کے بعد اس میں ایسی تعلیمات شامل ہو گئیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریک کے مقاصد سیاسی بھی تھے۔ حاجی شریعت اللہ نے یہ فتویٰ دیا تھا

کہ بنگال اب دارلاسلام نہیں رہا، اس لیے عیدین اور جمعہ کی نماز باجماعت اب یہ طریق مناسب نہیں ہو سکتی۔ اس فتوئ سے حاجی صاحب کا مقصد اپنے پیروؤں اور عام مسلمانوں میں برطانوی حکومت کے خلاف جذبات پیدا کرنا تھا۔ ۱۸۴۰ء میں حاجی صاحب کے انتقال کے بعد اس کی قیادت آپ کے صاحب زادے محمد حسن دو دو میاں کے سپرد ہوئی انہوں نے اس تحریک کو باقاعدہ منظم، سرگرم اور فعال سیاسی طاقت اور سماجی تبدیلیوں کی محرک و آئینہ دار بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔[۴۶]

اسی طرح تیتو میر کی تحریک نے انیسویں صدی کے وسط میں بنگال کے مسلمانوں کو کافی متحرک رکھا۔ لوگوں میں جوش و جذبہ کو بیدار کیا اور انهیں انگریزوں کے خلاف نبرد آزما کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا اور یہ فرائضی تحریک ایک ہی عہد کی پیداوار ہیں۔ تیتو میر تحریک کا آغاز بھی مذہبی اصلاح کی خاطر ہوا اور پھر بھی بعد میں سیاسی تحریک بن گئی۔ اس نے برطانوی تسلّط کے خلاف اور دوبارہ اسلامی حکومت کے قیام کے لیے آواز بلند کی۔ تیتو میر تحریک کے پیروؤں نے اسلامی تعلیمات اور مقاصد کو بنگالی مسلمانوں میں آزادی حاصل کرنے تک جاری رکھا۔[۴۷]

۳۔سیاسی و سماجی تحریکیں:

بنگال پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی مکمل اجارہ داری کے بعد ہندوؤں نے انگریزوں کے ساتھ تعاون کیا اور ہر طرح کی مراعات حاصل کیں۔ ان دونوں کے باہمی اشتراک نے مسلمانوں کے تمام طبقات کو متاثر کیا۔ بنگال کے مختلف طبقوں میں انگریزی حکمت عملی نے مختلف اثرات مرتب کیے۔ ہندوؤں میں مسلمانوں کی نسبت انگریزی تعلیم سے دل چسپی کا رجحان پایا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے وہ مسلمانوں سے آگے تھے۔ بنگال میں باضابطہ انگریزی مدارس کے قیام سے پہلے بنارس (ہندو قومیت کے احساس پر مبنی) ۱۷۹۱ء میں سنسکرت کالج قائم ہو چکا تھا۔ اس کالج کا مقصد ہندوؤں کے قوانین، علم و ادب کی ترقی اور ہندو مذہب کی تعلیم قرار دیا

گیا تھا۔[۵۸] اس دور میں ہندوؤں کی سرگرمیوں کا محور صرف تعلیم تھا۔ انگریزی تعلیم کے لیے ہندو مصلحین نے ۱۸۱۶ء میں سرکاری امداد کے بغیر ہی ایک ہندو کالج کی بنیاد رکھی اور چیف جسٹس ایڈورڈ ہائڈاسٹ نے اس کالج کی تعمیر کے لیے بہت مدد کی۔ اس کالج کے لیے منظور شدہ تین زبانیں انگریزی، فارسی، بنگالی تھی مگر سب سے زیادہ زور انگریزی پر دیا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کالج میں قدیم ہندو مذہبی نظریات کا پرچار بھی کیا جاتا تھا۔ اس طرح ایک اور ادارہ گودو دھن آورتے نے ۱۸۲۳ء میں "اورینٹل سمیزی" کے نام سے قائم کیا ۔ اسی سلسلہ کی ایک اور کاوش راجہ رام موہن رائے نے دردیدانتا کالج کی صورت میں کی۔ جس میں بھی قدیم مذہبی علوم کے ساتھ ساتھ انگریزی تعلیم کا بھی بنددوبست کیا گیا تھا۔ [۵۹]

مقامی زبانوں اور انگریزی تعلیم کے درمیان کوئی تناسب برقرار نہ رہنے کی وجہ سے تعلیمی حلقوں میں بےچینی اور فاصلے پید اہو گئے ۔ اس دور میں مسلمان انگریزوں سے سیاسی اور مذہبی اعتبار سے مفاہمت پر آمادہ نہ ہوئے اور وہ انگریزی سے بھی دور رہے۔ انھوں نے فارسی اور اردو کو اپنے لیے کافی سمجھا اور اپنی تہذیب و ثقافت سے دور نہ ہوئے۔ ان کے برعکس ہندوؤں نے انگریزی حکومت اور تعلیم کا خیر مقدم کیا۔ اس طرح وہ تمام شعبۂ ہائے زندگی پر چھا گئے۔ انگریزی تعلیم سے جو ہندو فیض یاب ہوئے۔ انھوں نے اپنے مذہب کے احیاء اور اس کی اصلاء اور اس کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ راجہ رام موہن وہ پہلے رہنما ہیں جنھوں نے اپنے مذہب کی اصلاح کے لیے "برہمو سماج" کے نام سے ایک تحریک کا آغاز کیا۔ یہ پہلی اصلاحی تحریک تھی جس نے ہندو مت کے احیاء اور اصلاح کے علاوہ انگریزی تہذیب کے بڑھتے ہوئے اثرات سے اپنے عقائد کو سہارا دینا تھا۔[۶۰] رام موہن کے بعد "برہمو سماج" کی ذمہ داری دوندر ناتھ ٹیگور نے اٹھائی۔ اس کے ساتھ ہی ٹیگور نے ۱۸۳۹ء میں ایک علیحدہ "انجمن تبلیغ حق" قائم کی جس کے مقاصد بھی برہمو سماج سے ملتے جلتے تھے۔ برہمو سماج کو بعد میں کیٹسب چندر سین نے چلایا۔ مگر ۱۸۶۵ء میں اس جماعت میں تفرقہ پیدا ہو گیا اور اسی انداز

کی کئی تحریکیں اور انجمنیں مثلاً مدنا پور، کرشن نگر اور ڈھاکہ سماجین پیدا ہو گئیں۔[61]

ہندوستان کی تاریخ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان کبھی اتحاد نہ ہوا اور وہ کسی نہ کسی مسلہ پر ایک دوسرے سے بدظن رہے۔ ایسے حالات میں انگریزوں کے لیے یہ قطعی شکل نہ تھا کہ ہندوؤں کے ذہن میں مسلمانوں کے خلاف سازشی عناصر کو ہوا دے کر اپنے مقاصد کی تکمیل کرنا۔ لہذا انہوں نے ہندوستان پر اپنا تسلط قائم رکھنے کی غرض بار ہا ایسی کوششیں کیں۔ انگریزوں نے ہندوستان کے بڑے طبقے ہندوؤں کو تعلیمی میدان اور سماجی انجمنوں کی تشکیل میں امداد فراہم کر کے انہیں برتری کا احساس دلایا اور ١٨٥٧ء تک نہ صرف ہندو اور سکھ بلکہ یورپی اقوام بھی مسلمانوں کے خلاف ہو گئیں تھیں۔ ہندوؤں نے انگریزوں کی حمایت حاصل کر کے مسلمانوں کے خلاف ہر طرح کا پروپیگنڈا کرنے کی کوئی کسر نہ چھوڑی۔ پھر رہی سہی کسر ان غیر مسلم انجمنوں اور تحریکوں نے پوری کر دی جو انہوں نے ایسے مذہبی احیاء کے نام پر قائم کیں۔

ان تحریکوں میں قومی و سیاسی رہنما بہت مستعد و فعال ہوئے۔ "انہوں نے اس کے ذریعے ہندوؤں میں قومی جذبہ حب الوطنی اور اپنے مذہب کی ترویج کی۔ اس سلسلے میں "آریہ سماج" نے بہت کام کیے۔ اس کا بانی دیانند سرسوتی مسلمانوں کا شدید ترین دشمن تھا۔ اس تحریک سے ہندو قومیت کو بڑی تقویت ملی۔ ہندوؤں کا مقصد ایک ہندوستانی قوم کی تشکیل اور ایک مشترکہ مذہب اور تہذیب کی بنیاد پر۔ اس لیے ان کا خاص منصوبہ "شدھی" تھا۔ یہ لوگ برملا کہتے تھے کہ ایک دن انگریز اور مسلمانوں سے بدلہ لیں گے۔ یہ لوگ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان ہندوستان میں رہیں اور انہوں نے مسلمانوں کی جتنی مخالفت کی، کسی اور جماعت نے نہیں کی۔ انیسویں صدی کے اواخر تک ہندوستان میں اسی طرز کی ہندوؤں کی تحریکیں اور جماعتیں قائم ہوئیں۔[62]

جنگ آزادی ١٨٥٧ء کے بعد مسلمانوں کے لیےحالات بڑے خراب تھے۔ وہ اپنے سیاسی زوال، دشمنوں کی معاندانہ

سرگرمیاں اور معاشرتی ابتری کی وجہ سے ہر طرف سے مشکلات کا شکار تھے۔ لیکن ان تمام نامساعد حالات کے باوجود بھی وہ مطمئن اور خاموش نہ بیٹھ سکے۔ اس جنگ کی ناکامی کے بعد مسلمانوں میں طرزِ فکر کے اعتبار سے دو گروہ بن گئے۔ ان میں سے ایک گروہ اپنے قدیم طرزِ زندگی اور فکر پر قائم تھا اور یہ انگریز کی ہر چیز سے متنفر تھے۔ مگر دوسرا گروہ اس کے برعکس تھا کیوں کہ انھوں نے انگریزی تہذیب کے اثرات اور ہندوؤں کا جدید مغربی نظام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کے ثمرات دیکھ لیے تھے۔[51] ان لوگوں نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ ان کی موجودہ پستی اور ناکامی کی اصل وجہ انگریزوں سے عداوت اور دشمنی ہے۔ انھیں اپنے اختلافات کے باوجود اپنے رویّہ پر نظرثانی کرنی چاہیے اور زمانہ کی چال کا ساتھ دیتے ہوئے انھیں انگریزی حکومت میں ملازمتیں ملیں اور وہ ذلت کی زندگی سے نکل سکیں۔ ان لوگوں نے اپنی دور اندیشی اور مصلحت بینی سے مسلمانوں کے لیے عافیت کا راستہ جدید نظام کو اپنا لینے میں سمجھا۔ اس گروہ نے روایت پرستی اور مراجعت پسندی کے ساتھ ساتھ ترقی پسندی کو زیادہ اہم جانا اور انگریزی تعلیم و جدید نظریات کے حصول کو مسلمانوں کے لیے ضروری قرار دیا۔ اس طرح کے طرزِ فکر کی ایک ہمہ گیر تحریک جس نے ہندوستان کے متوسط اور اونچے طبقہ کے مسلمانوں کو متاثر کیا اور انھیں اپنے حلقہ میں لے کر ان میں ایک انقلاب برپا کر دیا وہ سرسید احمد خان کی علی گڑھ تحریک تھی۔[52] اس تحریک نے برصغیر کے مسلمانوں کے لیے عملاً اور قولاً ایسے اقدامات کیے کہ جس کے ثمرات قیامِ پاکستان کی صورت میں ظاہر ہوئے۔

ہندوستان میں ہندوؤں نے ابتدا سے ہی انگریزی تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی تھی اور تعلیم کے پیدا کردہ شعور کی وجہ سے ان میں مختلف اصلاحی، مذہبی تحریکوں قائم کرنے کا رجحان پیدا ہوا۔ جس نے ہندوؤں میں "ہندو قومیت کے احیاً" کا جذبہ شدید تر کر دیا اور ان کے عمل و فکر کا رخ صرف ہندو فرقہ پروری کی جانب مائل ہو گیا تھا۔ "انیسویں صدی کے آخر تک ہندوؤں نے قومیت، وطنیت اور مغربی جمہوریت کے تصورات اخذ کر لیے تھے۔ اس لیے ان میں یہ سوچ بیدار ہوئی کہ وہ بھی ہندوستان میں اپنے لیے ایک

باقاعدہ تحریک چلائیں اور انگریزوں کی سرپرستی میں جمہوری قومی حکومت کا مطالبہ کریں اور ہندوستان میں وہ اکثریت کی تعداد میں ہیں اس لیے ان کو کوئی حیثیت دیں۔[۴۸]

۱۸۶۱ء کی انڈین کونسل کی معرفت غیر سرکاری اراکین کی نامزدگی ۱۸۰۷ء سے انڈین سول سروس میں ہندوؤں کی کامیابی اور اعلیٰ عہدوں کا حصول اور ۱۸۶۲ء کی اصطلاحات کی رو سے انتخابات کے ذریعے ہندوستانی اراکین کا انتخاب، ایسے اقدامات تھے جن سے ان کے طرزِ فکر کو تقویت مل رہی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سیاسی طور پر ایک ایسا ہی سیاسی فکر و تصور ہندوؤں میں ابھر رہا تھا جس کی اساس قومیت، وطنیت اور جمہوریت کے نظریہ حیات پر تھی اور جو قطعی طور پر مغرب سے مستعارتھا۔ اس صورت حال کو جب انگریزوں نے دیکھا کہ ہندوستان میں انگریزی تعلیم اور سیاسی نظریات سے ہندوستانی قومیت کی تشکیل ہو رہی ہے۔ تو انھوں نے خود ہی یہ کوشش کی کہ ہندوستان میں انگریزی تعلیم اور سیاسی نظریات سے ہندوستانی قومیت کی تشکیل کی کوئی ایسی قوتی و سیاسی جماعت قائم ہو مگر وہ جماعت برطانوی حکومت کے ماتحت اور زیرِ سایہ ہو۔ ہندوستان میں پہلے بھی مختلف علاقوں میں ہندو تنظیمیں اور انجمنیں وجود میں آچکی تھیں اور البرٹ بل کی ناکامی سے ان میں کافی ہلچل پیدا ہو گئی تھی کیوں کہ اس بل کو ناکام بنانے میں انگریزوں نے جو کوششیں کیں تھیں۔ ان کو ہندوستانیوں نے بڑی حد تک محسوس کر لیا تھا۔ انگریزوں کو ہندوستانیوں کی بڑھتی ہوئی بے چینی سے یہ خطرہ پیدا ہوا کہ یہ صورت حال کوئی سنجیدہ صورت اختیار نہ کر لے۔ اس لیے اے۔او۔ہیوم نے انگریزی تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو ایک قومی و سیاسی جماعت قائم کرنے کا مشورہ دیا اور اس طرح ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگرس وجود میں آئی۔[۴۹] اس جماعت کی قیادت اور نگرانی کافی عرصہ تک انگریزوں کے ہاتھ میں رہی اور سر ولییم ویڈر برن دو مرتبہ اور ڈیوڈ یول، ڈبلیو ایس گین، چارلس بریڈیو، سیموئیل اسمتھ اور ڈاکٹر کلارک ایک ایک بار اس کے صدر مقرر ہوئے۔ کانگرس کے اجلاس میں شرکت کے لیے عہدہ داران انگلستان سے خصوصی طور پر آتے تھے۔ یہ کانگرس جماعت حکومت برطانیہ کے اس

قدر قریب تھی کہ ابتدا میں اے۔او۔ہیوم نے کافی کوشش کی
کہ گورنر اس جماعت کی صدارت کیا کریں۔[۵۰] اس بات سے
اندازہ ہوتا ہے کہ اس جماعت کوقائم کرنے سے انگریزوں کا
اصل مقصد کیا تھا اور سلطنت برطانیہ سے مکمل وفاداری اس
کی بنیاد تھی۔

مسلمانوں میں سرسید احمد خان وہ پہلے شخص تھے کہ
جنھوں نے کانگرس کے مقصد کو صحیح طور پر سمجھا تھا اور
کانگرس کے خلاف ان کے دیئے گئے بیانات کو ہندوستان کے
مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کا نصب العین قرار دیا جا سکتا
ہے۔ یہ بیانات انھوں نے دسمبر ۱۹۸۷ء کو لکھنؤ میں اور ۲
مارچ ۱۸۸۸ء میں میرٹھ سے دیے تھے۔[۵۳] سرسید احمد خان کے
بیانات کو ۱۸۹۲ء کے آئین کے جواب میں مسلمانوں کا نقطہ
نظر سمجھنا چاہیے اور اس آئین کو ۱۸۶۱ء کے آئین کی ترمیم
کہا جا سکتا ہے۔ اس آئین کی رو سے مرکزی اور صوبائی
کونسلوں کی رکنیت کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ اس کے تحت
۱۸۹۳ء میں انتخابات ہوئے اور انتخابی حلقے مخلوط تھے۔ ان
انتخابات میں مسلمان نمائندوں کو شدید ناکامی اٹھانا پڑی۔
اس سے پہلے میونسپل اور ڈسٹرکٹ کونسل کے انتخابات میں
بھی مسلمانوں کے ساتھ ایسا ہو چکا تھا مگر ہندوؤں نے اس
طریقہ کار کو بخوشی قبول کر لیا۔ اس تمام صورت حال سے
مسلمانوں کو خطرہ محسوس ہوا کیوں کہ وہ اقلیت میں
تھے۔ انھوں نے اپنے تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے جداگانہ
انتخابات اور علیحدہ نشتوں کا مطالبہ کر دیا۔[۵۴]

ہندوؤں کی مختلف سیاسی تحریکوں اور جماعتوں کے
جواب میں یہ بات بہت ضروری تھی کہ سرسید احمد خان بھی
مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے ایک مسلم جماعت
"محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن آف اپر انڈیا" کی تنظیم کرتے۔
ان کے تصورات یہ کہ (۱) ہندوستان ایک ملک نہیں بلکہ
برعظیم ہے۔ (۲) ہندو اور مسلمان ایک نہیں، دو الگ الگ
قومیں ہیں۔ (۳) علیحدگی بہرحال لازمی ہے۔ (۴) ایک
اکثریت ووٹ سے قائم کردہ نظامِ حکومت میں نہ مدغم ہو
سکتے ہیں نہ انھیں کہا جانا چاہیے۔ یہ مطالبہ پاکستان کی
بنیادیں استوار کرتے ہیں۔[۵۵]

یہ ایک حقیقت ہے کہ سرسید کی تحریک مسلمانوں میں قومیت کا احساس پیدا کرنے کا سبب بنی ہے۔ اس تحریک نے نہ صرف ہندوستان میں ایک متحدہ مسلم قومیت کے خیال کو زندہ رکھا بلکہ آگے چل کر تحریک آزادی میں جان ڈالی اور دوسرا وفادار اور جان نثار رہنما بھی ا س تحریک کو دئیے۔

حکومت برطانیہ کچھ عرصے سے اس سوچ و بچار میں تھی کہ بنگال کی جس میں مشرقی و مغربی بنگال، اڑیسہ اور بہار کی ریاستیں شامل تھیں۔ اس کو از سرِ نو تقسیم کر دیے۔ اس تقسیم کے منصوبہ کا اعلان ۱۹۰۳ء کے آخر میں کیا گیا اور پھر ۱۹۰۵ء میں اس کو نافذ کردیا گیا۔ اس تقسیم کا ایک اتفاق یہ ہوا کہ آسام اور مشرقی بنگال نے صوبہ میں مسلمان اکثریت میں تھے اور مسلمانوں نے اس تقسیم کا خیر مقدم کیا۔ نواب سلیم اللہ خان اور ان کے ساتھیوں نے یہ فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کے سیاسی امور کی ترجمانی کے لیے ایک الگ جماعت ہونی چاہیے چناں چہ محمڈن پراونشل یونین قائم کی گئی۔ [56]

مسلمانوں کے برعکس ہندوؤں نے اس تقسیم بنگال کے خلاف بہت زیادہ اشتعال کا مظاہرہ کیا اور کانگرس جماعات نے ہر سطح پر اس کی مخالفت کی۔ جب مسلمانوں کو اس بات کا پتہ چلا کہ حکومت برطانیہ ۱۸۹۲ء اور ۱۹۰۴ء کے بعد نئی اصطلاحات کرنا چاہتی ہے۔ جو مجالس مقنّنہ میں توسیع اور انتخابات کے میدان کو وسیع کرنا چاہتا ہے۔ تو مسلمانوں نے اپنے تحفظ کے لیے اپنا ایک وفد بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ اس وفد نے یہ مطالبہ کیا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو صرف ایک اقلیت نہ سمجھا جائے بلکہ ان کے حقوق اور ذمہ داری کا تحفظ کیا جائے۔ مسلمانوں نے تنسیخ بنگال کے فیصلے کے بعد محسوس کیا کہ کانگرس صرف اپنے مفادات کا تحفظ کر رہی ہے۔ اور مسلمانوں کو اپنے مفادات اور تشخص کی حفاظت کے لے ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے۔ جو تمام مسلمانوں کی نمائندگی کر سکے اور بالآخر ۱۹۰۶ء میں سلیم اللہ خان کی دعوت پر برصغیر کے مسلمانوں کے اجتماع نے مسلم لیگ کی بنیاد رکھی۔ [57]

پہلی جنگِ عظیم (۱۹۱۴ء) میں ترکی کا ممالک وسطیٰ سے اتحاد پر مسلمان ہند میں بڑی بے چینی پھیل گئی۔ سلطنت عثمانیہ کے بہت سے علاقے ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۶ء تک مغربی طاقتوں کے قبضے میں آچکے تھے۔ برصغیر پاک وہند کے مسلمان مغربی شہنشاہیت کی اسلامی ممالک میں مچائی گئی تباہی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ مسلم اُمہ کی سیاسی قوت کا آخری قلعہ سلطنت عثمانیہ تھی جو اپنے دشمنوں کے نرغے میں پھنسی ہوئی تھی۔ برصغیر کے مسلمانوں کو سلطنت عثمانیہ سے کافی ڈھارس تھی۔ یہ لوگ خود بے شک اپنے سیاسی حقوق کھو چکے تھے مگر سلطنت عثمانیہ سے انھیں یہ تسلی ملتی تھی کہ ایک آزاد اسلامی مملکت موجود ہے جسے خلافت کا خرچ طلب بار اٹھانے کا امتیاز بھی حاصل ہے۔[۶۳] چناں چہ مسلمانوں کے جذبات شدت سے ترکی کے حق میں تھے جو ایک طویل عرصے تک اتحاد اسلامی کا خواب دیکھ رہا تھا۔

ترکی میں پے درپے جو واقعات رونما ہوئے وہ مسلمانوں کے لیے مایوس کن اوردرد ناک تھے۔ انگریزوں نے قسطنطنیہ پر ظالمانہ قبضہ، موصل پر جارحانہ اقدامات اور پھر ترکوں پر ۱۹۲۰ء میں معاہدہ سینورے عائد کیا گیا جس نے سلطنت عثمانیہ کو ختم کر کے ترکی کومختلف حصوں میں تقسیم کر دیا۔[۶۴] سلطنت عثمانیہ کے مسلمانوں کے جذبات کو اس قدر مشتعل کیا کہ اس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ لوگ تقریباً دوصدیوں سے انگریزوں کی محکومی میں تھے اور ان کی سیاسی چال بازیوں اور مصائب سے آگاہ تھے۔ مگر ترکی کے معاملے میں وعدہ خلافی پر، ان کے سارے جذبات ایک تحریک کی صورت میں بہہ نکلے۔ جس تحریک نے برصغیر میں دوسری تمام تحریکوں سے بڑھ کر حکومت برطانیہ کو متزلزل کر دیا وہ تحریک خلافت تھی۔[۶۵] مسلمانوں نے اس تحریک میں حصہ تمام نتائج سے بے نیاز اور مصائب و آرام سے بے پروا ہو کر لیا۔

پہلی جنگ عظیم کے اختتام پرحکومت برطانیہ نے یہ اعلان کیاتھا کہ جنگ کے دوران ہندوستان کے لوگوں کی وفاددری کے صلے میں انھیں حکومت میں زیادہ حصہ دیا جائے گا۔ مگر

انھوں نے اپنے اس فیصلے کے برعکس "رولٹ ایکٹ" نافذ کر دیا۔ اس ایکٹ میں حکومت کو یہ اختیار دیا تھا کہ جن لوگوں پر دہشت گرد سرگرمیوں میں حصہ لینے کا شبہ ہو ان کو بغیر کسی عدالتی کاروائی کے قید کر دیا جائے گا۔[۶۶] یہ قانون ہندوستانیوں کی سخت مخالفت کے باوجود ۱۹۱۹ء میں منظور ہو گیا۔ جس کے نتیجے میں گاندھی جی نے "سینہ گرہ" کی مہم شروع کی۔

اس کے علاوہ امرتسر میں مسلم لیگ ، کانگرس اور خلافت کانفرنس کے بیک وقت سالانہ اجلاس منعقد ہوئے۔ اس اجلاس میں مسلمان اور ہندو رہنماؤں کے درمیان ایک مفاہمت ہوئی جس نے ہندوستانیوں کو اس قابل بنا دیا کہ وہ سلطنت برطانیہ کے خلاف ایک تحریک منظم کر سکیں۔ اگست ۱۹۲۰ء میں برطانوی حکومت سے عدم تعاون کا ایک منصوبہ تیار کیا گیا اور کانگرس کے اجلاس میں اس کی قرارداد متفقہ منظور ہوتی۔ اس میں تمام ہندوستانیوں کو یہ مشورہ دیا گیا کہ وہ برطانوی حکومت کے عطا کردہ تمام اعزازی عہدے اور خطاب واپس کر دیں۔ اس کے ساتھ ہی سرکاری اورنیم سرکاری تقریبات میں شرکت سے بھی انکار کریں۔[۶۷] برطانوی عدالتوں، ان کے انتخابات مجالس مقننّہ اور غیر ملکی مال کا بائیکاٹ کیا جائے۔ تمام تعلیمی ادارے جن کو حکومت چلاتی ہے۔ یا ان کی امداد کرتی ہے ان تعلیمی اداروں سے طلبہ کو ہٹا لیا جائے۔ اس تحریک کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی اور مسلمانوں نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

بیسویں صدی کے شروع میں ہی برعظیم کی سیاست میں اہم تبدیلیاں ہوئیں جو بلاشبہ ہندوستان کی سیاست پر اثرانداز ہوتی ہے جو اردو ہندی تنازعہ، مسلم لیگ کا قیام، بنگال کی تقسیم اور پھر سودیشی تحریک شامل ہیں۔ اس تحریک کامقصد یہ تھا کہ اہل ہندوستان کو صرف ہندوستانی مصنوعات ہی استعمال کرنی چاہیے۔ اس طرح ہندوستانی تجارت اور صنعتی ترقی ہو سکتی ہے اور مزدوروں و غریبوں کا معیارِ زندگی بہتر ہو سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں برصغیر کے لوگوں نے بیسویں صدی کی ابتدا میں ہی سوچنا شروع کر دیا تھا۔[۶۸] رسائل و اخبارات میں اس تحریک سے متعلق قومی

وسیاسی رہنما اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگے تھے۔ مولانا حسرت موہانی پہلے شخص تھے جنھوں نے سودیشی تحریک میں عملاً حصہ لیا اور اس کی قیادت کی۔ انھوں نے سودیشی کپڑوں کی دکان "سودیشی اسٹور" کے نام سے کھولی اور ملک میں اس طرح کی جا بجاشاخیں قائم کرنے کے بارے میں چاہا۔ اس تحریک میں مولانا شبلی اور نواب وقار الملک نے بھی مدد کی۔[۶۹]

۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگال کی تنسیخ اور اس کے بعد رونما ہونے والے واقعات نے مسلمانوں کو پہلے سے زیادہ سیاست میں ملوث کردیا تھا۔ اب وہ اپنے حالات کے علاوہ ان حادثات سے بھی متاثر ہو رہے تھے جو بلادِ اسلامیہ کو پیش آرہے تھے۔ مغربی استعماری طاقتیں ہر جگہ مسلمانوں کا استحصال کر رہی تھیں اور ان کی سیاسی سازشیں ظاہر ہو رہی تھیں۔ ان حالات میں برصغیر کے مسلمان اب بیدار ہو کر عملی سیاست میں حصہ لے رہے تھے۔ان کوششوں میں مولانا ظفر علی خان، مولانا ابو الکلام آزاد اور مولانا محمد علی جوہر کی خدمات نمایاں ہیں۔ اس کے علاوہ دوسرےا سلامی ممالک میں جمال الدین افغانی کی سیاسی قیادت سے غیر ملکی استعماریت سے چھٹکارا پانے اور قوم، وطن اور نسل کے محدود تصورات سے بالا تر ہو کر اسلام کے تصورات کو اپنانا اور تمام اسلامی ممالک کے باہمی تعاون سے ایک مضبوط اسلامی اتحاد کی تحریک شروع ہو گئی تھی۔ مسلمانوں کے دلوں سے برطانوی حکومت کا اعتبار مختلف حادثات مثلاً کان پور میں مسجد مچھلی بازار کا حادثہ، تقسیم بنگال کی منسوخی کی وجہ سے اٹھ گیا تھا ۔[۷۰]اور جب ہندوستان کے علاوہ دوسرے اسلامی ممالک میں مسلمانوں کو برطانوی حکومت نے نقصان پہنچانا شروع کیا تو اخوت اسلامی کا جذبہ ہندوستان کے مسلمانوں میں بھڑک اٹھا۔ جب ۱۹۱۱ء میں اٹلی اور بلقانی ریاستوں نے سلطنت عثمانیہ کو تقسیم کرنے کے لیے جارحانہ کاروائیاں کیں تو مسلمانوں کی ہمدردیاں ترکی کے ساتھ اتنی بڑھ گئیں کہ انھوں نے اٹلی اور برطانیہ کے سامان کا مقاطعہ شروع کر دیا اور ترکی کی امداد کرنے کے لیے چندے جمع کیا۔[۷۱] ہندوستان میں سیاسی و قومی رہنماؤں کے علاوہ ادیبوں،

شاعروں اور صحافیوں نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ۔ ان کی تحریروں نے مسلمانوں میں اتحاد اسلامی کے جذبات پیدا کر دیے تھے۔

تحریک ریشمی رومال کے سرکردہ رہنما مولانا محمد الحسن اور مدرسہ دیو بند کے فارغ التحصیل طلباً تھے۔ انھوں نے اس تحریک کے ذریعے مغربی استعماری طاقتوں کے خلاف عملی اقدامات کرنے کے سلسلے میں سلطان عبد المجید سے رابطے پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مولانا محمود الحسن نے اپنے ایک شاگرد مولانا عبید اللہ سندھی کو افغانستان بھیجا[۷۲] تاکہ وہ وہاں کے قبائل فرقوں اور حکومتی افراد کو ترکوں کی حمایت کے لیے آمادہ کریں۔ اس تحریک کے شرکا آپس میں پیغام رسانی کےلیے ریشمی پارچے استعمال کرتے تھے جس پر ہندوستان کی آزادیٔ اور ترکوں کی امداد کےمتعلق تحریریں درج ہوتی تھیں۔ اس جہادی پیغام رسانی کی کوشش کو تحریک ریشمی رومال کہا جاتا ہے۔

اس تحریک کو ۱۹۲۵ء میں مرہٹہ ڈاکٹر بجوری نے شروع کیا۔ یہ تحریک مرہٹہ قوم پرستی اور ہندو مذہب کے

فروغ پر مبنی تھی۔ اس تحریک کے متشددانہ فکر سے بعد میں "بھارتیہ جن سنگھ" پیدا ہوئی جو آج تک بھارتی مسلمانوں سے متصبانہ اور اشتعالی جذبات کا اظہار کرتی رہتی ہے۔[۷۳] اسی طرح کی ایک اور سیاسی ہندو مہاسبھا تھی۔ یہ بھی کانگرس کی طرح متحدہ قومیت کی حامی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ کانگرس ہندوستانی کا لفظ استعمال کرتی تھی مگر مہاسبھا وہاں صرف ہندو کا۔ یہ جماعت اس قدر کٹر تھی کہ کسی مسلمان کو اس میں شامل نہ کیا ۔ اس کا مقصد صرف مسلمانوں کی مخالفت ہی رہا۔

اردو سفرنامے کی ابتدا بھی اس عہد میں ہوئی جب ہندوستانی سماج ایک غیر ملکی سامراجی اقتدار کے زیرِ اثر سیاسی، تعلیمی اور سماجی تبدیلیوں سے دوچار تھا۔ خاص طور پر جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد مغربی افکار و علوم کے فروغ نے ہندوستان کے سیاست دانوں، ادیبوں اور دانش وروں

کو ایک نئے تصورات، نئی اقدار اور نئی تہذیب سے روشناس کیا۔ اس نو آبادیاتی ہندوستان میں جو اصلاحی، سیاسی اور سماجی تحریکیں چل رہی تھیں۔ ان سے متاثر ہو کر بہت سی خواتین بھی گھر کی چار دیواری سے نکل کر ان میں شامل ہو گئیں تھیں۔ انھوں نے آزادیٔ کے اس سفر میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا جیسے بی امّاں، مسز گاندھی، بیگم حسرت اور دیگر خواتین وغیرہ۔ ان خواتین نے نہ صرف خود حصّہ لیا بلکہ اس تحریکِ آزادیٔ کی جدوجہد کے دوران مردوں کی اچھی خاصی تعداد جب انگریز زندانوں میں قید تھے تو ان گھرانوں کی عورتوں نے جس طرح اپنے گھروں کو سہارا دیا اور معاشرتی سرگرمیوں میں بھی فعال رہیں یہ ہماری قومی تاریخ کا ایک شاندار باب ہے۔

انیسویں صدی کا دور ہندوستان کی سیاسی، ثقافتی ، اقتصادی اور سماجی زندگی میں کئی تبدیلیوں کا آئینہ دار ہے۔ خصوصاً مغربی اور مشرقی تہذیب کے تصادم نے کئی رجحانات کو جنم دیا جس کی جھلک اس نوآبادیاتی عہد کے تقریباً تمام سفرناموں میں نظر آتی ہے۔ خواتین سفرنامہ نگاروں نے اپنے عہد کے بدلتے ہوئے حالات کو اپنے سفرناموں میں بھی بیان کیا ہے۔ اس لحاظ سے ان سفرناموں کی اہمیت ایک سیاسی و سماجی دستاویز کی سی ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اس دور میں لکھے گئے سفرناموں میں اس عہد کے سفرنامہ نگاروں کے ایک مخصوص زاویہ نگاہ کا احساس ہوتا ہے جو ان کی شخصیتوں، خیالات اور تصورات کو آشکار کرتا ہے۔ انھوں نے اپنے سفرناموں سے معاشرتی اصلاح کا کام لیا ہے۔ اردو میں نواب سکندر بیگم نے سفرنامہ نگاری کا آغاز کیا ۔ وہ پہلی سفرنامہ نگار خاتون ہیں جنھوں نے ہندوستانی اور عرب معاشرے کی سیاسی، سماجی اور اخلاقیٔ زندگی کی تصویر کشی کی۔ انھوں نے بہت سی سیاسی شخصیات شریف و پاشا اور فریخ قونصل جدّہ کی بیگم سے ملاقات کی اور اس کی معرفت نپولین کو سلام بھیجنے کا ذکر بھی موجود ہے۔ یہ سفرنامہ چوں کہ اس ابتدائی دور کا نمونہ ہے جب ہندوستانی خواتین تبدیلیوں کے پُرآشوب دور سے گزر رہی تھیں اور کسی

بھی چیز کا تعیّن کرنا ناممکن تھا۔ حکمران بھوپال ہونے کے باوجود وہ انگریزوں کی مخالفت کرنے کی بجائے ان کی خیرخواہ نظر آتی ہیں۔ بقول محمد امین زبیری "جس طرح وہ ہندوستان میں بہ لحاظ اپنے نظامِ حکومت اعتبار، وفاداری، خیر خواہی تاج برطانیہ میں سب سے ممتاز تھیں۔ [۷۴]

اسی طرح نواب سلطان جہاں جب یورپ کی سیاحت پر جاتی ہیں تو سلطنت برطانیہ کی شاہی مہمان بنتی ہیں۔ ان کی رسم تاج پوشی میں شرکت کرنے کے علاوہ دیگر تقریبات میں بھی مدعو ہوتی رہیں۔ اس سفرنامے سیاحت سلطانی میں سیاسی امور اور معاملات حکومت کی کہانی بھی پوشیدہ ہے۔ وہ خود ایک حکمران تھیں اور برصغیر کی سیاست پر اثرانداز ہونے والے واقعات اور تحریکات کا حصّہ تھیں۔ اس لیے سفرنامے میں بھی اس کے اثرات نظرآتے ہیں۔

بیگم نازلی نے اپنے سفرنامے میں ہندو یورپ کی تہذیب و ثقافت اور سماجی و سیاسی حالات کے بارے میں لکھا ہے۔ جہاں کہیں وہ یورپی سماج سے متاثر ہوتی ہیں وہاں دونوں ممالک کا موازنہ بھی غیر شعوری کرنے لگتی ہیں۔ چوں کہ مصنفہ نے ایک عورت کی نظر سے یورپ کو دیکھا ہے تو وہاں کی سیاست و معیشت کے بارے میں بھی بہت سی معلومات دیتی ہیں ۔ اس وقت ہندوستان میں سیاسی اور اصلاحی تحریکیں بھی چل رہی تھیں تو مصنفہ کے ساتھ ساتھ بیرونی ممالک کے لوگ بھی ہندوستان کی صورت حال سے بے چینی میں تھے۔ سفرنامے میں مصنفہ سیاست کے حوالے سے یوں لکھتی ہیں کہ بعد ازاں ہندوستان کے متعلق دریافت کیا گیا کہ ہندی کیا چاہتے ہیں کہ آزاد یا خود مختار ہو جائیں، جمہوری حکومت انھیں پسند ہے یا نہیں۔ [۷۵] ایک اور جگہ لکھتی ہیں کہ آج کل کی سیاسی حالت پر بہت دیر تک بحث ہوئی۔ خاص کر ہندوستان کی موجودہ حالت پر ۔ یہ سب یہاں بہت بے چین ہو رہے ہیں کہ اس بلوے کو کس طرح فروکریں۔ [۷۶]
اس سفرنامے میں بیگم نازلی اور ان کے شوہر کی سلطنت برطانیہ کے اکابرین سے ملاقاتیں اور شاہی محل میں دعوت و ملاقات کا احوال پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ لکھتی ہیں کہ وہاں لوگ کہتے ہیں کہ کسی مسلمان بیگم کے ایسے دربار میں

شریک ہونے کا یہ پہلا ہی واقعہ ہے۔ معلوم نہیں یہ کہاں تک درست ہے۔[۷۷]

بیگم صغرا بھی ان سفرنامہ نگاروں خواتین میں شمار کی جاتی ہیں جن کے سفرناموں میں ان کے عہد کے

تہذیبی، سیاسی و سماجی حالات کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ انھوں نے اپنے سفرناموں میں سیاسی بیداری اور ہندوستانیوں کی کم مائیگی کو بیان کیا ہے۔ انھیں اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ مسلم معاشرہ تب تک آزادی کی جدوجہد میں کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک عورتوں کو جہالت کی گمراہی سے نہ نکالا جائے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے نہ صرف ایک تحریک شروع کی بلکہ تحریکوں کی حمایت بھی کی جو ہندوستان میں اس وقت چلائی جا رہی تھیں۔ وہ اپنے سفرنامہ پونا و مدراس میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے متعلق لکھتی ہیں "ایسٹ انڈیا کمپنی نے مدراس پر ۱۶۶۳ء قبضہ کیا اور یہاں ایک تجارتی منڈی قائم کی، بعد میں ایک قلعہ مسمٰی بہ "فورٹ سینٹ جارج" تعمیر کیا۔ جس میں وقتاً فوقتاً ترمیم و ترقی ہوتی رہی۔ حیدر علی نایک اور اس کے بیٹے ٹیپو سلطان سے اور کمپنی سے برابر لڑائیاں ہوتی رہیں۔ ایک جنگ میں حیدر علی نے کمپنی مذکور کو شکست فاش دی اور کمپنی کے دارالامارہ مدراس میں حیدر علی کی فوج داخل ہو گئی تھی۔ اس وقت فریقین میں مصالحت ہوئی۔[۷۸] اس کے علاوہ بہمنی سلطنت کے قیام اور احمد شاہ ابدالی کے ہندوستان پر حملوں کی داستان بھی پائی جاتی ہے۔ ان کا ہر سفرنامہ برصغیر پاک و ہند کی سیاسی و سماجی صورت حال سے بھرپور ہیں۔ مصنفہ نے ہر ایک بات او ر واقعات کو جزئیات سمیت بیان کیا ہے۔ ان کے ہاں معلومات کی فراوانی پائی جاتی ہے۔ نو آبادیاتی عہد کی سفرنامہ نگار خواتین ہندوستان میں چلنے والی تحریکوں سے کسی نہ کسی طور پر متاثررہیں اور انھوں نے تحریر ی اور عملاً اس جدوجہد میں حصّہ لیا۔ بیگم صغرا ہمایوں کی ساری زندگی اسی کوشش میں گزری۔ ان کا ہر سفرنامہ ان کوششوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ان کا سفرنامہ بھوپال و آگرہ دہلی کے حالات جلسے اور کانفرنسوں کی روداد پر مشتمل ہے۔ اس سفر نامہ میں وہ ایک جگہ

لکھتی ہیں۔"انجمن کے قواعد و ضوابط مرتب کرنے کے لیے ایک سب کمیٹی قائم کی گئی۔ یہ امر بھی طے پایا کہ انجمن کی آمدنی کا ایک حصّہ اشتیاقی بیگم کے مدرسے کی امداد میں صرف کیا جائے اور ایک حصّہ شریف غریب بیوہ مستورات کی امدا د میں دیا جائے۔ یہ امر بھی طے پایا کہ انجمن کے سرپرست حاذق الملک بہادر حکیم اجمل خان صاحب بنائے جائیں۔"[79]

بیسویں صدی کے اوائل سے ہی خواتین پہلے کی نسبت زیادہ سرگرم اور مستعد نظر آتی ہیں کیوں کہ معاشرے میں مردوں کی سوچ میں تبدیلی آنے سے ان کے لیے خاطر خواہ آسانیاں پیدا ہونا شروع ہو گئیں تھیں۔ اب وہ ہر پلیٹ فارم سے اپنی آواز بلند کر رہی تھیں اور جلسے جلوسوں اور کانفرنسوں میں اپنی نمائندگی کا اظہار کرنے لگیں۔ بیگم عطیہ فیضی نے اپنی ساری زندگی سماجی و اصلاحی کاموں میں گزاری۔ وہ ایک آزاد خیال اور تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ انھوں نے خود بھی سیاسی و اصلاحی تحریکوں سے اثر لیا اور جدوجہد آزادی و حقوق نسواں کے لیے آواز بلند کرتی رہیں۔ مگر جب ان کا سفرنامہ زمانۂ تحصیلؒ کا جائزہ لیتے ہیں تو ایک بات شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ وہ جب انگلستان گئیں تب ہندوستان میں تمام تحریکیں عروج پر تھیں اور ہندوستانی عوام کا ہر دن بے چینی اور جدوجہد آزادی میں بسر ہو رہا تھا مگر ان کا سفرنامہ ان تمام سیاسی سرگرمیوں کے اثرات سے پاک ہے۔ اگر کسی جگہ ہندوستان کے سیاسی حالات کا ذکر آیا بھی ہے تو وہ بھی سرسری سا ہے۔ جیسے ایک جگہ وہ بے ضرر کا تبصرہ بیان کرتی ہیں کہ لیوانر صاحب نے بھی موقع پا کر بیان کر دیا کہ میں ہندوستان میں عرصے تک قیام کر چکا ہوں اور جو کچھ میں نے مسلمانوں کی حالت ملاحظہ کی ہے اُس سے اُن کی آئندہ ترقی کی کوئی امید اور خوبی دکھائی نہیں دیتی ہے۔ بڑی سُست قوم ہے وہ تو کل کے سوا کچھ نہیں جانتے وغیرہ وغیرہ۔ پیاری بہنو بات تو سچ کہی ہم بُرامان جائیں یہ ہماری خوشی ہے۔"[80]

ان کے علاوہ بھی کچھ سفرناموں میں سلطنت برطانیہ کے ساتھ خیر خواہی کا رجحان نظر آتا ہے اور یہ تمام خواتین

برطانوی نظام اور معاشرت سے خاصی متاثر دیکھائی دیتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے شعوری طور پر سیاسی گفتگو یا ان کے خلاف کسی بھی طرح کی رائے دینے سے احتراز اختیار کیا ہے۔ حالاں کہ تب پورا ہندوستان برطانوی تسلّط سے آزادی کا خواہاں تھا اور وہ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

بیگم عطیہ فیضی کی طرح نشاط النساء (بیگم حسرت موہانی) کا نام بھی اردو ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ وہ بیسویں صدی کی سیاسی و سماجی اور نسوانی تحریک کا حصہ تھیں۔ انھوں نے آزادی وطن کے لیے کی گئی جدوجہد میں اپنے شوہر کا ساتھ دیا اور انہیں کبھی اپنے مقصد سے ہٹنے نہیں دیا بلکہ ہر مشکل میں اس کا حوصلہ بڑھاتی رہیں اور اس راہِ خاردار کی مشکلوں کو تن تنہا برداشت کیا مگر کبھی کسی لمحے نہ خود کسی کے آگے جھکیں اور نہ مولانا حسرت کو ایسا کرنے پر مجبور کیا۔

مولانا حسرت نے شادی کے بعد صحافت اور سیاست میں حصہ لیا تو بیگم حسرت آزادی کی جدوجہد، مزدوروں اور عورتوں کے حقوق کے لیے اپنی آخری سانس تک اپنے شوہر کی وفادار اور غمخوار رہیں۔ مولانا نے جب یہ عہد کیا کہ وہ سو دیسی چیزیں استعمال کریں گے تو انھوں نے اس معاملے میں بھی مولانا حسرت کا ساتھ دیا اور وہ اپنے ہاتھ سے بُنے سوت کے کپڑے پہنتی رہیں۔ بیگم حسرت نے مولانا کے ساتھ فریضہ حج کی ادائیگی اور مقامات مقدسہ کی زیارت کا شرف بھی حاصل کیا اور ان مقدس مقامات کے تجربات و مشاہدات اور واقعات کو سفرنامہ حجاز اور سفرنامہ عراق کے نام سے مولانا حسرت نے سفرناموں کی شکل میں ترتیب دیا۔ بیسویں صدی کی دوسری سفرنامہ نگار خواتین کی طرح وہ اپنے عہد کی سیاسی و تعلیمی اور اصلاحی تحریکوں سے متاثر تھیں بلکہ

سیاسی تحریکوں کے حوالے سے تو ان کا نام بھی مولانا حسرت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔

بیگم سر بلند جنگ بہادر کا سفرنامہ دنیا عورت کی نظر میں بھی برطانوی سلطنت سے میل جول اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے کی سعی و کوشش پر مشتمل ہے۔ جیسے ایک جگہ مصنفہ لکھتی ہیں کہ پھر فرمایا کہ لندن تم کو پسند آیا؟ میں نے عرض کیا کہ بہت پسند آیا۔ فرمایا، ہندوستان بہت اچھا ہے۔ میں نے کہا وہ بھی آپ کا ہی ہے۔ [۸۱]

اور جب اندرونِ ہندوستان مصنفہ کی زندگی کا جائزہ لیں تو وہ ہر سیاسی و اصلاحی تحریک کا حصّہ رہیں اور ان کے اپنے عہد کی تمام نامور خواتین بیگم بھوپال سلطان جہاں، بیگم صغرا ہمایوں ، سروجنی نائیڈو، نازلی بیگم، مسز خدیو جنگ صاحبہ، مسز امیر حسن اور زہرا فیضی کے ساتھ گہرے تعلقات تھے اور وہ ہر جلسے و کانفرنس میں ان کے ہمراہ شرکت کرتی تھیں۔

نوآبادیاتی عہد کے یہ سفرنامے اس عہد کا ایک ایسا منظر نامہ ہیں جس میں بہت سی تحریکیں سانس لے رہی تھیں اور ان تحریکوں سے وابستہ لوگ اپنے اپنے طور پر آزادی کی جدوجہد میں کوشاں تھے۔ ہندوستان کا ہر فرد کسی نہ کسی تحریک سے اپنی وابستگی کا اظہار عملی یا تحریری طور پر کر رہا تھا اور خواتین بھی اس فریضے کی انجام دہی میں کسی سے پیچھے نہ تھیں۔

۴۔مذہبی وابستگی اور اس کے مظاہر:

برصغیر پاک و ہند میں برطانوی تسلط کے ساتھ ہی جدید تعلیم کا بھی آغاز ہوا کیوں کہ اس سے پہلے یہاں کا نظامِ تعلیم مشرقی علوم و فنون پر مبنی تھا۔ لڑکوں کے لیے تو دیسی مدارس قائم تھے اور وہ ان میں تعلیم پاتے تھے مگر عورتوں کو گھر میں ہی مذہبی اور فارسی کی چند کتب کو رٹوا دیا جاتا تھا۔ اس وقت نصابی کتابوں کی سخت قلت تھی۔ اردو میں تو مذہبی کتابیں تھیں یا شاعری یا پھر داستانوں کا

ذخیرے۔ چنانچہ اس عہد کی لڑکیوں کو صرف ان ہی دو طرح کی کتابوں کا مطالعہ کرنے کا موقع ملتا تھا لیکن جیسے جیسے انگریزوں کا اقتدار بڑھنے لگا اور سیاسی استحکام حاصل ہونے لگا تو انھوں نے ہندوستانیوں کی تعلیم کی طرف بھی توجہ دی۔ ان کی اس توجہ کے پیچھے بھی ان کے مذموم مقاصد تھے۔ وہ مسلمانوں کا فارسی زبان سے رابطہ ختم کرنا چاہتے تھے کیوں کہ اس زبان میں مسلمانوں کا صدیوں پرانا سرمایہ تھا۔ مسلمان ہزار ہا سال سے اس خطے پر اپنی کامیابی و کامرانیوں کے جھنڈے گاڑھے ہوئے تھے اور اسلامی علوم و فنون کو ترقی دینے کے ساتھ ساتھ اسی علم کو کتابوں میں بھی محفوظ کرتے۔ اس طرح برصغیر کے مسلمانوں کا ادبی و علمی سرمایہ فارسی میں تھا۔ ایک دانشور کا قول ہے کہ اگر کسی قوم کو مفلوج کرنا ہو تو اس کا رابطہ اس کی زبان اور اس کے ادب سے کاٹ دو۔

جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس زرخیز خطے پر بڑی منصوبہ بندی سے اپنے پنجے گاڑ لیے اور ان کا مقصد ہندوستان کی دولت کو برطانیہ لے جانا تھا۔ اس مقصد کے پیشِ نظر کمپنی نے خام مال کی پیداوار میں اضافہ کرنے، رسل و رسائل کے ذرائع کو بڑھانے اور انتظامیہ کے طرز میں تبدیلی لانے کی کوشش کی تاکہ زیادہ سے زیادہ معاشی فائدہ اٹھایا جا سکے۔ چنانچہ اس مقاصد کے حصول کے لیے انھوں نے تعلیم کا بھی سہارا لیا کیوں کہ انھیں اپنے دفاتروں میں افسران یا دوسرے چھوٹے موٹے انتظامی امور کے لیے مقامی لوگوں کی ضرورت تھی اور اس سلسلے میں سب سے بڑا مسئلہ زبان کا تھا۔ اس لیے انگریزوں نے جدید تعلیم پر خصوصی توجہ دینا شروع کی تاکہ انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان زبان کا مسئلہ نہ رہے۔ مگر مسلمانوں کی انگریزی تعلیم کو اپنے لیے ان بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ ہندوستانیوں کی سیاسی، تہذیبی، ثقافتی، تعلیمی اور ادبی زندگی میں بھی کئی تبدیلیاں آئیں۔ ہندوستانی معاشرہ جس پر مغل سلطنت کے زوال اور انگریز قوم کے عروج کے بعد جمود کی کیفیت طاری ہو چکی تھی اور وہ سماجی برائیوں اور جہالت کی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کٹھن وقت میں ہندوستان کے کچھ دانش وروں نے ایک اصلاحی و تعلیمی تحریک شروع کی جس نے جدید تعلیم کے

رجحان کو فروغ دیا۔ مگر اس تحریک کے تعلیمی ثمرات صرف لڑکوں کے لیے تھے۔ لڑکیوں کے لیے صرف وہی صدیوں پرانا تعلیمی نظام کافی سمجھتے ہوئے ان کو نظر انداز کیا گیا ۔ تھوڑے ہی عرصے بعد ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا جنھوں نے وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے عورتوں کی تعلیم پر زور دیا اور ان لوگوں کو اپنی تحریروں کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کی۔ جو یہ سمجھتے تھے کہ لڑکیوں کو تعلیم دینا شرم و حیا کو کھو دینا ہے۔ اور وہ بے پردگی کا شکار ہوں گی۔

ہندوستان کے تنگ ذہن لوگوں نے مذہب کی آڑ میں بہت سی فرسودہ روایات کو گلے سے لگایا ہوا تھا۔ لڑکوں کی تعلیم کے معاملے میں پھر بھی اُن میں لچک پائی جاتی تھی مگر عورتوں کا گھر کی چار دیواری سے نکلنا اور انگریزی سکولوں میں جانا ان کو معیوب لگتا تھا۔ طبقہ اشرافیہ میں یہ صورت حال کچھ مختلف تھی مگر انھیں بھی ایک حد تک آزادی حاصل تھی۔ ہندوستان کی دوسری خواتین کی طرح یہ بیگمات بھی اپنی تحریریں اپنے اصلی نام کی بجائے اپنے خاوند کے نام سے شائع کرواتی تھیں۔ جیسا کہ بیگم سربلند جنگ بہادر اور بیگم حسرت موہانی اور بیگم ہمایوں مرزا زیادہ تر انہی ناموں سے ادبی حلقوں میں جانی جاتی ہیں ۔ابتداء میں عورتوں کے متعلق تعلیم اور آزادی میں رکاوٹ تمام طبقوں میں تھی مگر نچلا اور متوسط طبقہ اس کا زیادہ شکار تھا۔ مذہبی روایات و اقدار کی پاسداری کا بہانہ بنا کر انھیں ہر شعبۂ زندگی میں پیچھے رکھا جا رہا تھا۔ بیسیوں صدی کے آغاز میں ہی تعلیمِ نسواں کی کوششوں میں تیزی آگئی اور علی گڑھ تحریک میں بھی سرسید کے ارکان خمسہ میں سے ڈپٹی نذیر احمد، مولانا حالی نے عورتوں کے لیے قصے کہانیاں لکھیں۔ اس عہد کے دیگر دانشوروں مولوی ممتاز علی، راشد الخیری، شیخ عبد اللہ ہارون نے خواتین کے رسالے جاری کیے جن میں مختلف موضوعات پر عورتوں نے قلمی ناموں سے مضامین لکھے اور دوسری عورتوں کو بھی اس طرف مائل کیا۔ اس کوشش میں بیگمات بھوپال کی خدمات کو کسی طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے مذہب کی پاسداری کرتے ہوئے سالوں حکمرانی کی اور پردے کو اپنے راستے کی رکاوٹ نہ بنایا۔ نواب قدسیہ بیگم ، نواب سکندر اور نواب سلطان جہاں بیگم جب

حج کی سعادت حاصل کرنے گئیں تو انھوں نے ہر عام و خاص سے پردہ کیا اور ارکانِ اسلام بھی پورے کیے۔ ان کے سفرناموں میں مذہب کے ساتھ دلی وابستگی کا برملا اظہار ہوتا ہے۔ نہ صرف حج بلکہ جب نواب سلطان جہاں یورپ کی سیاحت پر گئیں اور انھوں نے سلطنت برطانیہ کے ارکانِ سلطنت کے ساتھ پردے میں ملاقات کی اور روشن خیال ہونے کے باوجود اپنی لڑکیوں شاہ بانو، برجیس بیگم کو دعوت و تعام سے دور رکھا۔ سیاحت سلطانی میں بہت سی جگہوں پر وہی صدیوں پرانی مذہب کے نام پر عورتوں کا استحصال نظر آتا ہے۔ دینِ اسلام کے تاریخی معرکے دیکھیں تو پوری تاریخ عورتوں کے کارناموں سے بھری ہوئی ہے۔ اسلام و باطل کا کوئی ایسا معرکہ نہیں جس میں آنحضورﷺ نے عورتوں کو زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے اور انھیں مدد کرنے سے منع فرمایا ہو۔ حضرت خدیجہؓ تجارت کرتی تھیں، حضرت عائشہؓ بھی جنگ و جدل میں کسی سے پیچھے نہیں رہیں۔ اسی طرح اسلام کی سربلندی میں بہت سی عورتوں کے نام اور کام کسی سے پوشیدہ نہیں لیکن برصغیر پاک و ہند کی سرزمین پر مذہب کے نام پر بہت سی من گھڑت روایات تقویت پا چکی تھیں اور ان سے چھٹکارا پانا مردوں کو اپنی غیرت کا معاملہ لگتا تھا۔

ہندوؤں کے مذہب میں ایسی کوئی سختی نہ تھی اور وہ نہ صرف خود تعلیم کے میدان پیش پیش تھے بلکہ ان کی لڑکیاں بھی انگریزی مدارس میں تعلیم پاتی تھیں۔ اسلامی معاشرہ کی خواتین صدیوں سے مذہب کے نام پر پسماندہ سے پسماندہ ہوتی جا رہی تھیں۔ مسلمانوں کو اس حقیقت کے قبول کرنے میں کافی وقت لگا کہ کسی بھی عورت کی تعلیم پورے کنبہ کی تعلیم ہے۔ بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں تحریکِ نسواں قائم ہوئی جس کی باگ ڈور اور جدوجہد میں نازلی رفیعہ سلطان، عطیہ فیضی، زہرا فیضی، بیگم صغرا ہمایوں، بیگم سربلند جنگ بہادر، شاہ بانو، راحیل شروانیہ اور محمودہ عثمان حیدر اہم ہیں۔ ان خواتین نے اپنے سفرناموں سے عورتوں کی بیداری کا کام لیا۔ ان کے سفرنامے بیسویں صدی کی مذہبی اور تعلیمی تحریکوں کا ایک مستند حوالہ ہے کیوں کہ کوئی بھی ادیب و شاعر اپنے معاشرہ کا عکاس ہوتا ہے۔ ان سفرناموں کے ذریعے اگر ہم اس عہد کی تاریخ مرتب

کرنا چاہیں تو بڑی آسانی سے کر سکتے ہیں۔ اس صدی کی خواتین کہیں بھی گئیں اُن کا ماحول اور حالات ان کی ذات کا حصہ بنے رہے۔ اب اگر مذہبی حوالے سے ان کے سفرناموں کا جائزہ لیں تو ہمیں جگہ جگہ ان کی مذہب سے وابستگی نظر آتی ہے۔ انھوں نے اس کو اپنے راستے کی رکاوٹ نہیں سمجھا۔ بیگمات بھوپال کے سفرنامے دیکھیں تو ان کے علم کی داد دینا پڑتی ہے کہ وہ ہر بات کا حوالہ قرآنی آیات کی روشنی میں دیتی ہیں۔ بیگم سلطان جہاں کا سفرنامہ "روضہ الریاحین" میں وہ گورنمنٹ انگلیشیہ کا سفرکا اہتمام کرنے پر شکریہ ادا کرنے کے حوالے سے قرآن کی آیات لکھتی ہیں جس کا ترجمہ یہ ہے:

"جس نے شکر نہیں کیا لوگونکا اوسنے شکر نہیں کیا اللہ کا۔"
[۸۲]

انھوں نے حج کی اہمیت و فضیلت آیاتِ قرآنی کی روشنی میں بیان کی ہے۔ اس سفرنامے کے پہلے حصے میں ہر بات کا ثبوت اسلام کی دلیلوں سے دیا ہے۔

بیگم سربلند جنگ بہادر (اختر حمیدیہ) کا سفرنامہ دنیا عورت کی نظر میں مذہبی جذبات سے بھرپور ہے۔ ان کی روانگی سے ہی ان کے مذہبی عقیدے پرروشنی پڑتی ہے جیسا کہ انھوں نے گھر کے دیگر افراد سے حج بیت اللہ کی اجازت طلب کی۔ اسی طرح اپنے پیرومرشد حضرت مولانا مولوی محمد قیام الدین عبد الباری سے بھی خط کے ذریعے اجازت لیتی ہیں اور ان کے مقام و مرتبے کے بارے میں لکھتی ہیں کہ یہ حضرت میرے پیرومرشد جناب مولانا الحاج مولوی محمد عبد الوہاب صاحب قبلہ کے چھوٹے صاحب زادے ہیں اور بہت ہی سچے پیر ہیں۔ آج ان کا ثانی دوسرا نہیں ہے۔ ان سے بھی اجازت حج بیت کی لے لی تھی۔ [۸۳]

مصنفہ نے اپنے عزیز و اقارب سے ملنے والے امام ضامن کی تعداد چھ سو بتائی ہے،جو صرف ان کو دیئے گئے ہیں۔ نواب حمید خان کے امام ضامن ان کے علاوہ ہیں۔ اس کے علاوہ ان لوگوں نے جانے سے پہلے حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز

کی درگاہ شریف پربھی حاضری دی۔ ان خواتین کے سفرناموں کے مطالعے سے راقمہ کو ان خواتین کے مذہبی رویوں کا کافی تضاد نظر آیا۔ ان خواتین کا تعلق طبقۂ اشرافیہ کے پڑھے لکھے گھرانوں سے تھا۔ تعلیم کے باجود اندرونِ ہندوستان یہ سب بھی پردے کی حدود و قیود میں جکڑی ہوتی ہیں مگر بیرونِ ملک کی سیاحت پر یہ خواتین بوقت ضرورت اپنا نقاب بھی اتار دیتی ہیں اور غیر محرم مردوں سے مصافحہ کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتیں۔ جس طرح بیگم سربلند پردے کے بارے میں لکھی ہیں کہ نواب سر بلند بہادر تشریف لا کر فرمایا، چلو میز تیار ہے، میں نے کہا سب کے ساتھ کھانا کھاؤں گی؟ تو فرمایا کہ ہاں چلو یہاں کون دیکھتا ہے۔"[۸۴] اسی طرح جب یہ لوگ پرنس آف ویلز کے ہاں دعوت پر گئے اور وہاں کا ذکر مصنفہ نے یوں کیا کہ میرے پہنچنے کے ۵ منٹ بعد پرنس اور پرنسز تشریف لائے، میں کھڑی ہو گئی اوّل پرنس نے مجھ سے ہاتھ ملایا پھر سرکار سے۔"[۸۵]

اس اقتباس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انگریز دربار سے اپنی وفاداری ثابت کرنے کی خاطر یہ نوابان حضرات اپنی بیگمات کو بھی ان کے ہاں لے کر جانا ایک اعزاز سمجھتے تھے مگر اپنے وطن میں معاشرے کے دیگر کم پڑھے لکھے طبقے کی مانند پردے کا خصوصی اہتمام کرواتے تھے اور ان خواتین نے بھی پردے پر سختی سے عمل کیا۔ ماسوائے عطیہ فیضی کے، انھوں نے ہندوستانی خواتین میں سب سے پہلے پردہ ترک کیا تھا اور وہ ترقی پسند خاتون میں شمار ہوتی ہیں۔ اس دور کی ایک اور نامور خاتون بیگم صغرا ہمایوں ہیں انھوں نے اپنی زندگی حقوق و بیداری نسواں کے وقف کر رکھی تھی۔ مذہبی وابستگی کے حوالے سے ان کا سفرناموں کا جائزہ لیں تو ان کے ہاں بھی وہی روایتی پردہ نظر آتا ہے۔ وہ اپنےسفرنامہ روزنامچہ سفربھوپال و آگرہ میں لکھتی ہیں:

> گھر سے موٹر یا گاڑی پر آتے اور ایک پنس (با اصطلاح حیدرآباد میانہ) قبل سے اسٹیشن پر بھیجوی جائی اُس پر سوار ہو کر ریل پر سوار ہوتے۔ مگر اب اسٹیشن پر انتظام کیا گیا ہے کہ دو تین ریکشا پلیٹ فارم پر تیا رہتے ہیں جو گاڑی یا موٹر تک لائے جاتے ہیں جن پر سوار ہو کر ریل کے ڈبے تک آتے ہیں اور وہ ریکشا ڈبے

سے ملا کر لگا دیا جاتا ہے۔ اس میں سے نکل کر ڈبے
میں چلے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ سے بہت آسانی ہو
گئی ہے۔ فی کس ۳ دینا ہوتا ہے۔ حالانکہ اس کی
ضرورت نہیں ہے۔ جبکہ برقعے یا چادر میں ہم رہتے
ہیں تو پھر ان چونچلوں کی ضرورت ہی کیا ہے۔ لیکن
ہمارے مردوں کی خوشی اسمیں ہے کہ ہم مقید رہ
کر زندہ درگور رہیں۔[۸۶]

مصنفہ چونکہ ایک شاعرہ بھی تھیں۔ انھوں نے عورتوں کے پردے کے بارے میں بڑی خوب صورت بات کی ہے۔

مسلمان عورتوں کے جس کو پردا سمجھتے ہیں
پڑیں پتھر سمجھ پر قید کو اچھا سمجھتے ہیں

چھپائیں عورتیں زینت یہی قرآن میں آیا ہے
یہ سیدھے مسئلے کو بھی مگر الٹا سمجھتے ہیں

یہی ہے حکم رکھیں مرد و زن دلکی نظر نیچی
مگر غض نظر کے خوب یہ معنے سمجھتے ہیں

وائے وحشت عورتیں محلوں میں ہیں بیجرم قید
ان مکانوں کو تو ہم وحشت سرا کہتے کو ہیں

مرد ہی کی بدطنی ہے باعث جس دوام
عورتوں کو ہم تو بے جرم و خطا کہنے کو ہیں[۸۷]

مصنفہ عورتوں کی تعلیم کی پُرزور حامی تھیں۔ انھیں انگریزی تعلیم کی اہمیت کا نہ صرف احساس تھا بلکہ انھوں نے اس کے حصول کے لیے کوشش بھی کی مگر اس کے ساتھ ساتھ بیگم ہمایوں اپنے مذہبی عقائد اور نظریات پر سختی سے کاربند بھی تھیں۔ وہ مذہبی تعلیم کو بھی اتنا ہی ضروری سمجھتی جتنا مغربی علوم و افکار کو مسلمانوں کے لیے اہم۔ ان کا خیال تھا کہ خواتین کو پردہ کی وجہ سے اس کے حقوق سے محروم نہیں رکھنا چاہیئے۔ اس کے لیے وہ مذہب سے بہت سی مثالیں بھی پیش کرتی ہیں۔ بیگم صغرا نے اندرونِ ہند بہت سی کانفرنس میں شرکت کی اور اس کی بات کی بارہا وضاحت کی کہ اسلام میں عورت کا بہت بلند مقام و مرتبہ ہے۔ اور اُس نے عورتوں کو علم سے محروم کر کے گھر کی چار دیواری تک محدود نہیں کیا۔ حیا و شرم، مرد ہو یا عورت اس

کا زیور ہے۔ بس اس کی حفاظت کرنی چاہیے اور دنیوی امور سے قطع تعلق کا کہیں حکم نہیں آیا۔ ایک جگہ وہ تقریر کرتے ہوئے کہتی ہیں:

> میں یہ جھوٹا پردہ ہرگز پسند نہیں کرتی۔ مرد کیا اس کا خیال نہیں کرتے کہ جن اقوام میں پردہ نہیں ہے مثلاً پارسی، عیسائی، ہنود وغیرہ تو کیا ان میں عصمت و عفت کی کمی ہے اور کیا پردہ میں شیٔ و قبیحہ اقسام کے مذموم افعال کا ارتکاب نہیں ہو رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بڑا پردہ دل و ایمان کا ہے۔[88]

مصنفہ نے اپنے سفرناموں میں دیگر مذاہب کی عبادت گاہوں کی حالت، صفائی، ان کی منظر کشی میں خاصی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ وہ نہ صرف مذہب اسلام کے متعلق معلومات کا وسیع ذخیرہ رکھتی ہیں بلکہ دوسرے مذاہب کے بارے میں بھی وہ بڑے ذوق و شوق سے روشنی ڈالتی ہیں۔ سفرنامہ پونہ و مدراس میں مصنفہ دوسرے مذاہب کی خواتین کی خوبی ان الفاظ میں بیان کرتی ہیں:

> پارسی لیڈیون میں سے بڑا وصف یہ ہے کہ خواہ کتنی ہی بلند رتبہ و دولتمند ہوں خانہ داریکہ اکثر کام اپنے ہاتھوں سے کر لیتی ہیں اور اس فعل کو کسر شان تصور نہیں کرتیں برخلاف اسکے ایک رسم ہے کہ جہاں ذری ثروت ہوئی کہ ہلکر پانی پینا مشکل ہو جاتا ہے۔[89]

ان کے سفرناموں میں جابجا اولیأ کرام اور ان کے کمالات کا تذکرہ کرنے کےساتھ وہ جس بھی علاقہ میں گئیں انھوں نے درباروں اور مزاروں پر ضرور حاضری دیے سفرنامہ ہرابر کشمیر میں مختلف شہروں کی سیاحت کا احوال موجود ہے۔ اس میں مصنفہ نے حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری ، حضرت سید میران حسین، حضرت سید شاہ نصیر الدین، داتا گنج بخش ہجویری، سید شاہ محمود، میرزا زادہ حسن شاہ، مخدوم جہاں نما سہروردیہ وغیرہ صاحب کرامات بزرگانِ دین کا احوال پایا جاتا ہے۔ مصنفہ کے تمام سفرنامہ تعلیمِ نسواں، مذاہب اور ان کی اصلاحی کاوشوں پر مشتمل ہیں۔

نازلی رفیعہ سلطان کا سفرنامہ سیرِ یورپ بھی اپنے عہد کی اصلاحی تحریکوں اور مذہبی وابستگی کا آئینہ دار ہے۔ بیگم عطیہ فیضی اور بیگم نازلی کا اپنے عہد کی بے باک اور آزاد خیال خواتین میں شمار ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے مقام و مرتبے کو عورتوں کی فلاح کے لیے استعمال کیا۔ اپنی ریاست میں فلاحی کاموں کا بیڑا اٹھایا اور ہندوستان کی نامور شخصیات کو اپنے ہاں مدعوکیا کرتی تھیں۔ مولانا شبلی نعمانی نے "سیرت النبیؐ" بیگم نازلی کے اصرار اور مالی اعانت سے شروع کی۔ مصنفہ کو نہ صرف ادب سے تعلق تھا بلکہ وہ اپنے عہد کے سیاسی، تعلیمی اور مذہبی امور سے بھی دلچسپی لیتی تھیں۔ انھوں نے ہندوستانی عورتوں کو مذہب کی حدود میں رہتے ہوئے جدید تعلیم حاصل کرنے کی جانب راغب کیا۔ سفرنامہ یورپ کا مطالعہ کریں تو اس میں مصنفہ مذہبی گفتگو کرتی بھی نظر آتی ہیں۔ ایک جگہ وہ ایک عیسائی عورت کو مذہب اسلام کے متعلق یوں اظہار کرتی ہیں:

> تم لوگوں کا خدا کا نفیوشیش ہے؟ میں نے کہا نہیں نہیں وہ چینیوں کا خدا ہے۔ ہمارے اور تمہارے خدا میں سرمو فرق نہیں۔ جس خدا کو ہم مانتے ہیں اُسی کو تم بھی مانتی ہو۔ حضرت عیسیٰ ہمارے بھی پیغمبر ہیں۔ اسی طرح حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰؑ، حضرت داؤد وغیرہ کو بھی ہم پیغمبر جانتے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ انہی سوالوں کی کوئی انتہا نہ رہی۔ پھر ہندوؤں کے متعلق دریافت کیا۔[90]

ہندوستان کی دوسری خواتین کی طرح مصنفہ بھی پردے کا خصوصی اہتمام کرتی تھیں مگر سیرِ یورپ میں طبقۂ اشرافیہ کی خواتین کی مانند انھوں نے بھی یورپ جا کر پردہ ترک کر دیا اور بہت سی سیاسی، غیر سیاسی، ادبی شخصیات سے ملنے ملانے کے دوران پردے سے گریز اختیار کیا۔ مصنفہ کی ایسی صورت حال کے بارے میں لیڈی پرنسس کو تشویش ہوتی اور انھوں نے مصنفہ سے دریافت کیا کہ

> پردے کے باہر تم ابھی ہی نکلی ہو۔ تو کیا تم کو عجیب معلوم ہوا؟ میں نے معمولی جواب دیا کہ بہت دشوار ہوا۔ مگر اب عادی ہوتی جار ہی ہوں۔ تو

> فرمایا کہ اب یہ بتاؤ کہ ہندوستان جا کر کیا تم پھر پردہ کرو گی؟ میں نے کہا کہ شاید اتنے پردے میں تو نہیں جاؤنگی۔ کیونکہ اس طرح پھرنے کے بعد وہ بھی ذرا مشکل معلوم ہو گا۔ لیکن اتنی بات ہے کہ بالکل ترک کر دینا بھی مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ اس قسم کی باتیں ہندوستان میں ابھی رائج نہیں۔ پردہ چھوڑنے والیوں پر وہاں سخت طعن ہوتا ہے۔[۹۱]

محمودہ عثمان حیدر نے اپنے سفرنامے میں بزرگانِ دین کے حالات جس محبت اور فرطِ ادب سے تحریر کیے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں ان برگزیدہ ہستیوں سے بڑی عقیدت تھی اور وہ ان کے مذہبی کارناموں سےمتاثر تھیں۔ سفرنامے میں مصنفہ کی تمام کوشش اس امر پر مبذول رہی کہ ہندوستانیوں کو اپنے مذہب کی پاسداری اور اصلاح کرنی چاہیے۔ ان میں جو غیر اسلامی رسوم و عقائد شامل ہو گئے ہیں ان سے اسلام کو پاک کریں۔ اس مقصد کے تحت بھی انہوں نے سفرنامے میں مختلف بزرگانِ دین جیسے حضرت حذیفہ بن الیمان، حضرت جابر بن عبد اللہ، حضرت سلمان فارسی، حضرت شیخ عبد القادر جیلانی کےخیالات اور حالات کی ترویج کی تاکہ اہلِ ہندوستان ان کے کمالات سے آگاہ ہوں۔

تو یہ مذہبی صورت حال پورے ہندوستان خواتین کے لیے تھی۔ وہ عام عورت ہو یا خاص، سب کا دستور ایک ہی طرز کا تھا جس پر عمل سختی سے کروایا جاتا تھا۔ بیسویں صدی کے خواتین کے سفرناموں کا جائزہ لینے سے ایک بات یکساں معلوم ہوتی ہے کہ تمام سفرناموں میں ایک ہی طرح کی سیاسی، معاشرتی ، تعلیمی، مذہبی فضا چھائی ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ عہد سیاسی لحاظ سے بڑا اہم دور تھا اور بہت سی اصلاحی و سیاسی تحریکیں زوروشور سے اپنا اثر و رسوخ بڑھا رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہندوستانی عوام بھی ذلت بھری زندگی سے چھٹکارے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ ہر کوئی خواہ مرد ہو یا عورت اپنے اپنے حصّے کی جدوجہد میں مصروفِ عمل تھا۔

۵۔ معاشرتی رویّے:

برعظیم پاک و ہند میں جدید تعلیم کا آغاز برطانوی تسلّط سے ہوا کیوں کہ انگریزوں کی آمد سے پہلے ہندوستانی نظامِ تعلیم مشرقی علوم و فنون پر مبنی تھا۔ لیکن جوں جوں انگریزی کا نظامِ حکومت وسعت اختیار کرنے لگا اور انھیں مکمل سیاسی استحکام حاصل ہونے لگا تو انھوں نے ہندوستان میں تعلیم کی طرف بھی توجہ دی۔ ان بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی سیاسی، تہذیبی ، تعلیمی اور ثقافتی زندگی میں بھی کئی موڑ آئے۔ ہندوستانی معاشرہ جو صدیوں سے ہندوؤں کے ساتھ میل ملاپ اور رہن سہن سے غیر شرعی رسوم و بدعات کا شکار ہو چکا تھا اور انگریزی نظام حکومت کی سیاسی چالوں کی وجہ سے مسلم معاشرہ مزید پستی اور تاریکی کی جانب چلا گیا اور ان پر جہالت کا لیبل لگا کر ان سے رہی سہی صلاحیتیں بھی چھین لیں۔ پورے معاشرے پر جمود کی کیفیت طاری تھی۔ ایسے حالات میں مسلمانوں کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے کئی اصلاحی تحریکیں شروع ہوئیں۔ ان میں سے ایک سرسید احمد خان کی تحریک تھی جس نے لوگوں کو تعلیم کی جانب راغب کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ انھیں زندگی کے تمام پہلوؤں پر از سر، نو غور و فکر کرنے پر مائل کیا۔

اس تعلیمی و اصلاحی تحریک کے علاوہ ایک اور اصلاحی و انقلابی تحریک تھی۔ اس نے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں ایک انقلاب کی لہر پیدا کی۔ انھوں نے لوگوں کو متحد کرکے معاشرے کی سماجی، اخلاقی اور تہذیبی برائیوں کے خلاف جہاد کرنے کے لیے تیار کیا۔ ان لوگوں نے مسلمانوں کی زندگیوں سے لادینی، توہم پرستی، بے عملی اور ہندوانہ رسم و رواج کے خاتمے کے لیے جدوجہد کی۔

نوآبادیاتی عہد کی تمام سفرنامہ نگار خواتین نے صرف ان تحریکوں سے باخبر تھیں بلکہ وہ بذاتِ خود بھی ان کا حصّہ تھیں۔ انھوں نے ہندوستان کے مسلمان طبقے کو قریب سے دیکھا تھا۔ چناں چہ ان خواتین نے اپنی تحریروں میں ان ہی باتوں کو موضوع بنایا ہے۔ یہ لوگ اس بات سے بخوبی آگاہ تھیں کہ جہالت ہی کی وجہ سے ضعیف الاعتقادی، توہم پرستی اور غیر اسلامی رسم و رواج پیدا ہوتے ہیں۔ اس زمانے میں انگریزی تعلیم حاصل کرنے والوں کو بھی مسلمان اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ ان کو "کرسٹان" یا غیرمسلم کے القاب سے پکارا جاتا ہے۔

صدیوں سے چلی آئی مذہبی تقلید نے معاشرے میں ایک رویّہ یہ بھی رواں رکھا کہ معزز گھرانے کی خواتین کو موضوع گفتگو نہیں بنایا جا سکتا تھا اور غیر محرم مردوں میں اُس کا ذکر نہیں کیا جاتا تھا۔ اس رویے کے تحت عورتوں کو یہ احتیاط برتنا پڑتی تھی کہ اسے کوئی دیکھ نہ لے، اس کا نام کسی کو پتہ نہ چل جائے یا کوئی اس کی آواز نہ سن لے۔ اس رویے سے متاثر ہو کر بہت سے خواتین اپنے اصل نام پوشیدہ رکھتی تھیں۔ جیسے بیگم سربلند جنگ بہادر، بیگم حسرت موہانی، بیگم ہمایوں مرزا مگر اس زمانے کی کچھ خواتین جیسے بیگمات بھوپال اورعطیہ فیضی ہمشیرگان اپنے اصلی نام استعمال کرتی تھیں۔

نوآبادیاتی عہد کی مسلم خواتین پڑھی لکھی ہونے کے باوجود ان تکلفات پر عمل پیرا ہونے پر مجبور تھیں۔ انھیں پردے کا ہر میدانِ عمل میں خصوصی طور پر خیال رکھنا پڑتا تھا۔ حتٰی کہ اگر وہ شہ سواری بھی کرتیں تب بھی پردہ یا برقعہ اوڑھتی تھیں۔ اس عہد کی ماسوائے عطیہ فیضی اور بیگم حسرت موہانی کے باقی سب پردے میں رہتی تھیں اور بیرونِ ملک جا کر اسے ترک کر دیتی تھیں۔ بیگم صغرا ہمایوں کا سفر نامہ بھوپال و آگرہ اور دہلی کے حالات میں ایک ریزولیوشن

پردے ترک کرنے کے حق میں پاس کیا تھا اور پردے پر چند اشعار یہ ہیں:

مسلمان عورتوں کے جس — پڑیں پتھر سمجھ پر قید
کو پردا سمجھتے ہیں — کو اچھا سمجھتے ہیں
چھپائیں عورتیں زینت یہی — یہ سیدھے مسئلے کو بھی
قرآن میں آیا ہے — مگر الٹا سمجھتے ہیں
یہی ہے حکم رکھیں مرد — مگر غض نظر کے خوب یہ
و زن دلکی نظر نیچی — معنے سمجھتے ہیں
وائے وحشت عورتیں — ان مکانوں کو تو ہم
محلوں میں ہیں بیجرم قید — وحشت سرا کہتے کو ہیں
مرد ہی کی بدطنی ہے — عورتوں کو ہم تو بے جرم
باعث جس دوام — و خطا کہنے کو ہیں [92]

ان اشعارکے علاوہ پردے پر ان کی تقریر بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ بیگم صغرا ہمایوں کے ہر سفرنامے میں ان کے خود پردہ کرنے کا پتہ چلتا ہے۔ اسی طرح نازلی رفیعہ سلطان بھی سیرِ یورپ میں پردے کے متعلق لکھتی ہیں کہ چائے پینے سے فراغت ہوئی تو لیڈی صاحبہ نے ہمیں دوپٹہ اوڑھنے کے لیے کہا کیوں کہ وہ سمجھیں کہ یہ صرف لپیٹنے کی چیز ہے۔ یہ نہ سمجھیں کہ ہمارے لباس کا جزو ہے۔ عطیہ نے سمجھا دیا کہ یہ چیز ہمارے لباس کا جزو ہے تاکہ سر کھلا نہ رہے۔[93] ایک اور جگہ لکھتی ہیں کہ پھر کہا کہ پردے سے باہر تم ابھی نکلی ہو تو کیا تمھیں عجیب معلوم ہوا؟ میں نے معمولی جواب دیا کہ بہت دشوار معلوم ہوا۔ مگر اب عادی ہوتی جاتی ہوں تو فرمایا کہ اب ہندوستان جا کر پھر پردہ کرو گی؟ میں نے کہا کہ شاید اتنے پردے میں تو نہیں جاؤں گی۔[94]

اس طرح دیگر سفرنامہ نگار خواتین بیگمات بھوپال، حسرت موہانی، محمودہ عثمان حیدر، بیگم سر بلند جنگ بہادر وغیرہ کے سفرناموں میں پردے پر سختی سے عمل کا رجحان پایا جاتا ہے۔ اس نظام میں کسی طرح کی تبدیلی کا خیال بھی

محال تھا مگر طبقاتی لحاظ سے اس میں کمی یا زیادتی کا پہلو نمایاں تھا۔ ان خواتین سفرنامہ نگاروں کو ہندوستانی عورتوں خصوصاً مسلم عورتوں کی فلاح و بہبود سے گہری دلچسپی تھی۔ وہ نہ صرف ہندوستانی عورتوں کو اپنے حق کے لیے منظم کرنا چاہتی تھیں بلکہ ان تمام رسم و رواج کی مخالف تھیں جنھوں نے عورتوں کی شخصیت کو مسخ کرکے رکھ دیا تھا۔ یہ تمام خواتین ترقی پسند تھیں اور وہ ہندوستانی عورتوں کو بھی ترقی پسند دیکھنا چاہتی تھیں۔ انھوں نے اپنے سفرناموں میں بہت سی ایسی اخلاقی باتیں تحریر کی ہیں جنھیں پڑھ کر عام ہندوستانی عورت اپنی حالت سدھا دیں۔ بیگم عطیہ فیضی اسی مقصد کے تحت لکھتی ہیں کہ وہاں پہنچے اور ان کے علاقے کے کمرے میں داخل ہوتے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک خوش اخلاق جوڑا موجود ہے (یعنی مہاراج اور مہارانی صاحبہ) حضور مہاراج نے انگریزی تواضع کے مطابق ہمارے لیے بر موقع کرسیاں کھینچ کر رکھیں کہ جس بات سے ہم لوگوں پر عجیب طرح کا اثر ہوا اور حضور مہارانی صاحبہ تقریباً دروازے تک ملنے کے لیے آئیں۔ واقعی سیر و سیاحت اور مختلف قوموں سے ملنے جلنے سے انسان ترقی کرتا ہے۔"[۹۵]

زمانۂ تحصیل میں ایک اور جگہ ہندوستانیوں کے متعلق یورپی لوگوں کے رویّے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ لیڈیز پکٹوریل کی ایڈیٹرس اور ایک مصّور بی بی نے مجھے دیکھ کر یادداشت لکھ لی اور تصویر کے لیے دن مقرر کروایا، سینچر کو جانا ہے۔ وہ دونوں میرے لباس کی ہنر مندی اور لیاقت پر حیران ہوئیں۔ ہندیوں کے لیے اب تک ان لوگوں نے ایسے ڈھب خیال مقرر کیے ہیں کہ اگر کسی ہندی سے ملنا ہو گیا اور ان میں اپنے دل میں معین کی ہوئی باتوں کے خلاف نظرآیا تو بے چارے عالم تحیّر میں کھو جاتے ہیں۔[۹۶] ان کا سفرنامہ زمانۂ تحصیل ہندوستانی عورتوں کے متعلق رویوں کے اظہار کی

بجائے مغربی خواتین کی ترقی اور ان کی شائستگی کو
ہندوستانی اناث کی اصلاح کے لیے بیان کیا ہے۔ اور مصنفہ
مغربی تہذیب و معاشرت کی دلدادہ نظرآتی ہیں۔

بیگم صغرا کا سفرنامہ بھوپال و آگرہ اور دہلی کے حالات
بھی اصلاح و شعورِ نسواں کے حوالے سے اہمیت کا حامل ہے۔
مصنفہ نے یہ سفر ہندوستانی خواتین کی حالت کو بہتر بنانے
کے حوالے سے کیا تھا۔ ہندوستان میں عورتوں کی کم سنی میں
شادی ، ان پڑھ ہونے کی وجہ سے شوہر کی دوسری شادی،
ذات برادری سے باہر شادی نہ کرنا، مزاروں کو پوجنا وغیرہ
رسومات جس نے اسلامی معاشرے کو کھوکھلا کر دیا تھا۔ بیگم
صغرا بھی ایسی ہی رسومات کے خلاف آواز بلند کرتی نظرآتیں
ہیں۔ وہ لکھتی ہیں کہ پھر ریزولیوشن نمبر ۷ پیش ہوا جس
کا مضمون یہ تھا کہ تمام ہند کی عورتوں کو گھر کی صفائی
ستھرائی کی جانب متوجہ کرنا چاہیے اور اصول حفظانِ صحت
سے باخبر کرنا چاہیے۔ اس کے بعد مسز امیر حسن نے
ریزولیوشن نمبر ۸ پیش کیا کہ لڑکیوں کی شادی کم سنی میں
نہ کی جائے۔ جس کی وجہ سے تعلیم رک جاتی ہے اور بہت
سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔[۹۷] اس عہد کی عورت مختلف
قسم کی حدود و قیود میں جکڑی ہوئی تھیں جن کی پاسداری
انھیں اچھی بیٹی، بہو اور بیوی ثابت کرتی تھی۔ مصنفہ ایک
اور معاشرتی رویہ کا اظہار ان الفاظ میں کرتی ہیں ۔ بیگم
صاحبہ حکیم شفاء الملک آج مجھ سے ملنے آئیں کہ کل جو
جلسے میں شریک نہ ہو سکیں، اس کی معذرت کی اور کہنے
لگیں کہ میرے خاندان کے رواج کے خلاف پارٹیوں اور جلسوں
میں جانا ہے۔ اس لیے یہ مجبوری نہ آئی۔ چنانچہ قیصر ہند
جارج پنجم نے دلی میں دربار کیا تھا اور بادشاہ بیگم نے زنانہ
پارٹی دلی کی بیگمات اور دیگر روسا دلی کی خواتین کو دی
تھی۔ میں بھی مدعو کی گئی تھیں لیکن رواج خاندان نے جانے
نہ دیا۔[۹۸] اسی طرح کے معاشرتی رویوں نے طبقہ اناث کا

استحصال کیا اور وہ بے زبان حیوانات کی مانند زندگی بسر کرنے پر مجبور تھیں۔ جدید انگریزی تعلیم سے مزین کچھ خواتین آگے بڑھیں اور انھوں نے بیداری و اصلاح نسواں کا بیڑا اٹھایا۔ ان میں بیگم سر بلند جنگ بہادر شامل ہیں۔ انھوں نے بھی معاشرتی اصلاح کے لیے سفرنامہ تخلیق کیا۔ اس زمانے میں اس قسم کی تحریروں کا مقصد معاشرے میں شعور و آگاہی پیدا کرنا تھا۔ بیگم صاحبہ بھی جس جگہ اور جس مقام پر گئیں انھوں نے اسی مقصد کو پیشِ نظر رکھا۔ ان کے سفرنامے دوسری تہذیب و معاشرت میں موازنے کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ وہ جہاں بھی لوگوں میں خوبی دیکھتی ہیں اپنے وطن کے لوگوں کو یاد کرنے لگتی ہیں۔محمودہ عثمان حیدر ہندوستانی عورتوں کی پسماندگی کو یوں بیان کرتی ہیں کہ اسی زمانے میں ہندوستان سے جو مستورات مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کے لیے آئی تھیں۔ وہ اپنی پرانی وضع کے سفید برقعے پہنے نمائش میں بھی گئیں۔ وہاں ان کی بھی نمائش ہو گئی۔ ادھر سے لوگ بڑے تعجب سے دیکھتے اور فوٹو لیتے تھے۔ ایک موقع پر چند نوجوان ترکی اور شامی لڑکیوں نے چند ہندوستانی برقعہ پوش مستورات کو گھیر لیا اور برقعے اٹھا اٹھا کر دیکھنا شروع کر دیا۔ اتفاق سے ہماری یہ ہندی بہنیں تنگ پاجامے اور سر سے پیر تک زیورات میں لدی ہوئی تھیں۔ دیکھنے والیوں کے لیے ایک عجیب تماشا ہو گیا اور تھوڑی دیر میں ان کے گرد سینکڑوں لوگ جمع ہو گئے۔[۹۹] مصنفہ ایک اور جگہ ایرانی خواتین کے بارے میں لکھتی ہیں کہ ایرانی مستورات نے بھی بجائے جدید برقعے کے جو عموماً سیاہ ریشم کا اور بڑا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ اب لیڈیز ہیٹ کا استعمال شروع کر دیا ہے۔ جس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ ایران سے برقعہ پوشی کا رواج ترکی کی طرح معدوم ہو جائے گا۔ بلکہ یہی رفتار خواتین عراق و شام کی ہے۔[۱۰۰]

بیگم حسرت کا سفرنامہ عراق ایک مخصوص عہد کی داستان لگتا ہے۔ جو بیسویں صدی کا المناک ترین دور تھا اور مصنفہ نے جس کو جیا اور جھیلا بھی تھا۔ وہ تحریکِ آزادی کے کارواں میں شامل رہیں اور اپنی آخری سانس تک اس جدوجہد میں برسرِ پیکار رہیں۔ ان کے عہد میں ہندوستانی خواتین اپنے حقوق کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں اور اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے سماج سدھار کا فریضہ انجام دے رہی تھیں۔ لیکن پھر بھی ہندوستانی عورت دیگر ممالک کی خواتین سے بہت پیچھے تھیں اور معاشرے کے پیدا کردہ رسوم میں بڑی طرح جکڑی ہوئی تھیں۔ اپنے سفرنامہ میں عورت کی اسی قسم کی بے بسی کو یوں بیان کرتی ہیں کہ سینما میں میرے پاس اتفاق سے دہلی کی ایک ماں بیٹی بیٹھی تھی۔ میاں ان کے سولہ سال سے یہاں ہیں۔ بیوی اور بڑی لڑکی سال بھر سے آئی ہوئی ہیں۔ باپ نے لڑکی کا نکاح ماں کی مرضی کے خلاف ایک تین بچوں کے باپ سے کردیا۔ جن کی پہلی بیوی فوت ہو چکی ہے۔ وہ بھی ہندوستانی تھی اور کل یہاں خانقاہ شریف میں دونوں ماں بیٹیاں ملنے بھی آئیں تھیں۔اپنی مصیبت بیان کرتی رہیں۔ [101]

یہ تمام سفرنامہ اس عہد کی تصویریں ہیں جہاں عورت استحصال کی چکی میں پس رہی تھیں۔ ان کا اپنا کوئی وجود نہیں تھا۔ وہ معاشرے کا غیر اہم پرزہ سمجھی جاتیں تھیں۔ ان کا فرض صرف باپ، بیٹے اور شوہر کی خدمت گزاری تھی اور اسے جذبات سے عاری کوئی مخلوق سمجھ کر اُس کے ساتھ ناروا سلوک روا رکھنا ہندوستانی معاشرے میں صدیوں سے چلا آرہا تھا۔ نوآبادیاتی عہد میں جدید تعلیم نے معاشرے کے ہر فرد کو یہ شعور دیا کہ اسلام میں عورت کے مقام و مرتبہ کو پہچانو اور گناہ کے مرتکب نہ ٹھہرو۔

حوالہ جات

۱۔ سیّد نور اللہ، تاریخ تعلیم ہند ،(نئی دہلی: نیشنل بک ٹرسٹ، ۱۹۷۳ء)، ص ۶۲۔

۲۔ سیمیں ثمر فضل، ہندوستانی مسلم خواتین کی جدید تعلیمی ترقی میں ابتدائی اردو ناولوں کے حصّہ، ص۸۵۔

۳۔ سیّد نور اللہ، تاریخ تعلیم ہند، ص۱۴۷۔

۴۔ جوگیش سی بگل، *Women Education in Eastern India*،(کلکتہ، ۱۹۵۶ء)، ص۶۲۔

۵۔ سیّد نور اللہ، تاریخ تعلیم ہند، ص ۱۵۶۔

۶۔ کے۔ ایم۔ پنکر، *The Foundation of New India* ، (لندن، ۱۹۶۳ء)، ص ۱۲۰۔

۷۔ شیخ عبد اللہ،خاتون (۱۹۰۶ء)، ص ۴۹۔

۸۔ سیمیں ثمر فضل، ہندوستانی مسلم خواتین کی جدید تعلیمی ترقی میں ابتدائی اردو ناولوں کا حصّہ، ص۱۰۱۔

۹۔ ڈاکٹر نسیم آرا،اردو صحافت کے ارتقا میں خواتین کا حصہ،(کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۸ء)، ص۸۰۔

۱۰۔ سید انصاری، ہندوستانی تعلیم اور اس کے مسائل ، (دہلی: حالی پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۴۶ء)، ص۱۲۶۔

۱۱۔ سیمیں ثمر فضل، ہندوستانی مسلم خواتین کی جدید تعلیمی ترقی میں ابتدائی اردو ناولوں کا حصّہ،ص ۱۱۵۔

۱۲۔ ڈاکٹر فرحت جہاں، بیسویں صدی میں خواتین کی غیر افسانوی نثر ایک مطالعہ، ص ۱۴۔

۱۳۔ ترنم ریاض، بیسویں صدی میں خواتین کا اردو ادب، (دہلی: ساہتیہ اکادمی، ۲۰۰۴ء)، ص۸۔

۱۴۔ ڈاکٹر قمر رئیس، تلاش و توازن، (دہلی: خرم پبلی کیشنز، ۱۹۶۸ء)، ص۲۰۔

۱۵۔ محمد امین زبیری، بیگمات بھوپال، ص ۴۳۔

۱۶۔ ڈاکٹر محمد شہاب الدین ، اردو میں حج کے سفرنامے ،ص ۶۵۔۶۶۔

۱۷۔ محمد امین زبیری، بیگمات بھوپال، ص ۱۰۵۔

۱۸۔ ڈاکٹر رضیہ حامد، نواب سلطان جہاں بیگم، ص ۲۴۹۔

۱۹۔ محمد امین زبیری، بیگمات بھوپال، ص ۱۰۵۔

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۳۱۔

۲۱۔ ڈاکٹر فرحت جہاں، بیسویں صدی میں خواتین کی غیر افسانوی نثر ایک مطالعہ، ص۱۳۳۔

۲۲۔ نازلی رفیعہ سلطان،سیرِ یورپ، ص ۳۷۔۳۸۔

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۹۷۔

۲۴۔ نصیر الدین ہاشمی، حیدرآباد کی نسوانی دنیا، ص ۵۲۔

۲۵۔ بیگم صغرا ہمایوں، روزنامچہ سفر بھوپال و آگرہ و دہلی کے حالات، ص ۷۴۔

۲۶۔ ایضاً، ص ۲۸۔

۲۷۔ بیگم صغرا ہمایوں، سفرنامہ یورپ، ص ۵۵۔

۲۸۔ ایضاً، ص ۱۲۲۔

۲۹۔ ڈاکٹر فرحت جہاں،بیسویں صدی میں خواتین کی غیر افسانوی نثر ایک مطالعہ، ص ۱۳۶۔

۳۰۔ عطیہ فیضی، زمانۂ تحصیل ، (کراچی: ادارۂ یادگار غالب، ۱۹۲۲ء)، ص ۶۰۔

۳۱۔ ایضاً، ص ۷۶۔

۳۲۔ عبد الشکور (پرنسپل)، حسرت موہانی،ص ۱۰۱۔

۳۳۔ سید محمد اصغر کاظمی، حسرت موہانی کی چند نادر و نایاب تحریریں، (لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء)، ص۲۳۸۔

۳۴۔ ایضاً، ص ۲۳۵۔

۳۵۔ ایضاً، ص ۲۳۲۔

۳۶۔ بیگم صغرا ہمایوں، روزنامچہ سفر بھوپال وآگرہ و دہلی کے حالات، ص ۱۰۔

۳۷۔ بیگم سربلند جنگ بہادر، دنیا عورت کی نظر میں، ص ۵۳۔

۳۸۔ ایضاً، ص ۵۱۔

۳۹۔ محمودہ عثمان حیدر، مشاہدات بلادِ اسلامیہ ، ص۱۳۹۔

۴۰۔ ایضاً، ص ۱۴۰۔

۴۱۔ اشتیاق حسین قریشی، برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ،(کراچی:کراچی یونیورسٹی، ۱۹۹۹ء)، ص۲۰۷۔

۴۲۔ معین الدین عقیل، آزادی کی قومی تحریک، (لاہور: مکتبہ تعمیرِ انسانیت، س۔ن۔)، ص ۵۲۔

۴۳۔ اشتیاق حسین قریشی، برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، ص ۱۰۵۔

۴۴۔ ابوسلمان شاہ جہاں پوری، تحریکاتِ ملی، (کراچی: المخزن پرنٹرز،س۔ن۔)، س۱۱۔

۴۵۔ معین الدین عقیل، آزادی کی قومی تحریک، ص ۳۴۔

۴۶۔ شیخ محمد اکرام، موجِ کوثر، ص ۵۸۔

۴۷۔ محمد مجیب، ہندوستانی سماج پر اسلامی اثر ، (کراچی: بک ٹائم، ۲۰۱۱ء)، ص ۷۰۔

۴۸۔ شیخ محمد اکرام، موجِ کوثر، (لاہور: رفاعی پرنٹرز، ۲۰۰۷ء)، ص ۱۲۔

۴۹۔ معین الدین عقیل، آزادی کی قومی تحریک، ص ۶۱۔

۵۰۔ ایضاً، ص ۶۹۔

۵۱۔ عزیز احمد، برصغیر میں اسلامی جدیدیت ، (لاہور: فائن بک پرنٹرز، ۲۰۰۶ء)، ص ۶۴۔

۵۲۔ شیخ محمد اکرام، موجِ کوثر، ص۸۷۔

۵۳۔ معین الدین عقیل، تحریک آزادی میں اردو کا حصّہ ، (لاہور: علی پرنٹرز، ۲۰۰۸ء)، ص ۷۵۔

۵۴۔ اشتیاق حسین قریشی، برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ ، ص۳۷۳۔

۵۵۔ معین الدین عقیل، آزادی کی قومی تحریک، ص۷۲۔

۵۶۔ ایضاً، ص ۷۳۔

۵۷۔ ایضاً، ص ۷۳

۵۸۔ ایضاً، ص ۵۵۔

۵۹۔ ایضاً، ص ۵۶۔

۶۰۔ ایضاً، ص ۵۷۔

۶۱۔ ایضاً، ص ۵۷۔

۶۲۔ ایضاً، ص ۶۲۔

۶۳۔ اشتیاق حسین، برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، ص ۲۷۲۔

۶۴۔ معین الدین عقیل، تحریکِ آزادی میں اردو کا حصّہ، ص ۲۳۰۔

۶۵۔ ابو سلمان شاہ جہاں پوری، تحریکاتِ ملی، ص۳۵۸۔

۶۶۔ ایضاً، ص ۲۹۷۔

۶۷۔ معین الدین عقیل، تحریکِ آزادی میں اردو کا حصّہ، ص ۲۹۵۔

۶۸۔ ابو سلمان شاہ جہاں پوری، تحریکاتِ ملی، ص ۳۲۷۔

۶۹۔ معین الدین عقیل، تحریکِ آزادی میں اردو کا حصّہ، ص ۲۲۸۔

۷۰۔ ایضاً، ص ۲۲۲۔

۷۱۔ ابو سلمان شاہ جہاں پوری، تحریکاتِ ملی، ص ۲۸۴۔

۷۲۔ ایضاً، ص ۱۵۲۔

۷۳۔ معین الدین عقیل، آزادی کی قومی تحریک، ص ۶۵۔

۷۴۔ ایضاً، ص ۶۶۔

۷۵۔ نازلی رفیعہ سلطان، سفرنامہ سیرِ یورپ، ص ۱۲۳۔

۷۶۔ ایضاً، ص ۱۰۵۔

۷۷۔ ایضاً، ص ۳۷۔
۷۸۔ صغرا ہمایون بیگم ، سفرنامہ پونہ و مدراس، ص ۳۷۔
۷۹۔ صغرا ہمایون بیگم، سفرنامہ بھوپال و آگرہ اور دہلی کے حالات، ص ۸۷۔
۸۰۔ عطیہ فیضی، زمانۂ تحصیل، ص ۸۴۔
۸۱۔ بیگم سر بلند جنگ بہادر، دنیا عورت کی نظر میں ، ص ۱۷۷۔
۸۲۔ نواب سلطان جہاں، روضۃ الریاحین،ص ۱۱۔
۸۳۔ بیگم سربلند جنگ بہادر، دنیا عورت کی نظر میں، ص ۸۔
۸۴۔ ایضاً، ص ۱۲۔
۸۵۔ ایضاً، ص ۱۵۔
۸۶۔ ایضاً، ص ۱۷۶۔
۸۷۔ بیگم صغرا ہمایون مرزا، روزنامچہ سفر بھوپال و آگرہ، ص ۲،۳۔
۸۸۔ ایضاً، ص ۳۔
۸۹۔ بیگم صغرا ہمایوں،پردہ،مشمولہ: تہذیبِ نسواں ، محمدی بیگم، (لاہور: جلد ۲۱، ۱۵ جون ۱۹۱۸ء)، ص۳۸۵۔
۹۰۔ بیگم صغرا ہمایوں، سفرنامہ پونہ و مدراس وغیرہ، ص ۱۲۔
۹۱۔ نازلی رفیعہ سلطان، سیرِ یورپ، ص۱۲۳۔
۹۲۔ محمد مجیب، ہندوستانی سماج پراسلامی اثر ، ص ۶۴۔
۹۳۔ بیگم صغرا ہمایوں، سفرنامہ بھوپال و آگرہ اور دہلی کے حالات، ص ۳۔
۹۴۔ نازلی رفیعہ سلطان، سیرِ یورپ، ص ۵۷۔
۹۵۔ عطیہ فیضی، زمانۂ تحصیل، ص ۶۳۔
۹۶۔ ایضاً، ص ۵۳۔
۹۷۔ بیگم صغرا ہمایوں ، سفرنامہ بھوپال و آگرہ اور دہلی کے حالات، ص ۱۰۔
۹۸۔ ایضاً، ص ۱۰۳۔
۹۹۔ محمودہ عثمان حیدر، مشاہداتِ بلادِ اسلامیہ ، ص ۳۶۔
۱۰۰۔ایضاً، ص ۱۵۔
۱۰۱۔بیگم حسرت موہانی، سفرنامہ عراق، ص ۱۱۵۔

مجموعی جائزہ ، نتائج و سفارشات

مجموعی جائزہ:

برصغیر پاک و ہند اپنی جغرافیائی اور معاشی اہمیت کی وجہ سے ہمیشہ سے ہی بیرونی طاقتوں، سیاحوں اور تاجروں کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ یہ خطہ اپنی زرخیزی اور قدرتی معدنیات سے مالا مال ہونے کی وجہ سے نو آباد کا روں کی آمجگاہ بنا رہا ۔ اسے زمانے قدیم میں سونے کی چڑیا سے تعبیر کیا گیا۔ یہ متعدد تہذیبوں اور مذاہب کا گہوارہ رہا ہے۔ اس سر زمین پر جو بھی حکمران آیا وہ اس کے طلسماتی سحر میں کھو کر یہیں کا ہو کر رہ گیا۔سولھویں صدی عیسوی میں انگریز تاجروں کے روپ میں اس سر زمین میں داخل ہوتے اور

پہلے پہل "ایسٹ انڈیا کمپنی" کے نام سے ایک تجارتی کمپنی کے حقوق مغل سلطنت سے حاصل کیے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنی خوشامد اور سلطنت کے خیرخواہ بن کر ۱۶۱۳ء میں سورت (گجرات) میں اپنی فیکٹری قائم کی اور پھر آہستہ آہستہ کلکتہ ، مدارس، بمبئی ، بہار اور ملک کے دوسرے حصوں میں انگریزوں کی سازشوں کا جال بچھتا گیا۔ انھوں نے جلد ہی اپنا سیاسی اثر و رسوخ پیدا کر لیا اور آہستہ آہستہ اپنی جڑیں ہندوستان میں مضبوط کرنے لگے۔ یہ موقع انہیں اورنگزیب کی وفات کے بعد ملا اور وہ بل آخر اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو گئے۔

اورنگزیب عالم گیر کی وفات ۱۷۰۷ء کے بعد نااہل جانشیوں کی خانگی سازشوں اور عیش و عشرت نے مغلیہ سلطنت کو زوال کی جانب دھکیل دیا اور انگریز کمپنی اپنے مقاصد کے حصول میں کامیاب ہونے لگی۔ بالآخر ۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی اور ۱۷۶۴ء میں بکسر کی لڑائی نے اس کمپنی کو ہندوستان پرحکمرانی کا موقع فراہم کر دیا۔ اب مغل حکمران صرف نام کے پنشن گزار بادشاہ رہ گئے ۔ ساری سلطنت انگریزوں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ کمپنی بہادر کی سیاسی چالوں، مغل حکمرانوں کی مفلسی اور غریب عوام کے استحصال سے بہت سی تاریخی کتابیں بھری پڑیں ہیں۔ نو آبادیاتی نظام کے اثرات جہاں دیگر جگہوں پر اثر انداز ہوئے وہیں ادب بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

ہندوستانی عوام کی غلامی کا یہ دور تقریباً دو صدیوں پر محیط ہے۔ اس عہد میں نہ صرف علوم و فنون اور دوسرے شعبہ ہائے زندگی میں ترقی ہوئی بلکہ اس دور میں بر عظیم کے باشندوں کی ذہنی و نفسیاتی زندگی میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں، جنھوں نے آئندہ زندگی میں اپنے خطے میں بسنے والی تمام قوموں کے انفرادی و اجتماعی شعور پر دیر پا اثرات مرتب کیے۔

اس نو آبادیاتی عہد نے تمام شعبہ ہائے زندگی کو بدل کر رکھ دیا۔ ادب بھی نو آبادیاتی عہد کے اثرات و ثمرات سے گہرے طور پر متاثر ہوا۔ اس دور میں بہت سی شعری اصناف کے ساتھ ساتھ نثری اصناف کا بھی اضافہ ہوا۔جس میں تنقید ، مضمون نگاری، ناول ، افسانہ ، سوانح وغیرہ اہم ہیں۔ نئے اسالیب متعارف ہوئے ، معروضیت ، مدعانگاری اور حقیقت نگاری کا چلن عام ہوا۔ ادب کو ذہنی و روحانی واردات کے منطقہ سے نکال کر خارجی مظاہر کا ترجمان بنانے پر اصرار ہوا۔ سماجی و ثقافتی اور سیاسی مسائل پہلے سے کہیں زیادہ وضاحت اور شدت سے براہ راست ادب کا حصہ بننے لگے۔ مضمون نگاری، سوانح عمری اور تاریخی قصہ نویسی کے ساتھ ساتھ سفر نامہ بھی اس عہد کا معتبر سرمایہ بنا۔

زیرِ نظر مقالہ میں خواتین سفر نامہ نگاروں کے حوالے سے تفصیلی بحث ہو چکی ہے ۔ اس میں ان خواتین کے سفرناموں پر بات کی گئی ہے جو نوآبادیاتی عہد میں نہ صرف اس میں طبع آزمائی کر رہی تھیں بل کہ انہوں نے اپنے ملک سے باہر کی دنیا بھی دیکھ رکھی تھی یہی وجہ ہے کہ وہ خواتین نہ صرف اپنے ماحول سے آگاہ ہوئیں بل کہ ان کی تحریروں پر بیرونی اثرات بھی مرتب ہوئے ۔ راقمہ نے ان سفرناموں کو نو آبادیاتی عہد کے حوالے سے دیکھا ہے ۔ ان کی تہذیب ، معاشرت ، رہن سہن ، رسم و رواج کے ساتھ ساتھ اس دور میں حقوق نسواں کے حوالے سے جو آوازیں بلند ہو رہی تھیں اور جو تعلیمی اصلاحات نافذ کرنے کے اقدامات ہو رہے تھے انہیں بھی اپنی تحریروں خصوصاً سفر نامہ کا حصہ بنایا ۔ ان خواتین کی ان کوششوں کو بھی ان کے سفرناموں کی روشنی میں دیکھا جا سکتا ہے جو وہ مقامی خواتین کی تعلیم و تربیت کے میدان میں کر رہی تھیں ۔ جنہیں راقمہ نے مختلف مثالوں کی صورت میں بیان کیا ہے ۔

سفر پر جانا عام نہ تھا اور اگر طبقہ اشرافیہ کی خواتین کو یہ مواقع میسر بھی تھے تو ان کے احوال بیان کرنے کی جرأت اور صلاحیت مفقود تھی۔ ایسے میں ان خواتین نواب سکند ر بیگم(تاریخِ وقائع حج)، نواب سلطان جہاں بیگم(روضہ الریاحین)، ، نازلی رفیہ سلطان(سیرِ یورپ)، ، سربلند جنگ بہادر بیگم(دنیا عورت کی نظر میں) ، صغرا ہمایوں مرزا(سفرنامہ یورپ اور سفرنامہ عراق)، شاہ بانو (سیاحتِ سلطانی)، عطیہ فیضی(زمانۂ تحصیل)، محمودہ عثمان حیدر (مشاہداتِ بلادِ اسلامیہ)، اور بیگم حسرت موہانی(سفرنامہ عراق)، وغیرہ نے اپنے سفر کے احوال بیان کرنے کی جرات دکھائی اور یہ نہ صرف خود اپنے معاشرے کی سیاسی و سماجی صورت حال پر اپنی رائے کا اظہار کیا بلکہ جن ممالک کی سیر کی ان ممالک کی بھی سماجی و تہذیبی زندگی اور سیاسی نظام پر بھی اظہار خیال کیا۔

بعض مقامات پر تو دونوں کے تقابل کے ذریعے اپنے واضح سیاسی و سماجی شعور کا اظہار کیا۔ ان سفر ناموں کا مطالعہ برعظیم پاک و ہند کی ذہنی و فکری تاریخ کے ایک اہم دور کا مطالعہ ہے۔ جو بعدمیں اآنے والی نسلوں کی ذہنی و فکری نشوونما اور پرداخت کا وسیلہ بنا۔ اس کے علاوہ یہ سفر نامے اس لیے بھی اہمیت رکھتے ہیں کہ اس عہد میں خواتین کی تعلیمی حالت، سماجی شعور اور فکری بیداری کا اظہار کس طرح ہوتا ہے۔ ان کا علمی ، سیاسی و سماجی خاندانی پس منظر بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اردو میں خواتین سفر ناموں کے نمونے بیسویں صدی کے اوائل میں ملتے ہیں بلکہ اس سے قبل بھی ہندوستانی خواتین کے سفر ناموں کے نمونے پائے جاتے ہیں جس میں بیگمات بھوپال نواب سکندر بیگم کا یادداشت تاریخ و قائع حج اور نواب سلطان جہاں کا رو ضہ الریاحین(سفرنامہ سفر کشورحجاز)اپنے عہد کے نمائندہ سفر نامے ہیں۔ لیکن بیسویں صدی میں خواتین نے کثرت سے

سفر نامے لکھے۔ اس میں حج کے سفر نامے شامل ہیں۔ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس عہد کی خواتین نے سفر نامے تحریر کرنے پر بھی توجہ دی اور بڑے عمدہ سفری احوال تخلیق کیے۔

یہ تمام سفر نامہ نگار خواتین اپنے عہد کی نا مور خواتین تھیں۔ ان کا تعلق پڑھے لکھے ، کھاتے پیتے اور باشعور خاندان سے تھا۔ انھوں نے اپنے وقت کی سیاسی و اصلاحی تحریکوں میں حصہ لیا اور زمانے کی دوڑ میں ہندوستانی عورتوں کو شامل کرنے کے لیے فریضہ انجام دیا۔انھوں نے تعلیم و بیداری نسواں کے لیے مختلف وسائل میں مضمون نگاری کی ، مدارس قائم کیے، شہروں شہروں جا کر کانفرنسوں اور جلسوں کی صدارت کے علاوہ ان میں شمولیت بھی کی۔ خواتین سے رابطے کے لیے ملک گیر تحریکیں چلائیں اور انھیں جدید تعلیم کے لیے بھی اکسایا۔ بعض خواتین نے سفر نامہ نگاری کے ساتھ ناول نگاری بھی کی جس میں صرف خواہش کی فلاح و بہبود اور سماجی شعور کا نظریہ کار فرما ہے۔اس سلسلے میں بیگمات بھوپال کی خدمات کسی سے پوشیدہ نہیں ۔ ان خواتین نے مسلمان عورتوں کی تعلیمی اور سماجی اصلاح کے لیے انھیں موثر ذریعہ کے طور پر کام لیا۔ چنانچہ اردو کے ابتدائی سفر ناموں نے ہندوستانی مسلمان عورتوں کی ذہنیت کو بدلنے اور ان کی پس ماندگی کو دور کرنے اور انھیں جدید تعلیم کی اہمیت سے روشناس کرانے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے اپنے سفر ناموں میں اپنے عہد کی سماجی و ثقافتی اقدار کی بھی ترجمانی کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ جس ملک میں بھی گئیں اپنی تہذیب و معاشرت کا موازنہ دوسرے معاشرے کا موازنہ دوسرے معاشرے کی تہذیب سے ضرور کیا۔ جو اچھی چیزیں اپنے ملک کی تھیں ان کا اظہار کسی دوسری جگہ کی خامی کو دیکھ کر کیا۔ ان سفر ناموں سے لگتا ہے کہ جیسے سماج سدھار مقصد کے تحت ان کوتخلیق کیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر ان سفر ناموں کی سیاسی، سماجی اور

تاریخی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ۔ ان میں قدیم ہندوستانی تہذیب و معاشرت کی عکاسی ہوتی ہے۔

نتائج:

اس عہد کی خواتین کے اردو سفر ناموں کا جب مطالعہ کریں تو تمام سفر ناموں میں ایک بات یکساں ہے کہ ہر ایک نے شعوری طور پر تعلیم و بیداری نسواں کا بیڑا اٹھایا ہے۔وہ خود بھی اس وقت کی سیاسی و تعلیمی اور اصلاحی تحریکوں سے متاثر تھیں اور وہ اپنے حلقے اور گروہ میں بڑی متعدی سے اپنی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئیں تھیں۔

راقمہ کے زیر مطالعہ سفر نامہ نگار خواتین کا تعلق چونکہ طبقہ اشرافیہ سے تھا اس لیے انہیں اس دور میں چلنے والی ذہنی و فکری بیداری کے عمل نے دیگر خواتین کی نسبت زیادہ متاثر کیا ۔ اس بات کا اظہار ان کے سفرناموں ، دیگر تحریروں اور اصلاحی جدوجہد سے ہوتا ہے۔ جیسے بیگم صغرا ہمایوں کے ناولوں اور مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی ان تحریروں کے ذریعے ہندوستانی عورتوں میں معاشرتی ، علمی اور سیاسی سطح پر بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی۔ بیگم حسرت موہانی سیاسی جدوجہد میں اپنے شوہر کے ساتھ برسرِ پیکار رہیں۔ انھوں نے جدوجہد آزادی میں اپنے عمل اور تحریروں سے حصہ لیا۔ عطیہ فیضی ، نازلی فیضی، محمودہ عثمان حیدر اور بیگم سر بلند جنگ کی ہندوستانی عورتوں کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور انھیں معاشرے کا کار آمد رکن بنانے میں اہم خدمات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہیں۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض موقعوں پر ان خواتین سفر نامہ نگاروں نے اپنے سفر ناموں میں جس جرأت مندانہ انداز میں مختلف کیفیات اور واقعات کی نشاندہی کی ہے، وہ ہمیں اس دور کے مرد سفر نامہ نگاروں

کہ یہاں نظر نہیں آتے۔ ان خواتین نے اپنے زمانے کی مروجہ رسوم و بدعات کے خلاف جہاد کیا اور انھوں نے اپنے سفر ناموں کے ذریعے یورپی ممالک کی تہذیب و معاشرت سے آشنا کروایا تاکہ ہندوستانی خواتین جہالت کی گمراہیوں سے نکل سکیں۔

راقمہ السطور نے ایک بات شدت سے محسوس کی ہے کہ ان سفر ناموں میں روایتی انداز پائے جاتے ہیں۔ انھوں نے زیادہ تر جغرافیہ، تاریخ، حدود، سماج اور سیاست پر زور دیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ ہندوستانی عورتوں کو دوسری دنیا دکھا نے میں رہنمائی کر رہی ہیں۔ زیادہ تر سفر نامے خطوط اور روزنامچے کی تکنیک میں لکھے گئے ہیں۔

مقالے میں جن سفر ناموں کا مطالعہ کیا گیا ہے وہ تمام کتابی صورت میں موجود ہیں۔ کچھ سفر نامے ایسے ہیں جوکتابی صورت میں اشاعت سے پہلے رسائل میں قسط وار شائع ہوتے رہتے ہیں ۔ جیسے یورپ (نازلی بیگم)، زمانہ تحصیل (عطیہ فیضی) بیگم صغرا ہمایوں کے تقریباًتمام سفر نامے، سفر نامہ عراق (بیگم حسرت) ۔ اس موضوع پر تحقیق کے دوران مختلف ذرائع سے نو آبادیاتی عہد کے دیگر سفر ناموں کے نام اور ان کی تفصیلات بھی دستیاب ہوتی ہیں، جن تک رسائی ممکن نہیں ہو سکتی۔ جیسے امۃ الغنی نور النساء کا "سفر نامہ حجاز ، شام و مصر" اور راحیل شروانیہ کا "زادالسبیل'' ہے ۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ سفر نامہ بھارت کی لائبریریوں میں موجود ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی ایک محقق کے لیے تمام سفر ناموں کو حاصل کرلینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ چنانچہ ان سفر ناموں کے ناموں کا سامنے آنا بھی تحقیق کے لیے اور درواکرنے کے برابر ہے تاکہ آئندہ کام کرنے والوں کو آسانی ہو۔

اس موضوع پر کام کرتے ہوئے راقمہ کو بہت سی مشکلات کا سامنا اس وقت کرنا پڑا جب ان تمام خواتین کے

سیاسی و سماجی اور علمی پس منظر کو بیان کرنا تھا۔ خاص طور پر بیگم سر بلند جنگ بہادر اور محمودہ عثمان حیدر کے بارے میں معلومات کہیں بھی دستیاب نہ ہو سکیں۔ حتی کہ ایک عرصہ لگا بیگم سر بلند کے اصل نام تک رسائی حاصل کرنے میں، راقمہ نے اس عہد کے رسائل تہذیب النسواں، عصمت اور خاتون کھنگال ڈالے مگر نا کامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ پھر تذکروں میں تلاش بیسار کے بعدکچھ معلومات دستیاب ہوئیں۔ اس تحقیقی کام میں سفر ناموں کے علاوہ تذکروں سے بھی کافی مدد ملی ۔جن میں خصوصاً خواتین کے حالات زندگی شامل ہیں جو کہیں اور دستیاب نہ ہو سکے ۔ یہی حال محمودہ عثمان کے سلسلے میں رہا اور سفر نامہ مشاہدات بلا داسلامیہ میں موجود معلومات پر اکتفا کرنا پڑا۔

دوران تحقیق دو نایاب سفر نامے بھی دستیاب ہوئے ۔ ان میں سے ایک کا تذکرہ ڈاکٹر قدسیہ قریشی نے اپنی کتاب "اردو سفر نامے انیسویں صدی میں" کیا ہے۔ مگر اس کے متعلق یہ معلومات فراہم کی ہیں کہ یہ سفر نامہ یاداشت تاریخ وقائع حج کے نام سے غیر مطبوعہ حالت میں رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے ۔مگر راقمہ کو یہ سفر نامہ انگریزی زبان میں شائع شدہ ملا اور اس کی انیسویں صدی میں اولین اشاعت کے بارے میں بھی معلومات دستیاب ہوئیں۔ دوسرا سفر نامہ بھی بیگم بھوپال ، نواب سلطان جہاں کاسفر نامہ روضتہ الریاحین (سفرِ کشورِ حجاز)کی تمام تاریخی کتب میں نہیں ہے۔ حالانکہ یہ قدیم سفر نامہ ہے اور بیگمات بھوپال پر تحریر کی گئیں تمام کتب میں ان کے اسفار اور سفر ناموں کے بارے میں معلومات درج ہیں ۔ لیکن کسی نے بھی ان سے استفادہ نہیں کیا اور خواتین کے سفر ناموں کی روایت ان کے ذکر کے بغیر ہی رہی۔

ان خواتین کے سفر ناموں کی دستیابی کے بعد راقمہ کی تحقیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بیگم نازلی رفیعہ سلطان کے

سفر نامے سے پہلے نواب سکندر جہاں بیگم کا سفرنامہ تحریری صورت میں انگریزی زبان میں ۱۸۷۰ عیسویں میں شائع ہو چکا تھا ۔یوں زمانی لحاظ سے نواب سکندر جہان بیگم کا سفرنامہ اردو ادب کی سفر نامہ نگاری میں اولیت رکھتا ہے ۔ علاوہ ازیں راقمہ نے تحقیق کے دوران ایک اور سفرنامہ بھی دریافت کیا ہے جس کا ذکر کسی تاریخی کتاب میں نہیں ملتا ۔ یہ سفرنامہ روضتہ الریاحین (سفرِ کشورِ حجاز)کے نام سے مطبع سلطان سے شائع ہوا ہے اس سفرنامے کے آخری صفحے پہ مصنفہ کی جانب سےبتاریخ ۸ جمادی الثانی ۱۳۲۲ ہجری درج ہے۔

ان سب سفر ناموں کے مطالعے سے ایک نمایاں خصوصیت یہ سامنے آتی ہے کہ سب میں مشترک موضوعات ، اسلوب ، متاثر اور رجحان ملتے جلتے ہیں اور ایک دوسرے سے مماثل دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں ہندوستان، یورپی ممالک اور بلاداسلامیہ کا ہر پہلو زیر بحث آیا ہے۔ ان کے ذریعے اس عہد کی تاریخی، سیاسی ، سماجی ، مذہبی رجحانات کا سراغ ملتاہے۔ان سفر ناموں کے مبسوط مطالعے سے یہ بھی پتہ چلتاہے کہ سفر نامہ نگار روشن خیال، تعلیم یافتہ اور کشادہ ذہن کی مالک تھیں ۔ تمام یورپی سفر نامہ نگار خواتین دیگر ہندوستانی لوگوں کی نسبت برطانوی استعماری طاقتوں پر برہمی کا اظہار کرتی نہیں پائی جاتیں۔

راقمہ کے زیرمطالعہ جو کتابیں رہیں اس میں ایک سفر نامہ نگار عزلت بیگم کا ذکر پایا گیا اور ایک "سفر نامہ عراق"بھی ان سے منسوب تھا مگردوران تحقیق یہ بات بھی سامنے آئی کہ ’’عزلت بیگم ‘‘صغرا ہمایوں کا لقب ہے اور انہی کے سفر نامہ عراق کودو مختلف ناموں سے منسوب کر دیا گیا جو ۱۹۱۵ء میں شائع ہوا۔ یہ ایک بڑی تحقیقی خامی ہے جو بعد میں آنے والی تحقیقات میں جوں کی توں بیان ہوتی رہی ۔راقمہ نے دوران تحقیق دکن کی خواتین کے

دستیاب شدہ تذکروں سے جو استفادہ کیا ان میں بھی اس خاتون "عزلت بیگم" کا نام نہیں ملا کہ جس نے سفر نامہ عراق لکھا ہو۔ یہ امر بھی افسوس ناک ہے کہ قدیم عہد کی خواتین کے سفر ناموں پر تفصیلی کام نہیں ہوا۔ عطیہ فیضی کے سفرنامہ زمانہ تحصیل کی تدوین ڈاکٹر محمد یامین نے اور شاہ بانو کے سفر نامہ سیاحت سلطانی کو ان کے نواسے محمد شہریار نے مرتب کیا مگر بہت سے سفر ناموں پر اب تک کام نہیں ہوا۔ خواتین کے چند سفر ناموں پر صرف چند سطور پر مشتمل معلومات ملتی ہیں اورزیادہ تر کتابوں میں صرف ناموں کی فہرست پائی جاتی ہے ۔ اب تک سفر ناموں کی صنف پر تحقیقی کام تو ہوا ہے لیکن ان سب میں نو آبادیاتی عہد کے تمام سفر ناموں کے نام تک نہیں ملتے بلکہ ان کا صرف سرسری سا روایتی ذکر ہی راقمہ کو نظر آیا۔ اردو سفر نامہ نگاری کی تاریخ کی کتابوں اردو ادب میں سفر نامہ از ڈاکٹر مرزا حامد بیگ میں بیگمات بھوپال کے سفر ناموں کا نام تک موجود نہیں ہے۔ حالانکہ یہ سفر نامہ ہندوستان کی نو آبادیاتی عہد کی اہم تاریخی دستاویز کے علاوہ اس دور کی تہذیب و معاشرت کی بھی یادگار ہیں۔لہذا ان سفرناموں پر تفصیل سے کام کیے جانے کی ضرورت ہے ۔

سفارشات:

١: مختلف لائبریریوں میں نایاب سفرناموں کا محض ایک ایک نسخہ موجود ہے۔ یہ سفرنامے ادب کی تاریخ میں بنیادی اہمیت کے حامل ہیں لہذا ان سفرناموں کا دوبارہ شائع کیا جانا ضروری ہے تاکہ تحقیقی کام کرنے والوں کو مشکل پیش نہ آئے۔

٢: نو آبادیاتی عہد کے سفرنامے سیاسی و سماجی اہمیت کے حامل ہیں ۔ان پر کسی اورجہت سے کام بھی کیا جانا چاہیے۔

:۳ چند سفر نامے جو غیر مطبوعہ حالت میں موجود ہیں ان کی تدوین و ترتیب کی جاسکتی ہے۔

:۴ ترجمہ شدہ سفرناموں کو بھی موضوعِ تحقیق بنایا جا سکتا ہے ۔

:۵ بعض سفرنامے جو صرف رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں ان کومرتب کیا جا سکتا ہے اور ان پر حواشی و تعلیقات اور مقدمہ تحریر کیا جا سکتا ہے۔

:۶ مقامی سفرناموں پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔

:۷ ہر ملک کے سفرناموں کو زیرِ مطالعہ لا کر اس ملک کے سماجی وسیاسی ارتقا کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

کتابیات

آزاد، محمد حسین۔ سیر ایران۔مرتبہ، آغا محمد طاہر۔ لاہور: کریمی پریس، ۱۸۸۶ء۔

آغا، وزیر۔ "سفر نامہ کی بحث"۔ مشمولہ:اوراق، سالنامہ، لاہور(۱۹۷۸ء)۔

آکسفورڈ ایڈوانس لرنرز ڈکشنری (*Oxford Advance Learners Dictionary*)، ۲۰۰۴ء، ۷ایڈیشن۔

احمد خان، سر سید۔ مسافران لندن۔ لاہور:مجلس ترقی اردو، ۱۹۶۱ء۔

احمد، عزیز ۔ برصغیر میں اسلامی جدیدیت۔ لاہور: ادارۂ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۰۶ء۔
اشرفی، وہاب ۔" شاد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری "۔ مشمولہ سیمیں، ثمر فضل، ہندوستانی مسلم خواتین
کی جدید تعلیمی ترقی میں ابتدائی ناولوں کا حصہ ،دہلی :اے ون آفیسٹ(۱۹۹۱ ء)۔
انصاری ، سحر۔ *(فلیپ)* دھوپ کنارے۔کراچی: بیلا پبلی کیشنز، ۱۹۸۱ء۔
اکرام، شیخ محمد ۔ موجِ کوثر۔ لاہور: ادارۂ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۰۷ء۔
بانو، شاہ ۔سیاحت سلطانی ۔آگرہ، مطبع مفید عام، ۱۹۱۵ء۔
برنی، ضیا الدین ۔" اقبال دیگر مشاہیر اور عطیہ" ۔ مشمولہ: ماہ نو، کراچی(اپریل ۱۹۶۷ء)۔
بسمل، محمد عبد الرزاق ۔ تذکرہ جمیلہ حیدرآباد: دکن: بیرون دبیر پورہ، ۱۹۲۹ء۔
بہادر، بیگم سربلند جنگ ۔ دنیا عورت کی نظر میں۔دہلی: خواجہ برقی پریس، ۱۹۱۰ء۔
بہادر، نواب لیاقت جنگ ۔ سفر نامہ یورپ و امریکہ۔ دکن ، ۱۹۴۷ء ۔
بی، طیبہ ۔ تاریخ فرمارویان بھوپال۔ بھوپال: بھوپال پریس، ۱۹۷۷ء۔
بیگ، حامدمرزا ۔ اردو سفر نامہ کی مختصر تاریخ۔اسلام آباد، ۱۹۸۷ء۔
بیگم، سلطان جہاں۔ حیات قدسی۔ بھوپال: مطبع ریاست، ۱۹۱۷ء۔
بیگم، محمدی ۔۔تہذیب نسواں ۔ جلد ۴۶، ۷اگست ۱۹۴۳ء۔
بیگم، نعیمہ۔۔ حسرت کی کہانی: نعیمہ کی زبانی۔ کراچی: المخزن پرنٹرز پاکستان چوک، ۱۹۶۹ء۔
بیگم، نواب سلطان جہاں ۔ روضہ الریاحین۔ بھوپال: مطبع سلطانی، ۱۳۲۷ھ۔
بیگم، نواب سلطان جہاں۔ تزک سلطانی (حصّہ اول) ۔ بھوپال: مطبع سلطانی ، ۱۳۲۸ھ۔
پینگوئن ڈکشنری آف لٹریری ٹرمز(*Penguin Dictionary of Literary Terms*)،ص ۹۹۔

تنویر حسین ، پروفیسر □ اصناف ادب اردو□ لا□ور: مقبول اکیڈمی اردو بازار، ۲۰۰۹ء□
جعفری ، احمد رئیس ، (مرتب□) □ سفر نام□ ابن بطوط□□ کراچی: نفیس اکیڈمی، ۱۹۶۱ء □
جعفری، رئیس احمد□ "عطی□ بیگم فیضی"□ مشمول□: نگار، جلد نمبر ۵۸(نومبر ۱۹۷۹ء)□
ج□اں، رفعت□ بیسویں صدی میں خواتین کی غیر افسانوی نثر : ایک مطالع□□ علی گڑھ:
ایجوکیشنل بک □اؤس، ۲۰۱۵ء□
حامد، رضی□□ نواب سلطا ن□اں بیگم□ بھوپال: باب العلم پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء□
حفیظ صدیقی، *ابوالاعجاز*□ کشاف تنقیدی اصطلاحات□اسلام آباد: مقتدر□ قومی زبان، ۱۹۸۹ء□
حیدر، محمود□ عثمان □ □مش□ادات بلاد اسلامی□□ کراچی: مش□ور آفسٹ پریس، ۱۹۶۲ء□
خان، نگ□ت ریحان □ اردو مختصر افسان□ فنی و تکنیکی مطالع□□ د□لی:ایجوکیشنل پبلشنگ □اؤس، ۱۹۹۵ء□
الخیری، علام□ راشد□"مضمون: محترم□ عطی□ بیگم صاحب□"□ مشمول□: عصمت، جلد ۳۶(فروری ۱۹۲۶ء)□
دلوی، میمون□ □ بمبئی میں اردو□ د□لی: مکتب□ جامع□، ۱۹۷۰ء□
دی انسائیکلو پیڈیا امریکن (*The Encyclopedia Emerican*)، انٹرنیشنل ایڈیشن، ص۸۸□
دی نیو انٹرنیشنل ویبسٹرز کمپری □نسیو ڈکشنری آف انگلش لینگویج(*The New International Webster’s comprehensive Dictionary of the English Language)*، ۲۰۰۶ء، (انسائیکلو پیڈیا ایڈیشن)، جلد ۱، Naples: Trident Reference Publishing□
رضوی، سید شفقت□بیگم حسر ت□مو□انی حیات و سیرت□ کراچی: نشاط النساء میموریل سوسائٹی،

۱۹۹۶ء۔
روزنامہ جنگ، کراچی، ۷ جنوری ۱۹۶۷ء۔
سدید،انور۔ اردو ادب میں سفر نامہ/ لاہور :مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۸۷ء۔
سعید، حمیرہ۔ اردو ناولوں میں سنائی حسیت۔دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۹ء۔
سلطان، نازلی رفیعہ۔ سیرِ یورپ۔لاہور:یونین اسٹیم پریس، ۱۹۰۸ء۔
سلطانہ بخش، ایم ۔پاکستانی ادبیات میں خواتین کا کردار۔اسلا م آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی ، ۲۰۰۷ء۔
سورہ العنکبوت، آیت نمبر ۲۰۔
شاہ جہاں پوری، ابو سلمان ۔ تحریکاتِ ملی۔کراچی: المخزن پرنٹرز، س۔ن۔
شاہین،روبینہ۔ "سفر نامے کے بنیادی مباحث"۔ مشمولہ، خیابان (خزاں۲۰۱۴ء)۔
شہاب الدین،محمد۔ اردو میں حج کے سفرنامے۔ دہلی:بھارت آفیسٹ ، س۔ن۔
شیرازی ، سید تنویر ۔ اجنار بلدیہ۔ جلد نمبر ۸۔۹(دسمبر۔جنوری ۱۹۰۰ء)۔
صاحبہ، وہا ۔ تذکرہ بیگمات بھوپال۔ لاہور: دار الاشاعت پنجاب، ۱۹۳۳ء۔
صدیقی، مولانا محمد حسین (مرتبہ) ۔ ہندوستان کی بیس بڑی خواتین۔کراچی: زمزمہ پبلشرز، ۲۰۰۳ء۔
طیب علی، عبد الرسول۔ تذکرۂ سیفی (مرتبہ) ۔ جبل پور: مطبع نادری ، ۱۹۳۰ء۔
عابد، سید عابد علی ۔اسلوب۔لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۱ء۔
عارف، نجیبہ ۔ جنوبی ایشیا میں اولین سفرنامہ انگلستان تاریخ جدید۔مشمولہ ، بنیاد، جلد ۵(۲۰۱۴ء)۔
عارف، نجیبہ۔اٹھارھویں صدی کا ایک نادر سفر نامہ روس و چین۔ مشمولہ، بازیافت (جولائی تا دسمبر۲۰۱۴ ء)۔
عالی، جمیل الدین۔ تماشا مرے آگے۔ لاہور: غلام علی اینڈسنز، ۱۹۷۵ء۔

عبد الشکور، پرنسپل ، حسرت موہانی، آگرہ: عزیزی پریس، ۱۹۴۶ء۔
عبدالرحمان ، مولوی ، خلاصہ تحفہ النظار، دہلی: جمال پریس، ۱۹۷۲ء، ص۱۱
عثمان، محمد یامین (مرتب) ، زمانۂ تحصیل، کراچی: ادارۂ یادگار غالب، ۲۰۱۰ء۔
عثمان، محمد یامین ، "عطیہ فیضی کا خاندان"، مشمولہ: تحقیق، جام شورو (سندھ)، شمارہ ۲۹(جنوری تا جون ۲۰۱۵ء)۔
عقیل، شفیع ، زندگی بھر کہاں ، لاہور: بک ہوم ، ۲۰۰۶ء۔
عقیــل، معین الــدین ، آزادی کی قــومی تحریک، لاہور:مکتبہ تعمیرِ انسانیت۔
عقیل، معین الدین ، "اردو کی اولین خود نوشت سوانح عمریاں"، مشمولہ: خدا بخش لائبریری جنرل، (جنوری ،مارچ ۲۰۰۴ء)۔
عقیل، معین الـدین ، تحریـک آزادی میں اردو کـا حصّہ، لاہور: مجلس ترقی اردو، ۲۰۰۸ء۔
علی، محمدبرکت ، آج کل اورسفرنامہ، مرتب۳۲۔
فاروقی، احسن، " فکشن اور تکنیک"، مشمولہ، سیپ،کراچی : شمارہ ۲۹۔
فرخی، اسلم، کنارے کی دھوپ ، مشمولہ دھوپ کنارے ازجمیل زبیری، کراچی: بیلا پبلی کیشنز،(۱۹۸۱ء)۔
فضل، سیمیں ثمر ، ہندوستانی مسلم خواتین کی جدید تعلیمی ترقی میں ابتدائی ناولوں کا [illegible] دہلی: اے ون آفسٹ، ۱۹۹۱ء۔
فیضی، عطیہ ، زمانۂ تحصیل، آگرہ، مطبع مفید عام، ۱۹۲۱ء۔
قریشی، اشتیاق حسین ، برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، کراچی: کراچی یونیورسٹی، ۱۹۹۹ء۔
قریشی، قدسیہ، اردو سفر نامے انیسویں صدی میں ، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۸۷ء۔
کامران، جیلانی ، " حج کے سفر ناموں کی روایت"، مشمولہ، ماہ نور(نومبر۱۹۷۸ء)۔
کمبل پوش، یوسف خان ، عجائبات فرنگ، لکھنو: مطبع نول کشور، ۱۸۹۸ء۔

کِی کنسپٹس اِن پوسٹ کولونیل لٹریچر(*Key Concepts in Post Colonial Literature*)، نیویارک: پال گریو میک میلین (Palgrave Macmillian)، ۲۰۰۷ء۔

لانگ مین ڈکشنری آف انگلش لینگویج (*Longman Dictionary of English Language*)،۱۹۸۴ء، ص ۲۸۸۔

مارہروی، محمد امین زبیری ۔ حیات سلطانی ۔ آگرہ: عزیزی پریس، ۱۹۳۹ء۔

مارہروی، محمد امین زبیری۔ بیگمات بھوپال۔ بھوپال: مطبع ریاست، ۱۹۱۸ء۔

مجیب،محمد۔ ہندوستانی سماج پر اسلامی اثر۔ کراچی: بک ٹائم، ۲۰۱۱ء۔

محمد اکرام الدین، خواجہ (مرتبین) ۔ اردو سفرناموں میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت۔ نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۱۰ء۔

محمود ، خالد۔ اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ۔نئی دہلی: دریا گنج ، ۱۹۹۵ء۔

موہانی، بیگم حسرت۔ سفرنامہ عراق ۔کراچی: نشاط النساء میموریل سوسائٹی، ۱۹۳۷ء۔

نارنگ، گوپی چند ۔ ادبی تنقید اور اسلوبیات ۔ دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۱۸۸۹ء۔

ناشاد، ارشد محمود۔ "سفر، سفرنامہ اور فرصت نگاہ"۔ مشمولہ ،سہ ماہی، عطاء سالنامہ(۲۰۱۲ء)۔

نعمانی، مولانا شبلی ۔ سفرنامہ روم و مصر وشام۔دہلی: قومی پریس، ۱۸۸۱ء۔

ہاشمی، رفیع الدین ۔ اصنافِ ادب۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء۔

ہمایوں، بیگم صغرا۔ رہبر کشمیر (مقدمہ)۔

ہمایوں، بیگم صغرا۔ سفرنامہ پونہ مدراس(مقدمہ)۔

ہمایوں، بیگم صغرا۔ سفرنامہ عراق۔ مطبع نظام دکن، حیدر آباد، ۱۹۱۵ء۔

ہمایوں، بیگم صغرا۔ سفرنامہ یورپ۔حیدرآباد دکن : اعظم۔
اسٹیم پریس چار مینار، ۱۹۲۶ء۔
ویبسٹر سکول ڈکشنری(*Webster School Dictionary*)،
ایڈیشن ۱۹۸۰ء۔